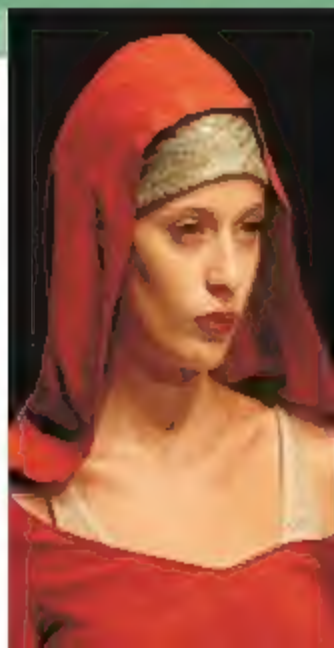


# خدا اور محبت



ہاشم ندیم

# خدا اور محبت

ہاشم ندیم



## دُعا پبلی کیشنز

آفس: مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: 042-37233585  
E-mail: duapublications@yahoo.com

### نوٹ:

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنف (ہاشم ندیم) اور پبلشرز (دُعا پبلی کیشنز) محفوظ ہیں۔ ادارہ دُعا پبلی کیشنز نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو [kitaabghar.com](http://kitaabghar.com) پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

## جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

خدا اور محبت	نام کتاب
ہاشم عظیم	مصنف
زاہد شیخ	ناشر
ڈی جی پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور	مطبع
اشتیاق اے مشاق پرٹرز، لاہور	سن اشاعت
نومبر 2010ء	قیمت
500/- روپے	

..... ملنے کے چے .....

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

اشرف بک اینجینی

اقبال روڈ، کبھی چوک، راولپنڈی

ویکم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی

کتاب گھر

اقبال روڈ، کبھی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>انتساب!

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

دنیا کے ہر محبت کرنے والے.... اور  
دنیا کی ہر محبت کے نام

## کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کپیڈنگ (ان بیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

## کتاب گھر کی پیشکش فہرست کتاب گھر کی پیشکش

9	☆	عیش لفظ..... ہاشم نعیم
10	☆	بتکے بھگودینے والی کہانی .... عطاء الحق قاسمی
11	☆	WELDONE HASHIM NADEEM..... بریگیڈیئر ذوالفقار علی
12	☆	"خدا اور محبت"..... ایک لازوال فی تحقیق... ایس ایم طاہر
13	☆ باب 1:	پہلی بارش
17	☆ باب 2:	پھر وہی شام
20	☆ باب 3:	محبت..... نیلا موسم
24	☆ باب 4:	پھر وہی محبت
30	☆ باب 5:	لندن اُداس ہے
38	☆ باب 6:	ایمان
46	☆ باب 7:	یہودی
52	☆ باب 8:	گمائل
63	☆ باب 9:	پہلی کلاس
68	☆ باب 10:	زیر عشق
81	☆ باب 11:	زرد لندن
87	☆ باب 12:	محبت کی دو پہر
93	☆ باب 13:	یادیں
97	☆ باب 14:	محبت ناقص
107	☆ باب 15:	نیند
112	☆ باب 16:	خدا اور محبت



## فہرست

122

127

136

140

146

150

159

164

178

182

192

198

231

235

239

253

267

273

287

293

300

☆ باب 17: محبت کے تین پیر

☆ باب 18: محبت اور خدا

☆ باب 19: ہالوکاسٹ

☆ باب 20: سنگ دل

☆ باب 21: فرم بھیج

☆ باب 22: پھر وہی نظر

☆ باب 23: جیوری کا فیصلہ

☆ باب 24: بے خودی

☆ باب 25: جادوگر

☆ باب 26: دشمنِ خدا کی

☆ باب 27: یہودی ہستی

☆ باب 28: وہ ایک ملاقات

☆ باب 29: یادوں کی بارات

☆ باب 30: خوف

☆ باب 31: گریزِ محبت

☆ باب 32: پہلی بازی

☆ باب 33: نوجوان انقلاب

☆ باب 34: چلتے چلتے

☆ باب 35: الوداع

☆ باب 36: تجدیدِ ایمان

☆ باب 37: کبھی الوداع نہ کہنا

## پیش لفظ

کچھ میں نہیں آتا کہ لوگ محبت کو آپ جتنی کیوں کہتے ہیں۔ محبت تو جگ جتنی ہے۔ دنیا کا وہ کون سا فرد ہے جو اس تجربے سے نہیں گزرا ہوگا؟ شرط صرف تسلیم کرنے کے صحیح یا انکار کرنے کی منافقت کی ہے۔ میں نے محبت اور مذہب کو جس طرح خود پر وارد ہوتا محسوس کیا، اُسے ان صفحات پر لفظوں کی صورت میں نکھیر دیا۔ محبت اور مذہب کی جگہ تو میرے دل نے لڑی اور میری روح نے جھیلی ہے، لیکن جیت مذہب کی ہوئی یا محبت کی۔۔۔۔۔ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ مقصد محبت یا مذہب میں سے کسی بھی ایک کی برتری ثابت کرنا بھی نہیں رہا۔ بس کچھ سوال جواب چاہتے تھے۔ لیکن مذہب اور محبت کی اس نگرار میں کچھ نئے سوال جنم لیتے نظر آ رہے ہیں۔ سو میری گزارش ہے کہ اس کتاب کو صرف وہی لوگ پڑھیں جو زندگی میں نئے سوالوں کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ جواب البتہ فرض نہیں ہے۔

ہاشم عذیم

☆=====☆=====☆

## من و سلویٰ

دور حاضر کی مقبول ترین مصنفہ **عمیرہ احمد** کا بہت خوبصورت اور طویل ناول **من و سلویٰ** جس کا بنیادی موضوع رزق حلال ہے۔ من و سلویٰ جو بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے اتارا گیا اور رزق حلال جو اُمت محمدیؐ کے لیے عطا کیا گیا، لیکن نہ بنی اسرائیل من و سلویٰ سے مطمئن تھی اور نہ ہم رزق حلال پر قانع۔ انہیں انواع و اقسام کے زمینی کھانوں کی طلب تھی اور ہمیں کم وقت میں زیادہ کی۔۔۔۔۔ رزق حلال کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

## تکے بھگو دینے والی کہانی

کوئٹہ میں میرے پاس فراغت کے کافی لمحات تھے سو میں نے اگرچہ بے دلی سے مگر ناول پڑھنا شروع کیا اور پھر میں ایک عجیب طرح کی اداسی کا شکار ہونا چلا گیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ناول کے مطالعے کے دوران میں دو مرتبہ رو پڑا۔ ناول کی کہانی بظاہر افسانوی سی ہے لیکن یہ ناول کلاسیکی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس میں زبان و بیان کے کوئی کرب بھی نہیں دکھائے گئے مگر کہانی پر مصنف کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ناول میں اس کے متوازی جو ایک کہانی لندن کے پس منظر میں چل رہی ہے، میں نے تجسس کی وجہ سے وہ ابواب چھوڑ دیئے۔ یہی سلوک میں نے ”رہبر گدھ“ کے ساتھ بھی کیا تھا۔ ناول میں ہیرو کی محبت کی پیش اس کے قاری کو بھی پکھلا کر رکھ دیتی ہے اور یہی فن کی معراج ہے کہ مصنف قاری کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے۔ ہاشم عظیم نے ناول میں کردار نگاری بھی بہت کمال کی کی ہے چنانچہ مولوی صاحب، ایمان، عبداللہ اور بعض دوسرے کردار، جیتے جاگتے ہمارے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے اتنی شدید محبت کی کہانی میں نے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھی۔ یہ تکے بھگو دینے والی کہانی ہے۔ بلوچستان کا یہ نوجوان بہت سے لکھاریوں پر بازی لے گیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی

## شہرِ تمنا

خواتین کی پسندیدہ مصنفہ **سانہ عارف** کا بہت خوبصورت اور اچھوتا انداز تحریر۔ زندگی کے تمام رنگوں سے سجا دکھوں کے بحرِ بکراں اور خوشیوں کے ٹکلتاؤں سے آباد۔ ایک دلچسپ اور طویل ناول **شہرِ تمنا** کتاب گھر کے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔



## WELDONE HASHIM NADEEM

مجھے ناول جیسی تصانیف اور وہ بھی اردو میں پڑھنا کبھی پسند نہیں رہا مگر جب ہادل خواستہ میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا تو دودوں میں شتم کر کے ہی دم لیا۔ میں نے اسے اپنے ارد گرد بکھری ہوئی کہانیوں کے جیتے جاگتے کرداروں کی منہ بولتی تصویر پایا۔ اس میں بیک وقت چلتی دو کہانیاں جو اپنے اندر خود ایک ہالوکاسٹ ہیں اور کہانی کے ساتھ ساتھ بہت ساری اموں باتیں قاری کو اپنے غلم سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ میں چونکہ کومینڈ اور یہودیت کی گرفت میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے مغربی معاشرے سے خوب واقفیت رکھتا ہوں اس لئے مجھے یہ ناول سے زیادہ حقیقت لگا۔ مذہب اور محبت میں تضاد ہم نے بنا رکھا ہے حالانکہ مذہب خود محبت کا دوسرا نام ہے اور مذہب سے محبت نکال دیں تو یہ صرف چنگیزیت رہ جائے۔ ”معاشرہ کیا کہے گا“ نے معاشرے کا ستیاناس کر کے رکھا ہوا ہے اور یہ مشرق و مغرب میں یکساں نافذ العمل ہے۔ حالانکہ یہی معاشرہ سب کچھ اندر سموئے ہوئے ہے۔ مگر ہمارے اندر کا ڈر اور بزدلی بہت سارے انسانوں کی زندگیوں تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ محبت سے عاری معاشرے ہمیشہ ہالوکاسٹ اور Extremism کو جنم دیتے ہیں جو کہ ایک تباہ کن عمل ہے۔ اور محبت زندگی ان ان تضادات کو صرف وہی انسان اس خوبصورتی سے لکھ سکتا ہے جو خود اس میں سے گزرا ہو ہاشم ندیم نے یہ عمل بہت ہی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس میں آپ جتنی کا کافی واضح عمل دخل نظر آ رہا ہے۔ بہر حال یہ ہاشم ندیم کی ایک بہترین کاوش ہے جو انتہائی قابل تحسین ہے۔

بریلینڈ میر خدائے تعالیٰ

جواکٹ سیکرٹری

مجلس سول ایوارڈ راز ڈی۔ جی (ملٹری ونگ)

کابینہ ڈویژن، اسلام آباد

## ”خدا اور محبت“۔۔۔ ایک لازوال فنی تخلیق

ہاشم ندیم کے مشہور ناول ”خدا اور محبت“ کو چند سال پہلے پڑھا تو اس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ نہ لگا سکا۔ بس ایک عجیب طرح کی چاشنی تھی جو مرقوں مخلوط کرتی رہی۔ دوسری بار جب اس ادارے سے مطالعہ کیا کہ اس شاہکار کے بارے میں اپنی رائے تحریر کروں تو ناول کی وسعت اور گہرائی کا صحیح اندازہ ہو سکا۔ جیتے جاگتے کرداروں کا جھرمٹ اور دلکش واقعات قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ایک طرف خدا کی محبت کا شفا نہیں مارتا ہوا سمندر اور دوسری طرف محبت کے وہ عظیم جذبات جو ظالم سلج کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر صرف خدا کی رحمت کے طلبگار نظر آتے ہیں۔ ناول نگار نے نہایت کامیابی سے یہ ثابت کیا ہے کہ خدا محبت ہے اور یہی اور بے غرض محبت ہی خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ناول کے مطالعہ کے دوران کئی بار ایسی کیفیت سے واسطہ پڑا جب انسان کا مادی دنیا سے رشتہ اور تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور وہ ایسی حسین دنیا میں گردش کرنے لگتا ہے جہاں محبت کو انسانیت کی معراج کہا جاسکتا ہے۔

”خدا اور محبت“ شروع سے آخر تک ایک سفر ہے۔۔۔ باہر سے اندر کا سفر اور ظاہر سے باطن تک کا سفر۔ ناول پڑھتے ہوئے قاری خود کو بھی اس سفر میں شریک محسوس کرتا ہے۔ مصنف نے عشق مجازی اور عشق حقیقی کے بارے میں فلسفیانہ خیالات کا اظہار اس خوبصورتی اور مہارت سے کیا ہے کہ ناول کا مرکزی خیال اور مقصد محسوس نہیں ہوتے۔ قاری خود کو ایک ایسے دورا ہے پر موجود پاتا ہے جہاں انسان اور خدا کے درمیان فاصلہ سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو ایک ایسے ماحول میں محسوس کرتا ہے جہاں وہ دونوں ایک دوسرے میں فہم ہو جاتے ہیں۔ ایک اور خوبی جو اس ناول کو دوسرے تخلیقی پاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے محبت اور مذہب کی جگہ۔۔۔ اور بلا خرمیت اس عظیم مقام پر فائز نظر آتی ہے جو اس کا حق ہے۔

اسلوب بیان پر بات کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ مصنف نے نثر میں شاعری کی ہے۔ جگہ جگہ ایسے جملے ملتے ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ جہاں پلاٹ کی پہچان ہے وہیں زندہ کردار ناول کی کہانی میں طرح طرح کے رنگ بھرتے ہیں۔ حماد، ایمان، مولوی صاحب شاکر عبد اللہ جیسے کردار تخلیق کرنا ہاشم ندیم صاحب کا ہی کمال ہے۔ یہ وہ کردار ہیں جو معمولی واقعات سے متاثر ہو کر بھرپور تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔

اس ناول کی ایک آفاقی حیثیت بھی ہے بہت سے بین الاقوامی مسائل، جن میں بین المذاہب المذاہب بھی شامل ہیں۔ ان پر نہایت مدلل بحث کی گئی ہے یہ کام وہی ادیب کر سکتا ہے جو حق کا حلاشی ہو اور دوسروں کو بھی سچائی کا راستہ دکھانے کا عزم رکھتا ہو۔ ایسے موضوعات پر لکھنے کے لئے نہ صرف جرات قلندرانہ کی ضرورت ہے بلکہ فنکارانہ چابکدستی بھی درکار ہے تاکہ ناول کا اپنا حسن برقرار رہے۔

ہاشم ندیم کا ناول ”خدا اور محبت“ ایک لازوال فنی تخلیق ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا بالکل اسی طرح جیسے دو الفاظ ”محبت“ اور ”خدا“ اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے نقوش حرید گہرے ہوتے رہیں گے۔ بے شک یہ ناول اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

ایس ایم طاہر

اسلام آباد مورچہ ۲ جولائی ۲۰۱۰

## پہلی بارش

وہ شاید ہوئی جہاز کے پیس کی رن دے سے رگڑ کھانے کی آواز تھی جس سے میری کچی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ جہاز لندن کے ایسٹرن ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا اور اب دھیرے دھیرے رن دے پر چلتا ہوا پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ رہا تھا ایئر ہوسٹس کے اعلان کے مطابق لندن کا مقامی وقت صبح چھ بجے کا تھا۔

لندن شہر ایک مہلک جھپٹے سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا رات بھر بارش ہوتی رہی ہے، ہلکی ہلکی سی مٹیوار اب بھی میری سیٹ کی وڈ اسکرین پر ارتعاش بکھیر رہی تھی، یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برتی رہیں جب بھی انسان کا اندر ہلگو نہیں پاتیں۔۔۔ اور کبھی کسی کے من کو ہر لمحہ جل قفل کیے رکھتی ہیں، لیکن باہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔۔۔ لندن کی یہ پہلی بارش بھی کچھ ایسی ہی تھی جس نے میرے وجود کو تو باہر سے بھگودیا لیکن میرے اندر کی پیاس اب بھی میرے حلق میں کانٹے جھسوری تھی۔

جہاز اپنے مقررہ پارکنگ اسٹینڈ پر لگی ٹیوب سے جڑ چکا تھا اور مسافر جھانپا لپٹے ہوئے ایک ایک کر کے ٹیوب کے ڈریپے ٹریمل پر اتر رہے تھے۔ جب تک میں لاؤنج میں پہنچا تب تک آفتاب سے صبح کی ہلکی سی سفیدی جھاٹکنے لگی تھی، لیکن کالے گھنے بالوں اور مسلسل بوند باندی کی وجہ سے لاؤنج کی ٹشے کی دیوار کے باہر اب بھی کسی اداس شام کا سا زردی مائل پیلا اندھیرا باقی تھا۔

میں، حماد امجد، پاکستان کے معروف تاجر خاندان کا چشم و چراغ کہ جس کے آباؤ اجداد پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد بھی انتہائی اہم حکومتی عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ تجارت جس کے گھر کی باندی ہے اور ملک کے اہم سرکاری محکمہ جس کے گھر شام کی چائے پر طلب کیا جانا چاہئے یہ باعث فخر سمجھتے ہیں۔ وہ حماد امجد آئن لندن کی اس بھکتی صبح میں تھا اور اس ایسٹرن ایئر پورٹ کے آدلاؤنج میں کھڑا تھا، کہنے کو تو میری لندن آمد کا مقصد یہاں کی مشہور کنکشن (Kingstone) یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات سے اعلیٰ تعلیم کی دوسرا ڈگری پڑنا تھا، لیکن میں خود چاہتا تھا کہ یہ صرف ایک بہانہ تھا، خود اپنی ذات سے فرار ڈھونڈنے کا ایک بہانہ۔ میں خود کو اس شہر کی گہما گہمی میں اس قدر مٹ کر دینا چاہتا تھا کہ مجھے ہل بھر بھی خود اپنے آپ کے ساتھ تہہ گزارنے کا موقع نہ مل پائے۔ میری ذہنی حالت ایسی تھی کہ میں دوسروں کے نام کو اور وجود کو بھی جھیلنے کے لیے تیار تھا، لیکن خود اپنا سامنا لمبے بھر کو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ انسان بھی کتنا مجبور اور لاچار ہے۔ باہر آس پاس لگے لگے آئینے پھوڑ بھی ڈالے تب بھی اپنے اندر لگے آئینے کا سامنا ہر دم لازمی ہوتا ہے۔

جب تک میں کشم اور دیگر معمول کی کارروائی سے فارغ ہو کر ٹریمل سے باہر پہنچا تب تک باہر کی خشک ہوا میں برف کے اکا دکا ستارہ نمہ گالے شامل ہو چکے تھے۔ کھلی فضا میں پہلا قدم رکھتے ہی سردی کی ایک شدید لہر نے میرے سارے وجود کو جھنجھٹا سادیا۔ بے اختیار دھیرے دھیرے ہاتھ میرے درکوت کے کار کی طرف بڑھ گئے اور میں نے خود کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ سردی چاہے جتنی بھی شدید کیوں نہ ہو، اس کی پہلی ہر آپ

کے اندر تازگی کا ایک احساس ضرور بیدار کر دیتی ہے۔ اس ٹھنڈے ہوا کے پہلے جھونکے نے میرے اندر بھی تمام احساسات کو جگا سا دیا تھا۔ میں نے اپنے بچپن کے لنگوٹھے دوست کامران کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن میری توقع کے مطابق اس کا دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ پہلے تو جی میں آیا کہ سامنے پارکنگ اسٹینڈ میں کھڑی عکسی لے کر خود ہی اس کے فلیٹ پر پہنچ جاؤں۔ میں لندن پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا اور اس شہر کے درود پوار میرے لیے کبھی اجنبی نہیں رہے تھے۔ لیکن پھر جانے کیا سوچ کر میں انٹرپورٹ ٹرمینل سے اپنا اگلوٹا سوٹ کیس گھسیٹتا، دور خشک گھاس کے ایک بڑے سے ویران قطعے کی طرف بڑھ گیا، جہاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر لگائے گئے کھڑی کے خوبصورت پتھروں کی ایک قطاری موجود تھی۔ میں نے یہیں بیٹھ کر کامران کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہوا میں برف کے گالوں کی آمیزش بڑھ رہی تھی اور جب تک میں اپنے منتخب کردہ بیچ تک پہنچا تب تک ہا قاعدہ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ مجھے یاد ہے بچپن میں انہیں اور کامران شام کو آسمان پر برف کے مخصوص دو دھیا سفید بادل دیکھ کر رات بھر اپنے اپنے گھر میں بستروں میں دیکھ، برف گرنے کی ذمائی کیا کرتے تھے اور صبح جب آسمان سے برف کے ستارے گرتے دیکھتے اور شہر کو برف کی سفید چادر میں لپٹا دیکھتے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہتا۔ گھر والے ہمیں دھونڈتے ہی رہ جاتے اور ہم کہیں دور آتے جاتے راہ گیروں پر چھپ کر برف کے گوسے برس نے میں مصروف رہتے۔ سوچتا ہوں بچپن کا وہ دھمپاتی جلدی کیوں بیت جاتا ہے اور جوانی کی یہ کڑی دھوپ ہے کہ جیسے صدیوں سے سر پر تنی ہوئی ہے اک ذرا بھی سرکتی نہیں۔

میں جس جگہ بیٹھا ہوا تھا زمین کا دو ٹکڑا عام سطح سے کچھ بلند تھا اس لیے دور سے لندن شہر کی اونچی لیکن قدیم عمارتوں کی جھلک یہاں سے واضح نظر آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں برف نے تمام شہر کو پوری طرح سے ڈھک لیا۔ خود مجھے بھی دور سے کوئی دیکھتا تو شاید برف سے بنا ایک مجسمہ ہی سمجھتا۔ کامران کا ابھی تک کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ ہمیشہ کالا پردہ، اور صبح جلدی اٹھنے سے تو ہم دونوں کی جیسے جان ہی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے، ہم دونوں سائنات امتحانات میں بھی بمشکل پر پتے بننے کے بعد ہی کلاس روم میں پہنچتے تھے۔ بچپن یونہی جتنے کہتے گزر گیا لیکن پھر چانک کامران کے گھر بیٹو عمارت نے پٹا کھایا، ماں باپ ایک ٹریفک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے، گھر میں کامران اکیلا رہ گیا کیونکہ اس کی اگلوٹی بڑی بہن پہلے ہی بیاہ کر اپنے گھر سدھار چکی تھی۔ باپ کی موت کے بعد کامران کو پتہ چلا کہ اس کے باپ نے قرضوں کا بے تحاشا بوجھ اس کے لیے ورثے میں چھوڑ رکھا ہے۔ قرض خواہوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور آخر کار اسے مجبوراً اپنا آبائی گھر اور بچی مکی جائیداد بیچ کر لندن شفٹ ہونا پڑا۔ قرض چکانے کے بعد جو کچھ بچا اس سے کامران نے یہاں ایک چھوٹا سا ریٹائرمنٹ کھول لیا تھا اور اب اس کی گزر بسر مناسب انداز سے ہو جاتی تھی۔ اور اب تو وہ مکمل اسی شہر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ دراصل اسے لندن ہمیشہ سے ہی بہت پسند تھا۔ شاید ہم دونوں کے اندر ایک بے حد قدیم روح بہتی تھی۔ کیونکہ قدامت پسندی اور اداسی لندن شہر کا ہی خاصہ ہے۔ ہر شہر کا اپنا ایک حراج ہوتا ہے۔ مجھے بھی کبھی چینیے، چنگاڑے شہر اچھے نہیں لگے۔ گرم، جس زندہ اور بے چین۔۔۔ جیسے ہر جگہ کچھ کھو جانے کا احساس دل کو جکڑے رکھے۔ مجھے سرد اور ٹھنڈے حراج کے لوگ و شہر ہمیشہ سے متاثر کرتے تھے، خاموش اور بے سکون، انسان کا ہر غم، ہر دکھ اپنے اندر سمیٹ لینے والے شہر، لندن بھی انہی شہروں میں سے ایک تھا۔

میرے سامنے سے ایک نوجوان جوڑا ہنستے ہوئے گزرا، لڑکی نے غور سے میری جانب دیکھا، اُس کے رخسار سردی سے سرخ لگا رہے تھے۔



ہور ہے تھے۔ وہ آنکھوں میں اک ازلی مسکراہٹ تھی۔ لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرا پڑی اور دونوں مجھے ویش (Wish) کرتے ہوئے کچھ فاصلے پر رکے دوسرے بیچ پر جا کر بیٹھ گئے اور اردو نیاز میں مصروف ہو گئے۔ دونوں کے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ صبح سویرے جاگنگ (Joging) وغیرہ کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ یہ موسم اور ان منجھلوں کی یہ ادا، میں یہ سوچ کر مسکرا دیا۔ موسم بھی ہر انسان پر کچھ الگ ہی طور اترتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میرے آبائی شہر کوئٹہ میں جب رات بھر برف گرتی تھی تو صبح سویرے غریب مزدور طبقہ اپنے بال بچوں سمیت چھوٹے بڑے بیچے دو لکڑی کے بڑے بڑے بھٹے لے کر دروازے کے سامنے سے اور چھت کے اوپر سے برف ہٹانے میں بھٹ جاتا۔۔۔ کیونکہ یہ برف ان کے کپکپ گھر کی چھت پر زیادہ دیر تکتی تو چھت کو چھلنی بنا دیتی تھی۔ ان غریبوں کی ساری سردیاں ایسے برفیلے موسم سے پناہ مانگنے میں ہی گزر جاتی تھیں۔ اور یہاں لندن میں اس برٹش صبح میں یہ دو متوالے موسم کا کھل لینے گھر سے نکلے تھے۔ ایک ہی موسم کسی بھی دو افراد پر دو مختلف صورتوں میں کیسے وارد ہو سکتا ہے۔ موسم تو ہر موسم ہی ہوتا ہے۔ اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، میرے کان دھڑکے کو کوئی زور زور سے ہلا رہا تھا۔

”اٹھ جاوے صاحب، ناروول کا جنکشن آ گیا ہے۔“

میں نے چونک کر اوپر دیکھا، کامران گرم کپڑوں میں لپٹا، صرف چہرہ باہر نکالے اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے ”معاف کرنا میڈی، یہ کچھ دیر ہو گئی۔ لیکن تم ہاں اس برف باری میں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ میں نے وہاں سارا ٹریئل چھن مارا تمہاری تلاش میں۔“

میری کامران سے پورے دو سال بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ دو سال پہلے وہ بینک لندن کے اسی ہتھروائٹر پورٹ پر مجھے آخری مرتبہ اوداع کہنے آیا تھا۔ تب زندگی کتنی حسین تھی۔ تب میں لندن صرف آوارہ گردی کرنے اور کامران کی بے ٹکان بکواس سننے کے لیے آتا تھا۔ بچپن کے سچے دوست بھی کسی گھنے، سایہ دار شہر کی طرح ہوتے ہیں، ان کی چھاؤں میں کتنا سکون، کتنا آرام ہوتا ہے، پہل بھر کو نہیں بھی کامران کے گلے لگ کر اپنے جلتے زخموں کو بھول سا گیا تھا۔

دفعتاً اُس نے مجھے اپنے آپ سے جدا کیا اور غور سے دیکھ کر کہنے لگا ”یار میڈی، تم کتنے کمزور لگ رہے ہو۔“ میں نے پنے سوٹ کیس کا ہینڈل اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”کاش میں بھی تمہارے لیے کوئی اسی قسم کی رائے دے سکتا۔“ کامران ہنس کر ڈھٹائی سے بولا۔ ارے یہ رتم تو جانتے ہو نا، بچپن سے ہی مجھ پر کھانا ذرا جلدی لگتا ہے۔ اچھا اب یہیں کھڑے رہ کر فریڈ ہونے کا ارادہ ہے کیا؟ گھر چلو۔ کامران نے قدم آگے بڑھا دیے۔ ساتھ والے بیچ پر وہ جوڑا اب بھی برقی برف میں دنیا و مافیہا سے لاپرواہ ایک دو بجے میں گم تھا۔ کامران نے لڑکے کو دیکھ کر ایک لمبی سی آہ بھری در بڑا تے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا ”نہ جانے یہ آج کل لندن کی گوریوں کے معیار کو کیا ہو گیا ہے۔“

کامران لمبے لمبے ڈگ بھرتا زمین پر پیچھی برف کی سفید بے داغ پوشاک پر قدموں کے نشان چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا اور میں کسی معمول کی مانند اس کے نقش قدم طے کرتا پیچھے چلا آ رہا تھا۔ کامران کی دینی بڑائی مورس کا قریب ہی کہیں پارک تھی۔ اُس نے میرا سامان ڈکی میں رکھا اور ہم کامران کے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔





کامران صوفی سے اٹھ کر میری جانب آیا اور میرے کانڈھوں پر ہاتھ رکھ کر جھک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "میں تمہیں چھ سال کی عمر سے جانتا ہوں مسٹر حاداجہ رضا۔ پچھلے بیس سالوں سے ہم دونوں ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا بچپن، ہماری جوانی ایک دوسرے کے سامنے کسی آئینے کی طرح عیاں ہے۔ تمہارا ثنائی احمقوں میں ہوتا ہے جو گھر کا نرم بستر چھوڑ کر در بدر کی جتنی ریت چھانٹتے پھرتے ہیں۔ اس وقت تم تھکے ہوئے ہو، جا کر سو جاؤ۔ ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔"

کامران مجھے تھکی دیتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں دھیرے دھیرے آرام کرسی پر کھڑکی کے سامنے بیٹھا باہر نلے میں درختوں کی ٹہنیوں سے، جو برف کے بوجھ سے بھاری ہو کر جھکی ہوئی تھیں برف گرنے کی مخصوص دھپ دھپ سنتا رہا۔ باہر آسمان سرخ انگار دوسا ہو گیا تھا۔ اور یہاں اندر کمرے میں آتش دان میں جتنی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز اور دیوار پر لپکتے شعلوں کے سائے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی اور میرا ذہن ماضی کے درپجوں کو پھلانگتا ہوا دوساں پسے کی اس شام کی یادوں تک جا پہنچا تھا جب میری ایمان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

☆☆☆

## اردو ٹائپنگ سروس

- ☆ اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔
- ☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سکن کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا
- ☆ اپنی تحریر رو من اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا
- ☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا
- ☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جاسکتا ہے
- ☆ اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ی میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0300-4054540، 0092-331-4262015

ی میل harfcomposers@yahoo.com

ویب سائٹ http://pktypist.com



## محبت..... نیلا موسم

ہمارا گھرانہ شہر کے انتہائی متمول اور پائرا گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ بابا بطور کمشنر پناہ ہونے کے بعد ہاپ داد کی وسیع و عریض زمینوں کے، مقامات سنبھالتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کبھی کبچے زمین دار نہ بن سکے اور ان کے اندر چھپا ایک سخت پیوروکریٹ ان کی شخصیت پر ہمیشہ سے نمایاں اور حاوی رہا تھا۔ امی خود ایک بہت بڑے زمین دار کی بیٹی تھیں اور ان کے اندر پرچی لکھی جاگیردار نیوں کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ انگلش ادب میں ماسٹر بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ ہم تین بھائی اور ایک بہن سمیت یہ خوش حال گھرانہ زندگی کی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھا۔ بابا کے رابطے ملک کے انتہائی اہم سیاست دانوں سے ہمہ وقت رہتے تھے اور ہمارے ڈرائنگ روم میں ہر شام بابا کی بینک ملک کے موجودہ حکمران طبقے کے وزیروں سے رہتی تھی۔ مجھے بچپن سے ہمیشہ اس بات پر حیرت رہی تھی کہ ملک میں حکومتیں تو بدلتی رہتی تھیں لیکن بابا کی بینک میں وہی چند مخصوص چہرے روپ ہر ہر کر موجود رہتے تھے۔ شاید بابا کی دوستی ہی ایسے سیاست دانوں سے تھی جو ہر حال میں اقتدار کے پالنے میں جھولتے رہتے تھے۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے سجاد اور بیٹی مدیحہ کی شادی بھی انہی حکمران خاندانوں میں کروادی تھیں۔ میری بہن مدیحہ سندھ کے ایک بہت پائرا خاندان میں بیوی لگی تھی جو کھلاتے تو سندھ کے تھے لیکن ان کی نئی نسل نے پاکستان کو صرف دارالحکومت سے زیادہ کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ مدیحہ بھی اسلام آباد میں ہی رہائش پذیر تھی۔ سجاد بھائی کی شادی بھی پنجاب کے امرا خاندان کی بیٹی سے ہو چکی تھی اور میری بھ بھ بھی عمرید کو ہر وقت اس بات کی فکر کھاتے جاتی تھی کہ کہیں کسی بھی موقع پر ان کا اونچا خاندان ہمارے خاندان سے نچا ثابت نہ ہو جائے۔ ویسے ان کی اور سجاد بھائی کی خوب جنتی تھی، کیونکہ سجاد بھائی کو اپنے بزنس اور بیرون ملک دوروں سے ہی فرصت نہیں تھی لہذا ابھی بھی اور امی خود ہی گھر کی پارٹیز اور تقریبات وغیرہ کے اہتمام میں جنتی رہتی تھیں۔ اب وہ گھر میں یعنی حماد امجد صاحب اور مجھ سے چھوٹا اور گھر بھر کا لڑا لہو دو ہم دونوں ہی کو گھر کے ان ہنگاموں اور شور شرابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے حال ہی میں ماسٹر ز کیا تھا اور اب عبد بھی گریجویشن کے بعد فارغ ہو چکا تھا۔ مجھے شروع سے ہی زندگی کو باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت گزارنے کی عادت نہ تھی۔ اس لیے بابا کے لاکھ کہنے کے باوجود میں ان کے کاروبار میں سب تک ان کا ہاتھ بٹانے میں اپنا دھیان نہیں لگا پاتا تھا۔ اور اس بات پر بابا آج کل مجھ سے کچھ ناراض بھی رہتے تھے۔ دوسری جانب عبد تھا جو پاکستان میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اُسے ہمیشہ سے ہی باہر جا کر رہنے کا جنون تھا۔ لیکن بابا سے کوئی جنتی بات کرنے سے اس کی بھی جان جاتی تھی۔ ہمارے گھر میں آئے روز کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر پارٹی دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ ہم امیروں کے پاس خوشی منانے کے بہانے اس قدر کم کیوں ہیں۔۔۔؟ شاید کہیں پرچی ہوئی یہ بات سچ ہی تھی کہ امیروں کا یہ خیال کہ غریب زیادہ خوش رہتے ہیں، اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ غریبوں کا یہ گمان کہ امیران سے زیادہ خوش ہیں۔

آج بھی ہمارے گھر میں ایک پارٹی تھی۔ یہاں یہ تھا کہ سجاد بھائی کے اکلوتے بیٹے نے آج پہلا پارہ ختم کر لیا تھا۔ ہم امیر گھرانوں میں دوسروں کے دیکھ دیکھی آج کل بچوں کو باقاعدہ کسی مولوی سے شام کو سپارہ پڑھوانے کا فیشن بھی زوروں پر تھا۔ یہ پھر شاید اس کے چچے بابا کے بچپن کی سخت تربیت اور دادا کی مخصوص پرورش کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے سجاد بھائی کو باقاعدہ حکم دے کر ان کے بیٹے سنی کے لیے کسی مولوی کا انتظام کرنے کا کہا تھا جو بچے کو شام کو آ کر قرآن کا سبق دے جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مہینے کے بیشتر دن بے چارے مولوی صاحب کو جتنے کے گیسٹ سے ہی بنا سبق دیے وہ جس پلٹنا پڑتا تھا کیونکہ زیادہ تر گھر میں کسی نہ کسی پارٹی یا تقریب کا بنگار ہی لگا رہتا تھا۔ اب ایسی ماڈرن پارٹیز میں بھلا ایک سیدھے سادھے مولانا ٹاپ مولوی اور اس کی پڑائی سی سائیکل کا بھلا کیا جوڑ۔۔۔؟ خود بھائی کو بھی مولوی صاحب کا یہ ٹنٹنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، لیکن بابا کے رعب کے آگے بھلا کسی کی کب چلتی۔۔۔؟ لہذا بادل خواست اس رسم کو نبھایا جا رہا تھا۔ جانے ہم امیر ایسی چیزوں سے اتنی دور اور غریب ان رسومات سے اتنے قریب کیوں ہوتے ہیں۔۔۔؟ ہم مذہب کو بھی ایک رسم کی طرح بھاتے ہیں اور غریب رسم کو بھی کسی مذہبی فریضے کی طرح بھاتے ہیں۔

خود میری بھی سنی کے مولوی صاحب سے آتے جاتے ایک آدمہ بارہ کی سی ٹلیک سلیک بس راستے میں، یا پھر گھر کے مخصوص لانچ کے حصے میں جہاں وہ سنی کو سبق دے رہے ہوتے تھے، ہو چکی تھی۔ مولوی علیم الدین صاحب ڈبل پتلے سے ایک سیدھے سادھے شخص تھے، جنہیں میں نے ہمیشہ سفید کپڑوں کرتا، پاجامہ میں لمبوس ہی دیکھا تھا۔ چہرہ نور، آنکھوں پر نظر کا چشمہ نیپ چاپ اور خاموش سے وضع داری ان کی چال و حال سے نمایاں تھی۔ ہمیشہ سر اور آنکھیں جھکا کر بات کرنے والے۔ اپنی پڑائی ریلے سائیکل پر شام چار بجے نہایت پابندی سے آن موجود ہوتے اور نوکر جہاں انہیں بلاتا دیتا وہیں نیپ چاپ خاموش بیٹھے رہتے اور سنی کے نیچے آنے کا انتظار کرتے۔ مجھے اس بات پر بھی ہمیشہ حیرت رہی کہ سنی جیسے شرارتی بچان کے قابو میں کیسے آ گیا تھا۔ کیونکہ باقی ٹیوٹرز کی جو درگت وہ بناتا تھا۔ اس کا مظاہرہ نہیں کی بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن خلاف توقع مولوی صاحب کے سامنے وہ بڑا اذہب بنا بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے ایک آدمہ بارہ آتے جاتے سنی کو مولوی صاحب کی نظر بچا کر کسانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں پڑتا تھا۔

اور شاید یہ سنی کی ہی فرمائش تھی کہ آج کی پارٹی جو خود سنی ہی کے پہلا پارہ ختم کرنے کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔ اس میں اس کے استاد یعنی مولوی صاحب کی شرکت لازمی تھی ورنہ اس نے گھر بھر کو دھکی دی تھی کہ وہ خود بھی پارٹی میں نہیں آئے گا ورنہ ہی اپنی ماس کے پسند کے کپڑے پہنے گا۔ اسی اور بھائی سنی کی اس فرمائش پر کافی جذبہ ہوئی تھیں۔ بھلا اس ماڈرن پارٹی میں جہاں شہر بھر کی بیگمات اپنے پاتونما شوہروں کے ساتھ ذرق برق لباسوں، نئے ڈیزائن کی جیولری سے لدی ہندی، لمبی لمبی کاروں اور عالی شان گاڑیوں میں تشریف لائیں گی، ایک لمبی سی سفید داڑھی والے اس غریب سے بزرگ کی جگہ کہاں بنتی تھی۔ ٹھل میں ٹاٹ کا بیونہ۔۔۔ ہونہ۔۔۔

لیکن سنی کی ضد کے آگے آج تک کسی کی چلی ہے جو اس دن چل پاتی۔۔۔؟ آخر گھر کی خواتین کو ہی ہار ماننا پڑی۔ لیکن اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ گھر کے خاص نوکروں نے کل ہی مولوی صاحب کو اس تقریب کی وجہ سے آج کو بھی آنے سے منع کر دیا تھا لہذا ان کے آنے کا کوئی امکان

بھی نہ تھا۔ سنی کے "نوسو پھر سے ٹپکنے لگ گئے تھے۔ آخر بابا کے خاص ڈرائیور شاکر سے پتہ چلا کہ اُسے مولوی صاحب کے گھر کا پتہ معلوم ہے۔ کیونکہ پہلے وہ بھی شہر کے اسی پُرانے محلے میں رہتا تھا جہاں مولوی عظیم الدین اب تک رہائش پذیر تھے۔ طے یہ پایا کہ شاکر جا کر مولوی صاحب اور ان کی فیملی کو بھی باقاعدہ و قریب میں آنے کی دعوت دے آئے۔ سنی کو شاید شاکر پر زیادہ اعتماد نہیں تھا لہذا وہ خود بھی شاکر کی گاڑی میں سوار ہو کر مولوی صاحب کو اپنے چلا گیا کیونکہ اب قریب کا وقت تو سمجھو ہو ہی چکا تھا، مولوی صاحب کے انتظار میں دیر بھی ہو چکی تھی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑا سستی سے سانسے رکھے ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا جب چھوٹے (عباد) نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ "ہے بگ بی، کیا نیچے" نے کا ارادہ نہیں ہے۔ پارٹی شروع ہو چکی ہے۔" عباد ہمیشہ کی طرح آج بھی شام کی پارٹی کے لیے باقاعدہ سوٹ اور بیجنگ بو (Bow) میں بیوس تھا۔ اُسے دیکھ کر میری بے ساختہ ہنسی نکل پڑی۔

"تم تو اس طرح تیار ہو کر نیچے جا رہے ہو جیسے آج ہی تمہارے رشتے کا بھی فائل اعلان کر دیا جائے گا۔"

"عباد نے میری بات سن کر زبرداسی منہ تھایا۔" کم آن بگ بی، آپ بھی نہ۔۔۔۔۔ یونو آئی آل ویز ریمن ویل ڈریسڈ (You know I always remain well dressed) میں نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور ننگی عباد کی طرف پھینکا۔

"خوب جانتا ہوں میں تمہاری اس خوش لباسی کو۔۔۔۔۔ ضرور کسی نئی محبت کے استقبال کے لیے ہوں بن ٹھن کر ہاں میں جا رہے ہو مجھے

یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ سارے شہر کی لڑکیاں کیا آشوب چشم کی بیماری سے دوچار ہیں ! ورنہ بھلا کوئی تمہاری جانب دیکھتی ہی کیوں "

عباد ہنس۔۔۔۔۔ گھر کی مرفی دل برابر۔۔۔۔۔ آپ سب گھر والے بھلا میری قدر کیا جانتیں۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔۔ اب آپ بھی دیر نہ

کریں۔۔۔۔۔ کشنر صاحب کا حکم ہے کہ سب لوگ نیچے موجود ہونے چاہئیں۔"

منیں اور عباد تنہائی میں بابا کو کشنر صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ میں سمجھلا سا گیا۔۔۔۔۔ اُف۔۔۔۔۔ کیا مصیبت ہے یا۔۔۔۔۔

ایک بچے کی معصوم سی رسم کشائی کو اس قدر دکھاوا اور بڑھاوا دینے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں بچے روزانہ پورا قرآن شتم

کرتے ہیں، حفظ کر لیتے ہیں۔ لیکن کہیں بھی یوں اس کا ذکر نہ ورائیں جیٹا جاتا، اور پھر ایسے موقع پر اس طرح کی پارٹی۔۔۔۔۔ منیں ٹو فیڈ پ Fed

UP ہو گیا ہوں۔"

عباد سمجھانے کے انداز میں بولا "کم آن بگ بی۔۔۔۔۔ بی اے سپورٹ۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں یہ صرف دکھاوا ہے۔ لیکن کسی اور کی نہیں تو

صرف سنی کی خوشی کے لیے ہی آج آجائیں، آپ جانتے ہیں وہ آپ سے کس قدر رنج ہے۔" عباد دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ منیں سنی کی

خوشی کے لیے پارٹی میں ضرور شرکت کروں گا چاہے اوپری ول سے ہی سہی۔

شاید ہماری زندگی کے نوے فیصد فیصلوں میں ایسے ہی کسی اپنے، کسی لاڈلے کا بھرم رکھنا فیہی دی شرط ہوتی ہے۔ ہم بہت تھوڑی زندگی خود

اپنے آپ کے لیے جی پاتے ہیں، زیادہ تر تو دوسروں کا بھرم رکھنے میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

## پھر وہی محبت

شہر کی کنٹونمنٹ میں جہاں علاقے کے بڑے امراء کی کوشیاں کئی کئی ایکڑوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی علاقے میں دورویہ درختوں سے بھری ایک سڑک کے انتہام پر ریڈ کسٹرز احمد رضا کی عظیم الشان حویلی آج پھر برقی ققوں سے جھللا رہی ہے۔ دھوپ داخل چکی تھی لیکن شام کے بڑا بھی پوری طرح پھیلے نہیں تھے۔ ڈور سے کسٹرز صاحب کی پڑائی مرشد یز کاڑی، جو اب زیادہ تر گھر کے کام کاج کے لیے استعمال ہوتی تھی، فرار نے بھرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ گاڑی کو گھر کا سب سے پُرانا ڈرائیو رشا کر چلا رہا تھا اور سنی میاں چہرے پر ان جانی خوشی کے تاثرات لیے ہوئے بیٹھے تھے جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر لوٹے ہوں۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سفید چادروں میں ڈھکی، دو چھوٹی موٹی سیڑیاں سنی ہوئی بیٹھی تھیں ابھی مولوی عظیم کا کچھ اتار پڑا تھا۔ گاڑی نے حویلی کے بڑے بڑے جنگلوں والے گیٹ کے سامنے پہنچنے سے پہلے ہی مخصوص انداز میں دوسرے بارن بھادیا تھا لہذا آہنی جنگلوں والے گیٹ کے ساتھ ہی بنے ہوئے کڑی کے کیمپن سے دو طارم تیزی سے نکلے اور انہوں نے گاڑی کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گیٹ کھول دیا۔ کسٹرز صاحب کی نیلی مرشد یز تیزی سے گھر میں داخل ہو گئی۔

☆☆

جب تک میں تیار ہو کر نیچے حال میں پہنچا تب تک تقریباً سبھی مہمان آ چکے تھے۔ سنی نے مجھے دیکھتے ہی دور سے یوں ہاتھ ہلایا جیسے وہ مجھے کوئی خاص بات مانا چاہتا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خود سفید کرتا پاجامہ پہنے اپنے دوستوں اور کزن وغیرہ میں اس قدر گھرا ہوا تھا کہ اس کا فوری طور پر مجھ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ عبد صاحب حسب معمول بیگمات کے ساتھ آئی ہوئی ان کی بیٹیوں اور دوسری لڑکیوں کو متاثر کرنے کی حتی الوسع کوششوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف بابا اور سجاد بھائی ہمیشہ کی طرح اس پارٹی میں آئے ہوئے چند بڑے ناموں کے ساتھ بزنس ڈینز کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔ بابا ایسے موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ہال میں کافی چہل چل تھی، ہر طرف جیسے رنگ و نور کی برسات ہو۔ ایک طرف می اور عربہ بھائی بیگمات کو متاثر کرنے کا ہر حربہ استعمال کر رہی تھیں۔ جیواری کی ہاتھیں تھیں۔ نئے آنے والے فیشن کی ہاتھیں تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں فرانس یا سوئٹزرلینڈ میں گزارنے کی ہاتھیں تھیں۔ رنگین آچھل ہر طرف لہرا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سنی کے پہلے پارے کی رسم نہ ہو بلکہ اس کے نکاح کی تقریب ہو۔ میرے میز میوں سے اترتے اترتے بہت سی خواب ناک نگاہوں کے سلام مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن انہوں کا مران میں اس معاملے میں انتہائی نا شکر واقع ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔۔ مجھے محبت وغیرہ قسم کی چیزوں کا سوچ کر ہی ہلکی آجاتی تھی۔ مجھے عورت بھی برتنے کی حد تک بھی اس طرح پسند نہیں آتی تھی جیسا کہ عام رومانوی داستانوں میں بیان کیا جاتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بچپن سے ہی مخلوط اداروں میں تعلیم (Co-education) حاصل کی تھی۔ بچپن سے ہی میری بہترین دوست صرف لڑکیوں ہی رہی تھیں۔ میں انہی کے ساتھ بچپن



میں انہی کے کھونوں کے کمروں سے لے کر جو جوانی کے اسٹڈی رومز اور پھر جوانی میں بیڈروم تک ساتھ ساتھ رہا تھا۔ میرے لیے اس محفل کی تمام لڑکیاں بس لڑکیاں ہی تھیں۔ جیسے کسی ہاسٹل میں رہتے ہوئے بہت سے کلاس فیلوز۔۔۔ سبھی مجھے اور میں سبھی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ان میں سے کئی ایک کا خاص رازد ر بھی رہ چکا تھا۔ لیکن میں نہ جانے کبھی اس بات کو کون محسوس نہ کر پایا تھا کہ یہ سب اب بچپن ورنو جوانی سے نکل کر اس عمر میں پہنچ چکی ہیں جہاں اب کوئی ایک نامحرم ہی ان کا رازدار ہو سکتا ہے۔ یہ سب بابا کے ساتھ کے ریٹائرڈ پیرو کریٹس اور امراء کی بیٹیاں تھیں جن کے ڈرامہ نویس کے ایک ویدار کے لیے شہر اور کالج کے عام لڑکے سارا دن چھاؤنی کی سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے گزار دیتے تھے۔ لیکن میں اس حسن کے اس قدر قریب رہا تھا کہ اب میرے لیے اس کا نظارہ ایک معمول کی بات تھی۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی جیسی ہی ایک جنس کے لیے اس قدر بے تابی کا مطلب۔۔۔ مجھے تو زیادہ تر حسین لڑکیاں بے وقوف ہی ملی تھیں، وہی ان سب کا ایک ہی جیسا انداز لڑکوں کے سامنے سلجیوہ اور معجزہ نظر آنے کی کوشش اور تہائی میں آپس کی لڑکوں سے ویسی ہی گفتگو جیسے ہم لڑکے آپس میں ان لڑکیوں کے بارے میں کرتے تھے۔

سب سے پہلے مجھے بیگم عشرت کی صاحبزادی لیتی نے میز میوں سے اترتے ہی اچک لیا۔ ”اف میڈی۔۔۔ کہاں رہتے ہو آج کل۔۔۔۔۔ بے رخی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔۔۔۔۔“ میں نے اسے جھڑپا۔۔۔ ”سنا ہے سینوں سے دور کی صاحب سلامت ہی چھٹی ہوتی ہے۔“ وہ مسکرتی، ”یونانی۔۔۔ اچھا تاؤ اس جمرا کو آ رہے ہونا ہماری طرف۔ سلی کی انگیمنٹ (Engagement) پارٹی ہے۔“

سلی لیتی سے ایک سال چھوٹی بہن تھی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”سلی کی مگنی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔؟ لیکن اس نے تو میرے ساتھ بھی کچھ وعدے کیے تھے۔“ لیتی نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ ”تمہارے وعدوں کے انتظار میں بوڑھی ہونے کے لیے میں جو بیٹھی ہوں۔ بتاؤ نا۔۔۔ آؤ گے نا۔“ اتنے میں دوسری طرف سے داریہ اور حمیرہ مختلف سمتوں سے نکلیں۔ انہیں میری لیتی کے ساتھ ہوں تہا کھڑا ہونا قطعاً پسند نہیں تھا۔ حمیرہ جانتی تھی کہ مجھے کارالباس بہت پسند ہے لہذا وہ آج خصوصی طور پر سیاہ ساڑھی پہن کر آئی تھی۔ اور سچ ہے کہ اس کا گوارنگ کالی ساڑھی میں فوج بھی خوب رہا تھا۔ داریہ حسب معمول ظہیر اور نئے انداز کی چستی شرٹ میں بیوس تھی۔ وہ اٹھل کر بولی ”میڈی۔۔۔۔۔ تم نے یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد گھر سے لگنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ بس تم کل شام مجھ سے مل رہے ہو۔۔۔۔۔ مجھے تمہیں بہت سی باتیں بتانی ہیں۔ کوئی بہانہ نہیں چھپے گا۔“ وہاں ڈور کھڑی ناند اور چکی مجھے مار رہے ہاتھیں کرنا دیکھ، غصے سے مجھے گھور رہی تھیں اور لوگوں کی نظر بچا کر کچھ ایسے اشارے کر رہی تھیں کہ میں جب اکیسے میں ان سے ملوں گا تب وہ میری خوب خبر لیں گی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ سبھی لڑکیوں کے رازدار ان کے گلے شکوے اور ان کی باتیں تہائی میں ایک جیسی ہی ہوتی تھیں۔ شاید ساری دنیا کی عورتیں ایک ہی جگہ اور ایک ہی قسم کی مٹی سے بنائی گئی ہیں۔ تہائی میں سبھی مجھ سے شکوہ کرتیں کہ بڑھائی ختم ہونے کے بعد اب میں ان پر توجہ ہی نہیں دے رہا، کسی نہ کسی بہانے میرا ہاتھ تمام بیٹیں۔ مجھ سے روغٹیں اور پھر خودی من بھی جاتیں۔ سبھی کا یہ گلہ ہوتا کہ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں ان کے لیے کیا معنی رکھتا ہوں۔۔۔۔۔ اور یہ کہ سبھی نے میری بچپن اور لڑپن کی یادوں کو کس قدر سینٹ سینٹ کر دے سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ سبھی کا رومان ایک ہی جیسا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ ان لڑکیوں کے دماغ میں بچپن کی یادیں اور

بچپن کا رومان اس قدر گہرا اثر ہے ہوئے کیوں ہوتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بچپن میں لڑکیاں وہ مصوم دوتی ہی اس لیے کرتی ہیں کہ بڑے ہو کر جوانی میں اسی دوست کو اپنے خوابوں کا شہزادہ بنالیں۔۔۔؟

بحر حال۔۔۔ اس وقت میں اس رومان سے بالکل بے خبر تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کسی کا محبوب ہونا کس قدر اعزاز کی بات ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں کا محبوب بننے میں عمریں بیت جاتی ہیں لیکن تب بھی یہ مسند کی کسی ایک آدھ خوش نصیب کا ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔ ہماری ساری عمر دوسروں کو اپنا محبوب بنانے میں ہی صرف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خود کسی کا محبوب بننا ہمارے اختیار میں ہوتا ہی کب ہے؟ یہ اعزاز تو صرف آسمان سے ہی وار ہوتا ہے۔ لیکن تم یہ ہے کہ اس اعزاز کو پانے والے خود اس اعزاز اس رجبے کی حرمت سے بے خبر ہوتے ہیں۔

میں سبھی سے ملتا تھا، ان نازنیوں کو چمچیتا اور ان سے اٹھکیاں کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ محبت کا نیا موسم میرے بہت قریب یوں بکھر رہا ہے جیسے وہ صدیوں سے بس میری ہی ناک میں ہو۔ اور تھکی دھنا میرے قدم جسے ہال کے لکڑی سے بے فرش پر جم سے گئے۔ میرے آس پاس کا سبھی شور، وہ نفرتی قہقہوں کا جھڑنگ تھم سا گیا۔ فضا ساکت سی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کسی خود کار ریوٹ کے ذریعے اس ساری محفل کو چند ساعتوں کے لیے جامد (Pause) کر دیا ہو۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈری سی، سبھی سی۔۔۔ بڑے سے سفید دوپٹے کی آڑھ لے کر۔۔۔ آس پاس سے گزرتے مردوں کی نظر سے بچنے کی کوشش میں اس کا سونے جیسا رنگ گھٹی، میز سے اور بھی تپنے لگا تھا۔ ایک ساعت کے لیے اس کی گھٹی کالی پلکیں اٹھیں اور میں ہمیشہ کے لیے ان آنکھوں میں غرق ہو گیا۔ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔۔۔ اگر لوگ اسی کو کیو پڈ کا در کہتے ہیں تو اس سے زیادہ بے رحم اور سفاک وار آج تک میں نے اپنی تمام زندگی میں نہیں جھیلا تھا۔۔۔ جانے وہ لڑکی کون تھی۔ سفید کرتے اور تنگ پا جامے میں لبوس۔۔۔ اس کے نازک سے سراپے نے جیسے اُس پوری محفل کو ناٹ کا بنا دیا تھا۔۔۔ اور وہ خود اس ناٹ میں محفل کے ایک بیوند کی طرح لگی بیٹھی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس لڑکی کے علاوہ اس محفل میں دوسری کوئی حسین موجود نہ تھی۔ وہ تو نازنیوں کی جبرہہ تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک عشوہ طرز، نازک اندام مہ جینوں کا جھرمٹ موجود تھا وہاں۔۔۔ لیکن اس لڑکی میں جو یک کونے میں اپنے جیسے ہی جیسے میں بیویں ایک نسبتاً کم عمر کی لڑکی کے ساتھ پُپ چاپ خاموش سی بیٹھی تھی، جانے ایسی کیا بات تھی، وہ سر کے بالوں سے لگی ایک بی سی شریر لٹ سے لے کر پاؤں میں پہنے نازک سے کھنٹوں تک پورا ایک جہاں ہی تو تھی۔ آس پاس سے گزرتے مرد اور عورتیں حیرت سے ان دو لڑکیوں کو دیکھتے جو کسی بھی طرح اس پارٹی سے اور اس کے ماحول سے میل نہیں کھا رہی تھیں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی تنہا سا ہاتھ میرے کوٹ کی آستین کھینچ رہا ہے۔ میں اپنے خیالات کی رو سے باہر نکل آیا۔ سنی جانے کب سے مجھے آوازیں دے رہا تھا "چاچو۔۔۔ میری بات تو سنئے۔۔۔ میڈی چاچو۔۔۔"

میں اس کی طرف متوجہ ہو لیکن میرا دھیان اب بھی اسی لڑکی میں انکا ہوا تھا۔ سنی مجھ سے کچھ ناراض تھا۔ "جائیے چاچو۔۔۔ میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔ آج سب نے مجھے گفٹ دیے ہیں لیکن آپ نے ابھی تک۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھ کر پاس پڑی میز پر بٹھ دیا۔ "ارے یار۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارا میڈی چاچو تمہیں آج کوئی گفٹ نہ دے۔ بولو کیا چاہیے۔ سنی کے

چہرے پر مصحوم سی خوشی لہرائی اور وہ باقاعدہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”ہوں۔۔۔۔۔ نیا پلاسٹیشن۔۔۔۔۔ دو جاکیز Jokies کے ساتھ۔۔۔۔۔“

میں نے ہائی بھری۔ ”چلو منظور ہے۔۔۔۔۔ کل تک تمہارے روم میں موجود ہوگا۔ اب خوش۔۔۔۔۔“ سنی نے خوشی سے نعرہ لگایا، ”اوہ چاچو۔۔۔۔۔ یو آر گریٹ“ اب میں بچے مطلب کی بات پر آیا۔ ”لیکن یار۔۔۔۔۔ آج تمہاری پارٹی میں کچھ نئے لوگ بھی نظر رہے ہیں۔ تم نے تعارف بھی نہیں کروایا ان سے“ میں نے دور بیٹھی دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ وہ دونوں۔۔۔۔۔ وہ تو ایمان آپی اور حیا باجی ہیں۔ وہ جو ہیں تا میرے مولوی صاحب۔۔۔۔۔ انہی کی بیٹیاں ہیں۔ صرف میرے لیے آج یہاں آئی ہیں۔“ سنی میاں بڑے فخر سے بتا رہے تھے اور میری نظریں اسی قیامت کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔ پتہ یہ چلا کہ جب ڈرائیور شا کر سنی کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر پہنچے تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب تو گذشتہ رات سے بخار میں تپ رہے تھے۔ ان کا تقریب میں شرکت کرنا ناممکن تھا۔ لیکن سنی میاں محل گئے کہ اگر مولوی صاحب کی طرف سے اس کی رسم کشائی کی تقریب میں کوئی شریک نہ ہوا تو سنی وہ تقریب ہی ملتوی کر دے گا۔ دراصل سنی پہلے بھی ڈرائیور کے ساتھ کئی مرتبہ مولوی صاحب کو ان کے گھر ڈراپ کروانے جا چکا تھا۔ کبھی خراب موسم کی وجہ سے اور کبھی مولوی صاحب کی دکھائی سائیکل کی کسی خرابی کی وجہ سے، اور جب کبھی بھی مولوی صاحب سنی کے ساتھ کبھی کسی گاڑی میں گھر آتے تو سنی کا گھر کا بیٹا ہوا خاص شکلیں پلائے بنا، جانے نہ دیتے۔ جو خود سنی کا بھی خاص پسندیدہ مشروب تھا۔ اور یہ مشروب بنانے والی ہوتی سنی میاں کی ایمان آپی، یوں سنی مولوی صاحب کے تمام گھروالوں سے خوب محل مل چکا تھا۔ مولوی صاحب کی بیوی اور بیٹیاں بھی سنی سے بہت مانوس ہو چکی تھیں۔ شاید اسی لیے اس دن سنی کی ضد کے سامنے مولوی صاحب کو ہار ماننا ہی پڑی۔ ان کی بیوی تو ایسی تھا کہ یہاں سے جانے کے نام سے ہی ہول کھاتی تھی۔ سو انہوں نے دبے اخلاط میں چھوٹی بیٹی حیا کو سنی کے ساتھ بھیجنے کی تجویز دی۔ عام طور پر مولوی صاحب ایسی باتوں کو سخت نا پسند کرتے تھے لیکن جانے کیا سوچ کر انہوں نے کچھ دیر کے لیے حیا کو جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن حیا نے اکیلے جانے سے صاف منع کر دیا تب کٹھنی کا پرانا ڈرائیور شا کر جو بہت دیر سے گھر کے دروازے پر گاڑی لیے سنی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ دروازے پر آیا اور تمام معطلے کی سن گن ملنے کے بعد اس نے بھرے لرزے کانپتے مولوی صاحب کو تسلی دی کہ حیا اور ایمان دونوں ہی اس کی اپنی چچیاں ہیں اور اسی کے ہاتھوں میں کھیل کر جوں ہوئیں۔ اُس نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ دونوں بچیوں کو سنی میاں کی خوشی کے لیے چاہے تھوڑی دیر کو ہی کسی تقریب میں جانے کی اجازت دے دیں۔ شا کر خود انہیں رسم کشائی کی فوراً بعد واپس گھر چھوڑ دے گا۔ حیا کی حد تک تو مولوی صاحب اپنے دل کو مٹا چکے تھے لیکن ایمان نے تو جوانی کے بعد گھر کی دلہیز سے تہا قدم باہر نہیں دھرا تھا، جانے کس بھاری دل سے انہوں نے شا کر کی یہ تجویز مان لی۔ جانے شا کر سے نہ اپنی محلے داری کا پاس تھا یا پھر وہ سنی کا دل نہیں تو زنا چاہتے تھے، لیکن جب تک دونوں لڑکیاں گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ نہیں گئیں وہ بے چینی سے گھر کے صحن اور باہر گلی میں کھڑی گاڑی تک کے چکر کاٹنے رہے۔ اور گاڑی کے چلتے چلتے بھی انہوں نے شا کر کو کئی مرتبہ کی دھرا کی ہوئی ہدایات پھر سے دوبارہ یہ دہائی کے طور پر دہرائیں۔

ہماری زندگی میں کب، کس موڑ پر کون سا حادثہ ہماری تاک میں ہے۔ یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ میری اپنی دانست میں

محبت سے بڑا کوئی ورعہ ایسا نہیں جو ہماری زندگیوں میں وارد ہوتا ہو۔ اور ہم انسان اتنے بھجور اور لاچار ہوتے ہیں کہ ایسے ہر حادثے کا لازم لفظ ”کاش“ کو ہی دیے جاتے ہیں۔ کاش میں اس دن گھر پر ہی نہ ہوتا، کاش مولوی صاحب اس دن بیمار نہ ہوتے، کاش سنی انہیں لینے خود ان کے گھر نہ جاتا اور اگر چلا بھی گیا تھا تو ایمان اس کے ساتھ نہ آتی۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔

اس کے بعد اس تقریب میں کیا ہوا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید میں اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ دوسری بار جب میں نے اس طرف نظریں دوڑائیں جہاں ایمان اور حیا سنی بیٹھی تھیں تو وہ جگہ خالی تھی۔ میں نے بے چینی سے تمام محفل چھان، رکی لیکن ایمان جا چکی تھی۔ پتہ یہ چھا کہ شا کر چونکہ مولوی صاحب سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ مغرب کی اذان سے قبل ان دونوں کو گھر واپس پہنچا دے گا۔ اس لیے ان دونوں نے تقریب کے خاتمے سے قبل ہی شا کر کو واپسی کا پیغام بھجوادیا تھا۔ اور جانے کس لمحے وہ وہاں سے چلی بھی گئیں اور میں اپنی قسمت کو کوستانی رو گیا۔

لیکن جاتے جاتے وہ بڑی جیسے میرا بہت کچھ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک وہ پارٹی، وہ محفل جس میں چاروں طرف رنگوں کی برسات تھی، نور کا بے رتھا، قیمتی تھے۔ مسکراہٹیں تھیں۔۔۔۔۔ یکا یک یوں ویران ہو گئی تھی جیسے اچانک کسی نے اس محفل سے سب رنگ نچوڑ لیے ہوں۔ یہ من سے من کا کیسا ناطہ ہوتا ہے کہ سینکڑوں کی بھیز کسی ایک کی وجہ سے اپنی ہی لگنے لگتی ہے۔ اور پھر یہاں تو قصہ ہی یک طرفہ تھا، جو بھی طوفان اٹھ رہے تھے وہ صرف میرے من میں تھے۔ ایمان تو اس سب سے بالکل بے خبر تھی۔ اگر لوگ جسے محبت کہتے ہیں وہ اسی جذبے کا نام تھا جو اس وقت میرے خون کے ساتھ گردش کر رہا تھا تو کیا یہ محبت اس قدر زور آور ہو سکتی تھی کہ وہ صرف یک طرفہ ہو کر بھی کسی انسان کی زندگی کے سبھی انداز۔۔۔۔۔ سبھی اطوار بدل کر رکھ دے۔۔۔۔۔؟

☆☆☆

## 1947ء کے مظالم کی کہانی خود مظلوموں کی زبانی

ایسے خون آشام قلب و جگر کو تڑپا دینے والے چشم دید واقعات، جنہیں پڑھ کر ہر آنکھ پر غم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریریں، جنہوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس مملکت سے ٹوٹ کر پناہ لی۔  
تو پھر یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ کیا آزادی کے چراغ خون سے روشن ہوتے ہیں؟ یوم آزادی پاکستان کے موقع پر کتاب گھر کی خصوصی پیش کش۔ نوجوان نسل کی آگہی کے لیے کہ یہ وطن عزیز پاکستان ہمارے بزرگوں نے کیا قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔  
اس کتاب کو کتاب گھر کے تاریخ پاکستان سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## لندن اُداس ہے

کہتے ہیں غنیمت سب سے بڑی چور ہوتی ہے، وہ انسان کی آدمی عمر چراتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھ سے میری یہ چور بھی رونگی ہوئی تھی۔

جانے رات کے کس پہر کامران نے لاؤنج میں جھانکا اور مجھے وہیں آتھن ان کے پاس آرام کرسی پر آنکھیں موند سے بیٹے دیکھ کر مجھ پر کبیل ڈال گیا۔ رات پونہی ماضی کے درپچوں میں جھانکتے ہوئے جانے کب بیت گئی اور اس کی جگہ صبح کے اُجالے نے لے لی۔ رات بھر برف باری کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا۔ کامران نے ناشتے کے دوران مجھے آفر کی کہ وہ مجھے ریسٹورنٹ جاتے ہوئے ”کنگسٹن (Kingstone)“ یونیورسٹی چھوڑا جائے گا۔ لیکن میں نے اسے بتایا کہ میں تجا ہی گیا رو ساڑھے گیارو بجے تک گھر سے نکل جاؤں گا، وہ ریسٹورنٹ چھا جائے۔ ویسے بھی اسے صبح جلدی ہفتی کر اپنے کاروبار کا آغاز کرنا ہوتا تھا۔ اور میرا اتنی صبح گھر سے نکلنے کا قلعی کوئی موا نہ تھا۔ اور پھر لندن میرے لیے کبھی بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ ایک عجیب سی اُنسیت اور انا پنا پن تھا میرے لیے اس شہر میں شاید اس کی ایک وجہ اس کے موسم کی میرے آبائی شہر کوئٹہ کے موسم سے مماثلت بھی ہو سکتی تھی۔ نہ صرف موسم بلکہ پُرانے لندن میں جہاں اب تک تقسیم ہند سے پہلے اقوام کی فرتیں اور تعمیرات موجود تھیں ان میں سے بعض کی بناوٹ تو ہو بہو 1935ء کے ڈزے سے پہلے والے کوئٹہ کی عمارات کی طرح ہے۔ بنیادی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ کوئٹہ تقسیم ہند سے قبل خود برٹش ایمپائر کی بہت بڑی چھاؤنی رو چکا تھا اور اسے آباد کرتے وقت انگلش ہنر کاروں نے فن تعمیرات میں اینٹ کا رخ، عمارت کی بیرونی اٹھان اور طویل اور چوڑی سڑکوں کی کشادگی دیتے وقت شاید لندن ہی کو ذہن میں رکھا ہوگا۔ اور پھر صرف میرے شہر پر ہی کیا منحصر ہے۔۔۔۔۔ تقسیم سے قبل اگر بڑے جن علاقوں میں بھی رہا (خاص کر سرد علاقے) وہاں کی طرز تعمیر ایک مخصوص روایت کو ہی جنم دیتی محسوس ہوتی ہے۔ وہی مین کے سرخ چھت، وہی مخصوص بالکونیاں اور آئینہ شیاں، وہی ایک جیسے آتش دان اور ان پر بننے کارلس، ایک جیسے لکڑی کے بڑے بڑے دروازے جن پر انگلش کے نمبر سات کی شکل کے بڑے بڑے تختے کندہ ہوتے تھے۔ وہی اونچے اونچے چھت اور ان میں بنے بڑے بڑے روشن دان جنہیں کھولنے اور بند کرنے کے لیے ری یا ڈوری مچی ہوتی تھی۔ اس لیے آج بھی اگر آپ پُرانے لندن کی گلیوں سے گزریں تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ برصغیر کے دور کی کسی بڑی چھاؤنی میں آ گئے ہیں۔

میں جب تک گھر سے نکلا تو اچھی خاصی دھوپ نکل چکی تھی۔ برف صاف کرنے والی مشین نے سڑکوں سے برف ہٹا کر کناروں پر کر دی تھی۔ برف باری کے بعد نکلنے والی دھوپ بے حد چمک دار ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے قدرت کے ان دیکھے ہاتھ نے آس پاس کی سب چیزوں پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ مخصوص رنگ کی پکی اینٹوں سے بنی سڑک تھما سی رہی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر بھی ایک خاص سی چمک تھی۔ یہ موسم بھی ہم





انہی اُلٹے سیدھے خیالات کی پرورش میں مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب شوب ٹرین میرے مطلوبہ سب وے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اور کب رکی۔ یہ تو چھ تھا کہ آخری چند لمحوں میں سامنے جھلکاتے ہوئے نئون سائن پر میری نظر پڑ گئی جس پر 17 ڈاؤننگ سٹریٹ کا ہندسہ جھلک رہا تھا۔ مجھے جیسے ہوش سا آ گیا اور میں ٹرین کے دروازے بند ہونے سے قبل ہی نیچے اتر آیا۔ سیزھیوں چڑھ کر اوپر کی سڑک تک پہنچا۔ اب یہاں سے 9 نمبر کی لندن کی مشہور و مخصوص سرخ ڈبل ڈیکر بسوں میں سے ایک بس مجھے سیدھا یونیورسٹی کے گیٹ تک پہنچا سکتی تھی۔

لندن بالکل ویسا ہی تھا جیسے میں اسے دو سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس بس اسٹاپ کے بالکل سامنے بوز حابر گد کا درخت اب بھی ویسے ہی کھڑا مسکرا رہا تھا جیسے مجھے پھر سے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ انگریز ایسی باتوں کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ صرف اس درخت کو بچانے کے لیے انہوں نے چند سال پہلے اپنے ماسٹر پلان کے نقشے میں یہاں سے گزرتی سڑک کا رخ موڑ دیا تھا کیونکہ اگر سڑک لندن ماسٹر پلان کے تحت فنی تو اس درخت کا کتنا لازمی تھا، لیکن انگلش روایت پرست اور ماضی پرست قوم ہے۔ وہ اپنی یادوں کو اپنی تاریخ کو اتنی آسانی سے مسخ نہیں ہوتے دیتے بلکہ اُسے بچانے کے لیے جان لڑ دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس قوم نے برسوں اس دنیا پر راج کیا ہے۔ سچ ہے۔۔۔ قومیں پونہ نہیں بن جاتیں، اس کے پیچھے صدیوں کی تربیت اور جوڈ کا عمل دخل ہوتا ہے۔

کچھ ہی لمحوں میں میری مطلوبہ سرخ ڈبل ڈیکر بس دھیمی دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی بس اسٹاپ پر آ کھڑی ہوئی اور میں بس میں سوار ہو گیا۔ یونیورسٹی کے راستے میں میرا نہانا دوست، میرا ہم راز اور میرا مہربان دریا دریائے ٹیمز (River Thames) پڑتا تھا۔ میرے لڑکپن کی کئی شامیں اور جوانی کی کئی راتیں اس دریا کے کنارے لگے ہوئے خوبصورت لکڑی کے بچوں پر گزری تھیں۔ وہ ہیل، جنھیں اب میں یاد کر رہا تھا تو جیسے سب اک خوب ماحسوس ہو رہا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ پک ٹکس وہ نئے نئے فلرٹ، وہ مکی مکیٹیں، ٹیمز کا پانی مجھے دیکھ دیکھ کر مستی میں لکھوڑے لے رہا تھا جیسے وہ میری لندن آمد سے بہت خوش ہو، بس دریا کے ساتھ بنی ہوئی چوڑی سی سڑک پر بڑھ رہی تھی اور دریا ہمارے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی پُرانے محلے میں جب کوئی چھپاتی کار یا بڑی گاڑی داخل ہوتی ہے تو محلے کے بچے اس گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کے موسم، درخت عمارتیں اور اس جیسے دریا، یہ ہمیں کس کس روپ میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ہنستے ہوئے۔۔۔ بکھی روتے ہوئے۔۔۔ خوشی غم۔۔۔ غرض ہماری زندگی کا کون سا پہلو ہے جو ہمارے ارد گرد بیٹے اس ماحول سے پوشیدہ ہوتا ہے، شاید ہی لیے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ ہی خوش ہوتے ہیں اور ہمارے ساتھ ہی روتے ہیں، شاید ہر موسم ہمارے اندر کے موسم سے جڑا ہوتا ہے۔

بس یونیورسٹی کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ میرا اسٹاپ آ گیا تھا۔ میں یونیورسٹی کے عظیم الشان آہنی جھگے کے گیٹ سے اندر بنی اینٹوں کی سڑک پر آ گیا۔ یہ بہت بڑے گھس کے دالانوں پر مشتمل ایک ایسی عمارت تھی جس کے اندر سے دریائے ٹیمز کی ایک چھوٹی سی شاخ گھس کے عظیم میدانوں کو سیراب کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دور دور تک بہت بڑے بڑے اور اونچے درخت ایسا وہ تھے، جو اس وقت رات کی برف باری کی وجہ سے دور سے سفید لہاسوں میں بیسوں بوڑھے بزرگوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دریا کے پانی کے اوپر شفاف برف کی ایک سل نما تہہ بچھی ہوئی تھی جس

کے نیچے دریا کا پانی بہتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی اور برف کے اس ماحول میں اس کے اونچے بے ستون اور باقی عمارت بھی برف ہی سے بنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایڈمن ڈیپارٹمنٹ سے فارم لے کر میں نے بھر دیے تھے اور میری گلاسز دونوں کے بعد سے شروع ہونا تھیں۔ پتہ چلا کہ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ایک یہودی نژاد مسٹر آرتھر ہیں جو خود یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہیں۔ میں ان سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن پتہ چلا کہ وہ صبح گیارہ بجے کی کلاس کے بعد شہر میں ہونے والی کسی تقابلی تقریب میں چلے گئے ہیں جس میں وہ بطور مہمان خصوصی مدعو تھے۔ میرا اب یونیورسٹی میں مزید نکلنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہذا میں اسی راستے سے واپسی کی بس لے کر سب دے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کے اچھائی نئے چکے تھے دریا و فٹری اوقات کے مطابق دن کے کھانے کا وقت تھا۔ لہذا سب دے میں بھی صبح کی نسبت زیادہ چہل پھل دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے فی الوقت بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی میں کافی اور ایک سینڈویچ کا لٹچ کرنے قریبی ریسٹوران میں داخل ہو گیا۔ قدرت نے ہم انسانوں کو ان کی کم نیگی اور بے بسی کا احساس دلانے کے لیے اس دنیا میں جن اور بہت سی چیزوں کا اہتمام کر رکھا، وہ ہیں بھوک بھی ان مجبوریوں میں سے ایک ہے، بڑے سے بڑا قد آور اور عہد زور اس مجبوری کے آگے بے بس ہے۔

اور عزیز سے عزیز ترین رشتہ بھی بھوک کے اس احساس کو مٹا نہیں سکتا۔ ہم اپنے آس پاس روز کیسے کیسے دلداروں کو جان سے زیادہ عزیز رشتوں کو خود سے جدا ہونا اور مٹا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان سے بڑے بے بس انسان جو اس لیے خود کو بھی ختم محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ جن کی بھوک پیس سب ختم ہو چکی ہوتی ہے، جنہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس بے جان جسم کے ساتھ ان کا لاشہ بھی قبر میں اتار دیا گیا ہے، دراب وہ بھی اس جیتی جاگتی دنیا کے ساتھ چل نہیں پائیں گے۔ جن کا ہر احساس اس لیے مٹی ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن 24 یا 48 گھنٹوں کی مختصر مدت کے بعد ہی یہ معدہ انسان کو اس کی کم نظری، بے بسی اور مجبوری کا احساس دلانے کے لیے جاگ اٹھتا ہے، بھوک اسے ستانے لگتی ہے۔

انسان اپنے اندر اپنے آپ سے ہی نفرت اور شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے کہ ابھی چند گھنٹوں پہلے ہی تو وہ اپنے اندر کتنے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ مٹی میں مل جانے کے دعوے، سب تیاگ دینے کے دعوے، لیکن سچ یہ ہے کہ انسان سے زیادہ بے بس مخلوق بھی دوسری اور کوئی نہیں۔ ہاں البتہ ایسے موقعوں پر اسی کے جیسے دوسرے انسانوں کے بتائے ہوئے خود ساختہ اصول اس کے کام آجاتے ہیں اور شرم کا کچھ پردہ رہ جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے "میت کے گھر میں دن تک کھانا نہیں کپے گا، بھلا اس سوگ میں ان بے چاروں کو کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں ہوگا؟ دوسرا کہتا ہے، ہاں ہاں ٹھیک ہے، پہلے دن کا کھانا تو ہمارے گھر سے ہی آئے گا، دوسرا دوسرے دن کا اور کوئی تیسرا تیسرے کا وعدہ کر کے وہاں سے اٹھ آتے ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں کہ کل جب ان کے گھر میں یہ ماتم ہوگا تو تب بھی کبھی سب اس کی دہجائی کو وہاں موجود ہوں گے۔ اس کی شرم کا پردہ رکھنے میں اس کی مدد کریں گے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ انسان بہترین معاشرتی جانور ہے۔

☆☆

گھر واپس پہنچتے تک شام ہو چکی تھی۔ سورج ڈھل رہا تھا، لگی کے چھوڑے وہی کل والے شرارتی بچے پھر سے جمع تھے اور بچے کل کے بنائے ہوئے برف کے پتے کی باقیات سنبھالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سردیوں کی شام کی دھوپ پلک جھپکتے ہی کسی ستم گر محبوب کی طرح آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ ہوا میں خشکی کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی، لوگوں نے اپنے اور کوش کے کار اور چڑھا دیے تھے اور سانس لیتے اور بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں سے بھاپ نکلتی دکھائی دیتی تھی۔ گنار بجانے والی لڑکی نے اپنا گنار اپنے بکس میں رکھ دیا تھا اور اب وہ بھی روا لگی کے لیے تیار تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مانوسیت کی ایک چمک لہرائی۔ وہ ہلکے سے مسکرائی اور میں سر کے اشارے سے اسے سلام کرتا آگے بڑھ گیا۔ رات کا امران بھی جلد ہی واپس آ گیا تھا اور ہم نے سڑک کے کنارے دوسرے بلاک کے ایک چھوٹے زمرہ سکون سے ریسنورنٹ میں کھانا کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور اب ہم اسی ریسنورنٹ کے ایک گوشے میں اپنی ٹیبل کے گرد بیٹھے سوپ کی چسکیاں لے رہے تھے۔ کامرن نے آس پاس بیٹھی لڑکیوں اور خواتین کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنی تھی رائے صادر کر دی تھی۔ اپنے نثری خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ بولا "مرد عورتوں سے اس امید پر شادی کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ویسے ہی رہیں گی جیسے وہ شادی کے وقت ہوتی ہیں۔ اور عورتیں مردوں سے اس امید میں شادی کرتی ہیں کہ شاید وہ شادی کے بعد بدل جائیں گے۔ لیکن افسوس، بعد میں دونوں کو ہی مایوسی ہوتی ہے۔"

میں نے غور سے اُسے دیکھا "شاید اسی لیے تم نے اب تک شادی نہیں کی۔" کامرن مسکرایا، "خیر میری بات چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ آج یونیورسٹی میں دن کیسے گزرا۔" میں نے ٹیپکین میز سے اٹھ کر اپنے ہونٹ خشک کیے۔ "کچھ خاص نہیں۔ بس فارم ہی بھر سکا، ہیڈ آف وی ڈی پورٹمنٹ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ موجود نہیں تھے۔"

کامرن بولا۔ "تم مسٹر آئزک کی بات کر رہے ہو۔ آج کل اخبارات میں اس کا بڑا تذکرہ رہتا ہے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اس جیسے کٹر یہودی نے ایک پاکستانی مسلمان کو اپنی یونیورسٹی میں داخلہ کیسے دے دیا اس سے ذرا بچ کر ہی رہتا۔" مجھے کامرن کی بات سن کر لمبی آگئی۔ "کیوں۔۔۔ کیا وہ آدم خور ہے جو مجھے کھا جائے گا؟"

کامرن سنجیدہ تھا، "تم ان یہودیوں کی طبیعت سے واقف نہیں ہو شاید۔ یہ کبھی بھی دل سے مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہوئے۔ اور اس کا اندازہ ہم جیسے دین رفرم میں سہکتے ہوئے مسلمان ہی ٹھیک لگا سکتے ہیں۔ جنہیں ہر برنس کے معاملے میں ان یہودیوں کی نفرت اور مقابلے کا سامن کرنا پڑتا ہے۔ اور کچ تو یہ ہے کہ فی الحال ان یہودیوں نے ہمیں برنس کے معاملے میں مکمل مات دے رکھی ہے۔"

میں نے سوال کیا، "لیکن تم لوگوں نے اور یہاں کی دوسری برنس کیونٹی نے کبھی ان وجوہات پر غور کیا ہے جو ان یہودیوں کی تجارتی کامیابیوں کا راز ہیں۔"

کامرن نے گہری سی سانس لی۔ "بات بالکل صاف ہے۔ یہودی کبھی تلخ کلامی سے کام نہیں لیتا، اور برنس کا پیدا افسوس ہی خوش اخلاق ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے ہونٹوں سے چٹکی مخصوص مسکراہٹ کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ دوسری اہم وجہ ہے ایک یہودی کا دوسرے یہودی تاجر کا خیاں رکھنا چاہیے وہ یہودی تاجر آپس میں بدترین اور جانی دشمن بھی کیوں نہ ہوں، لیکن اگر ان کا کلائٹ کوئی ایسی چیز طلب کرتا

ہے جو پہلے یہودی کی دوکان پر میسر نہ ہو، تب بھی وہ خود پیدل چل کر اس خریدار کو اس جانی دشمن یہودی کے پاس لے کر جاتا ہے جہاں سے وہ ضرورت کی چیز مل سکتی ہو۔ یہودی کبھی کسی غیر یہودی کو متعارف نہیں کرواتا۔ لیکن اس یہودی تجارت کے پیٹنے کا راز بھی ہے۔“

میں کامران کے خیالات سے کسی حد تک متفق بھی تھا لیکن میرے خیال میں اس نے یہودی تاجروں کی سب سے بڑی خصوصیت کا تذکرہ اب تک نہیں کیا تھا۔

”تم سب سے اہم خصوصیت کا تذکرہ کرنا بھول گئے ہو۔ وہ ہے ایمان داری۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے تاجر اتنے خوش اخلاق اور شخصہ مزاج کے نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ یہ بھی درست ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے سے بھی کبھی باز نہیں آتے۔ ہمارا اُصوں ہے کہ ہن فائدہ ہونہ ہو۔۔۔۔۔ لیکن دوسرے کا نقصان ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ان سب سے زیادہ بڑی وجہ ہے بے ایمانی۔ اور یہودی تجارت میں بے ایمان نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ میرے خیال میں ان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے۔“

ہم دونوں کھانا کھا چکے تھے اور اب پیدل ہی واپس پارمنٹ کی طرف روانہ تھے۔ کرسس کا تہوار قریب رہا تھا لہذا آس پاس خریداروں کی چہل پھل بڑھتی جا رہی تھی۔ جابجی کرسس کے نمائشی درخت مخصوص جتنے بجتے قہقروں سے بے جھلکار ہے تھے۔ لوگ سردی سے بے نیاز ہو کر خود کو گرم کپڑوں سے ڈھکے ہوئے۔ آس پاس کی جھلک کرتی دوکانوں سے خریداری کر رہے تھے۔ شاید دنیا کا ہر تہوار ایک سا ہی ہوتا ہے۔ کبھی تہواروں کا تعلق دل کی خوشی سے ہوتا ہے۔ اور کبھی تہواروں کے اصل شوقین بچے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس وقت بھی لندن کے اس بارونق بازار میں زیادہ تر تعداد بچوں کی ہی تھی۔ مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے تو میدی رات یا چاند رات سے کئی راتیں قبل ہی ہماری نیند جیسے ڈی توجاتی تھی۔ اور میدی رات تو آنکھوں ہی آنکھوں میں صبح ہو جاتی تھی۔ میدی ملنے کی خوشی اور پھر اس سے بھی زیادہ اس عیدی کو خرچ کرنے کی خوشی۔ لیکن عید کا پورا دن ہاتھ سے یوں نکل جایا کرتا تھا جیسے بند مٹی سے ریت۔ شاید چیزوں یا تہواروں کی خوشی کا تعلق ان کی کیسلی اور تھوڑے ہونے سے بھی وابستہ ہوتا ہے۔ آس پاس پھرتے لوگوں کے چہروں سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ یہ چہرے بھی کیسا آئینہ ہوتے ہیں۔

گھر پہنچنے ہی کامران بستر میں ٹھس گیا کیونکہ اسے اگلی صبح جلد نکلتا تھا۔ آج اس نے ایمان کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کی عادتوں سے خوب واقف تھے۔۔۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ میں جب سنبھل جاؤں گا تو خود ہی اسے سب بتا دوں گا۔ اس سے پہلے مجھ سے کچھ پوچھنا فضول ہے۔ میں نے لائٹ بند کرنے سے پہلے بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھے رسالوں کی ورق گردانی کی تاکہ کام کوشش کی لیکن پھر آخر کار رتی بجا دی، لیکن کردہ اندھیرا ہوتے ہی دماغ کے درپے روشن ہو گئے۔ یادیں نڈی ہو یا بھٹی، دونوں صورتوں میں یاد ماضی عذاب ہی تو ہے۔

☆☆☆



## ایمان

سنی کے پہلے پارے کی دُعا یہ تقریب تو گزرتی لیکن اس کے بعد جیسے میرے شب و روز ہی بدل گئے۔ میں خود جان نہیں پارہ تھا کہ یہ بے چینی کیسی ہے۔۔۔۔۔ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود میں اس قدر تکی دست اور بے بس سا کیوں ہوتا جا رہا ہوں۔ دل کہیں بھی تو نہیں ٹپکتا تھا۔ بھیڑ میں ہوتا تو لوگوں سے دور بھاگتا، تنہا ہوتا تو گھبرا کر نیچے لاؤنچ میں جا بیٹھتا۔ مولوی صاحب کی بیماری نے بھی طول پکڑا رہا تھا۔ پتہ چلا کہ اس دن کی بے آرامی کی وجہ سے بخار زور پکڑ گیا تھا۔ لہذا اگلا پورا ہفتہ وہ سنی کو درس دینے نہ آ سکے۔ اور جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے ان کے نہ آنے سے میری کوئی بہت، ہم اور بہت قیمتی چیز مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

یہ اسی ہفتے کی ایک گرم سہ پہر کی بات ہے۔ میں گھر کے دالان میں بیٹروں کے نیچے ڈلی ہوئی آرام کرسیوں میں سے ایک پر آنکھیں موندھے پڑا ہوا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر میں بھی کتنی لمبی ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سورج ایک ہی جگہ ٹپک کر رہ گیا ہے یا شاید مجھ جیسے شوریدہ سروں کو ہی ان کی بے جا حوالت سے اختلاف تھا، جن کے دلدار کہیں بستے ہوں گے شاید وہ ان سے لمبی ملاقات کے لیے ایسی سہ پہروں کی دُعا نہیں، نکلنے نہ جھٹکنے ہوں نہیں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اندر سے سنی میاں شا کر ڈرائیور کے ساتھ شور مچاتے اور اچھٹے کودتے برآمد ہوئے۔ شا کر کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے قمراس تھے اور سنی کے ہاتھوں میں پھلوں سے بھری ٹوکری۔ سنی نے مجھے دالان میں دیکھا تو ہوا گ کر میرے پاس آیا۔

”چاچو۔۔۔ دیکھیں میں نے کتنی بہت سی آکس کریم جمع کی ہے۔“ سنی نے شا کر کے ہاتھوں میں پکڑے چھاری سائز کے قمراسوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سنی کے کان پکڑے، ”ہوں۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ دوپہر کو ماس سے نچپ کر چنگ مٹائی جا رہی ہے۔“

سنی ہنسا ”نہیں چاچو۔ مرنے والی کے ساتھ کب کی شاپنگ کے لیے جا چکی ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہم مولوی صاحب کے لیے لے جا رہے ہیں۔“ مولوی صاحب کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ”کیا مطلب؟ کیا مولوی صاحب کو ڈاکٹر نے بخار میں پیٹ بھر کر آکس کریم کھانے کا کہا ہے؟“

سنی ہنس پڑا، ”افو۔۔۔ چاچو آپ بھی۔۔۔؟“ مولوی صاحب کے لیے تو ہم یہ پھل لے کر جا رہے ہیں۔ کس کریم تو ایمان آپی اور حبیہ باجی کے لیے ہے۔۔۔ اب سمجھے۔“ اتنے میں شا کر گزرا یا۔ ”صاحب بابا۔۔۔ اب آپ ہی سمجھاؤ نا سنی میاں کو۔۔۔ اگر سجاد میاں کو پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن یہ سنی میاں تو مستقل ضد کیے جا رہے ہیں۔ گھر میں اس وقت کوئی دوسرا بڑا بھی نہیں جس سے ہم اجازت سے سکیں۔“

سنی نے منہ بسوا ”مولوی صاحب نے ہمیں پڑھایا ہے کہ جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لیے جانا چاہیے۔ اس سے ثواب ملتا ہے۔ پھر ثواب کے کام کے لیے کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت؟۔۔۔ ہننا میڈی چاچو۔“

پھر جیسے کسی خیال سے سنی کی آنکھیں اپنے آپ ہی چمکنے لگیں۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں نا میڈی چاچو۔“

ہم جلدی واپس آ جائیں گے۔" میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یوں لگا جیسے سنی نے میرے دل کی بات پڑھ لی ہے۔ ش کرنے بھی فوراً سنی کا ساتھ دیا۔ "ہاں جلدی دہا۔۔۔۔۔ آپ ساتھ چلیں گے تو میری بھی کچھ بچت ہو جائے گی۔ ورنہ آپ سجاد میاں کے غصے سے تو واقف ہیں۔"

اب تو سنی نے باقاعدہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ہم تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور جاتے ہوئے گیٹ پر دربان کو ش کرنے بتا دیا کہ سنی اپنے میڈی چاچو کے ساتھ کہیں گھومنے جا رہا ہے۔ گھنٹہ بھر میں واپس آ جائیں گے نہ ش کرنے جان بوجھ کر شاید مولوی صاحب کے گھر کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے گھر والے ایسی باتوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ وہ امیروں اور غریبوں کے درمیان فاصلے کے قائل ہیں۔ لیکن سنی کا معصوم ذہن بھی ایک زمانے کی ان منافقانہ ترکیبوں سے کوسوں دور تھا۔ رسی میری بات، تو مجھے شاکر اس عمر سے جانتا تھا جس میں اب سنی تھا۔ خود میں بچپن میں اسکول سے واپسی پر ش کر سے ایسی ہی بے جا فرمائشیں کرتا تھا۔ کبھی اسکول کے سامنے کھڑے ہوئے ٹیلی سے برف کے ٹھنڈے گولے کھانے کی فرمائش، کبھی ایک مخصوص ریڑھی کے بکس میں نمک اور برف میں جمی دودھ کی قلفیاں کھانے کی خند، تو کبھی سر پہ فالسوں کی نوکری رکھے، آواز لگاتے بوز سے بابے سے فاسے دلوانے کی فرمائش، ش کر گھر والوں سے ٹھپ کر میری ضدیں پوری کرتا جاتا اور جب کبھی میرا گلہ خراب ہوتا تو امی حیرت سے بڑبڑاتیں۔ "اس نے تو کبھی ہار کی کوئی چیز پیکی بھی نہیں۔" اور جب میں اور شاکر اتنی اور گھر کے فیملی ڈکٹر سے نظریں چرا کر مسکرتے۔ گھر میں واحد شخص ہی تھا جس سے شاکر اپنے دل کی بات کھل کر کر سکتا تھا۔

جیسے جیسے گاڑی مولوی صاحب کے گھر سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ویسے ویسے میرا دل جیسے دھڑکنا بھولا جا رہا تھا۔ جانے یہ کیسی کیفیت تھی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار شاعروں کے وہ سارے شعر اور قصیدے جو انہوں نے اپنے کسی محبوب کے گھر کے راستے کے بارے میں کہے تھے، یاد آئے۔ ایک یاد آنے لگے تھے، کچ تو یہ ہے کہ اگر اس وقت میں ذرا سی کوشش کرتا تو ایک آدھ شعر تو نہیں خود بھی کہہ ڈالتا۔ شاید ہم سب کے اندر کہیں نہ کہیں ایک شاعر چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ بس اُسے ذرا اک تحریک ملنے کی بات ہے۔ لفظ خود بخود ذہن و دل میں دارو ہونے لگتے ہیں۔ قافیے جڑنے لگتے ہیں، روٹیں خود بخود نکلتی جاتی ہیں اور شعر سر زد ہونے لگتے ہیں۔

گاڑی شہر کے پڑانے سے جسے میں واقع ایک چھوٹے سے محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ حسب معمول محلے کے میدان میں چند بچے گھر والوں سے نظر پیا کر سہ پہر کو اپنا گیند بلالے آئے تھے اور کرکٹ کا میچ جاری تھا۔ گاڑی کے داخلے پر سب بچوں کی توجہ گاڑی کے جانب مبذول ہو گئی۔ چند ایک بار ہوئیں درتیر ہوئیں کل ڈیڑھ نما بچوں نے کچھ دیر تک گاڑی کے ساتھ دوڑ لگائی۔ گاڑی کچھ مکانوں کی دو روئے نظاروں کے سامنے سے گزرتی ہوئی ہمیں کوسزنگی اور دوسری گلی میں کونے کے ایک مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ جانے کیوں میرا حال کچھ ایسا تھا کہ جیسے کالو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ کیسا عجیب سا احساس تھا۔ صرف ایک دیوار کی دوری پر وہ تازمین کہیں چل بھر رہی تھی۔ اور یہ جو سامنے لکڑی کا پڑانا سا دروازہ تھا، جانے کتنی بار اس کے کول ہاتھوں نے اس کے کواڑوں کو تھما، اور یہ گلی۔۔۔۔۔ یہ راستہ۔۔۔۔۔ جانے کتنے بار اس کے تارک قدم ان راہوں پر پڑے ہوں گے۔۔۔۔۔ اس فف میں اس کی باتیں۔۔۔۔۔ اس کی جتر جگ جیسے ہنسی جانے نکلتی بارگوشی ہوگی۔۔۔۔۔ یہ چھوٹا سا محلہ۔۔۔۔۔ یہ کچی بنیوں سے بنی گلی یک دم ہی مجھے دنیا کی سب سے حسین جگہ کیوں لگنے لگی تھی۔۔۔۔۔ کسی ایک اجنبی کی موجودگی آس پاس کے پچھلے نگاروں کو اس قدر تعین کیسے بنا سکتی ہے؟

میں نہیں خیالات میں گم تھا۔ سنی اور شاکر گاڑی سے اتر کر مولوی صاحب کے گھر کے اندر جا چکے تھے۔ ش کرنے مجھے بھی ترانے کی

درخواست کی تھی لیکن میں تو جیسے گاڑی میں ہی جم کر رہ گیا تھا۔ میری حالت اس وقت ایک ایسے سوانی کی سی تھی جو صدیوں سے ایک ہی در کے سامنے ہاتھ پھیلے کھڑا ہو۔۔۔ پروہ ذرا اس کے لیے بھی نہ کھلے۔۔۔

اچانک دھڑ سے لکڑی کا دروازہ کھلا اور اس میں سے آگے آگے بولکھائے ہوئے اور شہنائے سے موسیقی صاحب اور ان کے پیچھے پریشان شا کر چیزی سے باہر نکلے۔ میں بھی بڑبڑا سا گیا۔ مولوی صاحب نے آتے ہی شدت سے معذرت اور شرمندگی کا اظہار شروع کر دیا کہ یہ شا کر کی ناراضگی ہے کہ اس نے میری باہر گاڑی میں موجودگی سے انہیں آتے ہی مطلع نہیں کیا ورنہ وہ اتنی دیر مجھے گاڑی میں یوں بیٹھے رہنے کی زحمت بھی نہ دیتے۔ تو کیا مجھے باہر گاڑی میں بہت دیر ہوگئی تھی؟ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ میں ابھی چند لمحے پہلے ہی یہاں آیا تھا۔

مولوی صاحب کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلی اور وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے، یہ ایک چھوٹا لیکن بے حد صاف ستھرا مکان تھا۔ صحن کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا جس کے وسط میں ایک بڑا سا برگد کا درخت شاخیں پھیلائے کھڑا تھا۔ درخت کے ارد گرد پکا چوبہ سا بنادیا گیا تھا۔ درخت کی شاخوں سے ایک جھول بھی لٹکا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ گلابوں کی چھوٹی چھوٹی سی کیاریاں تھیں جن میں سیٹھے سے پھول اگائے گئے تھے۔ صحن کے سامنے ہی ایک لمبا سا برآمدہ تھا جسے لکڑی کی جافریوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ برآمدے کے پیچھے شاید گھروالوں کے رہائشی کمرے تھے، اور شاید وہی زنان خانہ بھی تھا۔ برآمدے کے آخری حصے میں لکڑی کی جالیوں (جافریوں) کی پارٹیشن میں ایک دروازہ کھلتا تھا۔ مولوی صاحب مجھے اسی طرف لیے بڑھ گئے۔ شاید یہی اس چھوٹے سے گھر کا مہمان خانہ یا بیٹھک بھی تھی۔ بیٹھک والے برآمدے کے حصے کو اندر سے بھی لکڑی کی جالی نما پارٹیشن سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ میں بے خود اور محروم سا مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ اندر سے سنی کے زور زور سے بونے اور بھنے کی آوازیں آرہی تھیں، انہی آوازوں میں ایک آدھ نسوانی لمبی اور باتوں کا جلتیج بھی شامل تھا۔ میری تو جیسے سانس ہی رکنے لگی تھیں۔ وہ مختصر سی بیٹھک یا ڈرائنگ روم گھروالوں کی نفاست کی آئینہ دار تھی۔ مختصر سا بڑا تا فرنیچر، سیٹھے سے کڑھے ہوئے پوش (کور) سے ڈھکا ہوا تھا۔ سامنے کارلس پر غائب کا دیوان اور چند دوسرے مشہور مصنفین کی کتابیں اور نقوش رسالے کے چند ایڈیشن سیٹھے سے سجے ہوئے تھے۔ لگتا تھا گھر کے کینوں کو ارد وادب سے خاص لگاؤ تھا۔ میرا ذہن پھر سے جھٹکنے لگا۔ جانے کتنی بار اس کی غزلی انگلیوں نے ان کتابوں کے ورق پلٹے ہوں گے؟ دن میں جانے کتنی بار وہ یہاں آتی ہوگی۔ اور کون جانے وہ گھنٹوں یہاں اسی جگہ بیٹھی ان کتابوں کی ورق گردانی کرتی ہوگی جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے لہجے میں اب بھی معذرت تھی۔

”میں نے یہ آپ نے بڑی زیادتی کر دی۔۔۔ پہلی مرتبہ اس غریب خانے پر تشریف لائے اور یوں دروازے پر ہی کھڑے رہے۔۔۔ یہ گھر آپ کے قابل تو نہیں لیکن۔۔۔“

میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹ دی۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو بس یونہی۔۔۔“ شا کر نے جلدی سے بات بتائی۔ ”حماد بابا کا خیال تھا کہ ہم دروازے سے ہی سامان دے کر لوٹ آئیں گے۔“ مولوی صاحب نے ناراضگی سے شا کر کی طرف دیکھا۔

”بھئی تم تو ہم سے کوئی بات نہ ہی کرو شا کر بھیا۔ پہلی مرتبہ صاحبزادے اس گھر تک آئیں اور ہم انہیں دروازے سے ہی لوٹا دیں۔ یہ

کہاں کی روایت ہے بھلا۔ "مولوی صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہمارے لیے کچھ کچھ جائیں۔ جانے یہ ہمارے طرز کی روایتی وضع داری ہم جیسے امیروں کی بڑی بڑی کوشیوں اور حویلیوں سے کہاں غائب ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے جانے اندر جا کر کیا کھسر پھسری کہ چند محو میں ہی باہر کی طرف بے نفعیت خانے سے مختلف اشتہا انگیز خوشبوؤں اور مہک کے ساتھ ساتھ چڑیوں کی ہلکی سی کلنگ اور برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے مولوی صاحب کو روکا۔

"آپ کوئی تکلف نہ کریں، ہم بتاتے ہی گھر سے نکل آئے ہیں وہاں سنی کی مہار پریشان ہوتی ہوں گی۔"

مولوی صاحب پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ "میاں غریب کی مہمان نوازی کیا اور اس کا تکلف کیا؟"

معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کی دوستی صاحب راویاں ہیں۔ کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ البتہ ان کے مرحوم بڑے بھائی کا ایک بیٹا تھا جو بچپن سے مولوی صاحب کے یہاں ہی پلا بڑھا تھا، عبداللہ صرف نام کا ہی عبداللہ نہ تھا۔ بلکہ اپنے اعمال سے بھی اس نے اپنے آپ کو مولوی عظیم کا متبع معنوں میں جانشین ثابت کیا تھا۔ وہ انہی کی تربیت کا نقش چانی تھا۔ مولوی صاحب جس مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ وہیں عبداللہ ہی ہمیشہ ان کی تکبیر دیتا تھا۔ بلکہ اب تو زیادہ تر مولوی صاحب کی طبیعت خراب رہنے کے باعث عبداللہ ہی محلے کی مسجد میں اذان دیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ مجھے آس پاس کہیں دکھائی نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اندر کے دروازے کی طرف سے ہلکی سی آہٹ ہوئی جیسے کوئی دروازے پر آ کر رکا ہو۔ مولوی صاحب جلدی سے اندر کر دروازے سے اندر چلے گئے۔ کچھ چوڑیاں کھٹکنے کی آواز اور دبی سی چند سرگوشیاں سنائی دیں اور مولوی صاحب ایک ایک کر کے تین چار خزانہ اندر اٹھائے۔ میں اور شا کر بس "رے، رے" ہی کرتے رہ گئے۔ چند منٹوں میں ہی ان لوگوں نے کیا کچھ اہتمام کر ڈالا تھا۔ شام کی چائے کے ساتھ جو کچھ بھی لوازمات ہو سکتے تھے۔ وہ سب کے سب حاضر تھے۔ گھر کا بنا ہوا انڈیا کیک، سو سے، اٹلی کی چٹنی، زعفران سے جلی ہلائی، گاجر کا حلوہ اخروٹ سے بنی ہوئی مٹھائی اور چائے کیا کیا۔۔۔؟

میرے ساتھ بچپن سے ہی ایک عجیب سا مسئلہ تھا، میں کسی کے سامنے کچھ کھاتے ہوئے بے حد شرم محسوس کرتا تھا۔ اور خاص طور پر اگر کوئی اجنبی سامنے بیٹھا ہو تو مجھ سے کچھ لگنا محال ہو جاتا تھا۔ جانے میرے دل میں بچپن سے یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ کھاتے ہوئے انسان کچھ معزز دکھائی نہ دیتا ہوگا۔ وہی مسئلہ اس وقت بھی درپیش تھا لیکن مولوی صاحب کے پُر غصہ اصرار کے سامنے میرے اندر کی اس ازلی کمزوری کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ مجھے مجبوراً سب کچھ توڑا توڑا کھانا پڑا۔ اور کچ یہ ہے کہ یہ جس کے ہاتھ کا بھی بھر تھا۔ لا جواب تھا۔ میری زبان اس ڈنکے کو کبھی نہیں بھلا پائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب گھر ہی کا بنا ہوا تھا کیونکہ اتنی جلدی بازار سے یہ سب کچھ منگوانا اور یہ سب اہتمام ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ کون ہو سکتا تھا۔۔۔؟۔۔۔ گھر میں تین عورتیں موجود تھیں۔ مولوی صاحب کی بیوی اور ان کی دو بیٹیاں۔۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور اس کے ہاتھ کا جو دھکی شامل ہوگا ان سب لوازمات میں۔۔۔۔۔ یہی سوچ کر میں ہر چیز اٹھ کر چمکتا رہا۔۔۔۔۔ اور پھر شا کر نے جیسے میرے دل کی آواز کو رہان دے دی۔ وہ مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب کیسی طبیعت ہے بھابھی کی مولوی صاحب۔۔۔۔۔ کہ کرادو کچھ کم ہوا یا نہیں۔"

مولوی صاحب پر بیٹائی سے بولے، "کہاں شا کر میاں۔۔۔۔۔ بڑھاپا خود ہی سب سے بڑی بیماری ہوتا ہے۔ اوپر سے یہ نیت نئی بیماریاں۔۔۔۔۔ اب تو زیادہ تر آرمی کرتی ہیں۔ گھر کا سارا کام کان بھی بچیوں نے ہی سنبھال رکھا ہے۔"

تو گویا میرا اندازہ درست تھا۔ یہ سب کچھ اسی عشوہ طراز کے ہاتھوں اور نگرانی کا کمال فن تھا۔

چائے پینے کے بعد شکر نے میری طرف سے اجازت چاہی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں حسب معمول اور حسب عادت ان کی مہمان نوازی سے اکتا چکا ہوں گا۔ شکر کے لیے تو یہ بات بھی باعث حیرت ہوگی، کہ میں اتنی دیر سے جتنا کچھ کہے یہاں کیسے بیٹھا رہ گیا۔ جب کہ مجھے اس وقت یوں لگا کہ جیسے ابھی چند لمحے پہلے ہی تو ہم یہاں آئے تھے۔ ابھی تو میں نے کھل کر اس گھر کی فضا میں سانس بھی نہیں لیا تھا۔ آخر شکر کو کس بات کی جدی تھی؟ کچھ دیر تو اور بیٹھا رہتا۔ بہر حال اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ شکر جانے کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ مجبور مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مولوی صاحب ہماری آمد پر نہایت ممنون تھے۔ نہ شکر یہ ادا کرتے کرتے ان کی آنکھیں ہی بھر آئیں۔ میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور انہیں احساس درایا کہ وہ ہم سب کے لیے کس قدر قابل احترام ہیں۔

ہم سب کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئے۔ میرا دل جیسے کسی نے مضمیوں میں پاؤں نہ بچھنی یا ہو۔ ہم واپس جا رہے تھے۔ جانے بھر کبھی دوبارہ یہاں آنا ہو یا نہ ہو۔ کاش نہیں اس کی ایک جھلک دیکھ پاتا، کاش۔۔۔۔۔

اچانک چلتے چلتے شکر صحن میں رک گیا اور اس نے سنی کو آواز دی جو ابھی تک زنان خانے میں ہی تھا۔ بے اختیاری طور پر میری اور مولوی صاحب کی نگاہ بھی اسی طرف ٹھہر گئی جہاں سے سنی کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم سب ہی صحن میں رک گئے تھے۔ اور پھر اچانک ہی سنی دوڑتا ہوا اندر برآمدے سے برآمد ہوا۔ چند لمحے کو کھڑکی کی جالیوں کے پرے دروازے پر ڈلی ہوئی ایک چمن ڈرور کو ہٹائی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میری تمام زندگی کا مقصد ہی آج پورا ہو گیا ہو۔ ہاں۔۔۔ وہ وہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے مسکراتے ہوئے سنی کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چھوٹی بہن اس سے چپکی کھڑکی تھی۔ اور وہ بھی سنی کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ یہ اوپر تلے والی بہنوں کا رشتہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ دونوں کے بس جسم ہی علیحدہ ہیں، ورنہ دونوں کا ذہن اور دل ایک ہی ہے۔ ایک سا سوچنا، ایک سا بولنا، ایک سا پہننا۔۔۔۔۔ میں نے تو ایسی بہنیں بھی دیکھیں ہیں جو بیک وقت ایک ہی ہستی کی محبت میں جلتا بھی رہی ہیں۔

اس نازنین کا یہ جلوہ بھی بس چند ساعتوں کا ہی تھا۔ جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ ہم سب صحن میں کھڑے سنی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اسی ساعت قدرت مجھ پر شانہ اپنی مہربانی لانے پر تھی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی اس کی نگاہ میری بے قرار لگا ہوں سے ٹکرائی گئی۔ ایک لمحے میں چند چنگاریاں اٹھیں اور میرے پہلے سے تار تار ہوئے دامن کو جلا کر خاکستر کر گئیں۔ کیا کیا تھا اس ایک نظر میں۔۔۔۔۔؟ بیگانگی، خوف، شرم و حیا، اپنی لہر وانی کی جھٹکلا ہٹ۔۔۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔۔

دنیا میں شاعر اور ادیب بہت سے رشتوں کو بیان کرتے سنے گئے ہیں۔ لیکن نظر سے نظر کے رشتے تو اس وقت جتنی شدت سے میں بیان کر سکتا تھا یہ میں ہی جانتا تھا۔ زہ نے بھر کی بے چینیوں، کٹک اور بے بسی میرے اس ایک لمبے نظر کے رشتے میں متغیر تھی۔

ہم اس کے گھر سے تو باہر نکل آئے لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں اپنی روح وہیں اس چمن کے پیچھے کہیں چھوڑ آیا ہوں۔ سنی نہ جانے راستے بھر مجھے اور شکر کو کون کون سے قصے سناتا رہا۔ لیکن میں سوائے ہوں ہاں کے اور کچھ جواب نہ دے پایا۔ ہم نے گھر والوں کے سامنے مولوی صاحب کے یہاں جانے کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ زندگی بھر سے اپنی دگر پر روانہ ہو گئی لیکن شاید میری زندگی کا وہ یہی دن سے کھل بد گیا تھا جس



دن ہم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔

میں گھنٹوں ایک ہی جگہ گم سم بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن مجھے پہروں کے ڈھلنے کا اک ذرا احساس بھی نہ ہوتا۔ دوستوں کی شکست اور محفل چھوٹ گئی تھی اور مجھے سب کچھ ایک دم ہی بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ میرے اندر کی اس تبدیلی کو سب گھروالوں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ امی ایسے موقعوں پر فوراً ایوبیتھی، پھر ہومیو پیتھی اور پھر روحانی علاج کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ پاپا نے حسب معمول ایک لمبی سی ہنگامی بھری، اور مجھے آب و ہوا بدینے کا مشورہ دے کر کچر سے اپنا پاپہ پینے میں مشغول ہو گئے۔ عبرت نہ بھائی نے فوراً امی کو مشورہ دیا کہ ان کی چھوٹی بہن کا رشتہ میرے لیے مانگ لیا جائے کیونکہ میری تنہائی دور کرنے کا یہ واحد اور بہترین حل وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ امی کو دے چکی تھیں۔

میرے ساتھ بچپن سے ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا۔ مسئلہ کیا تھا اک عجب معرہ ہی تھا۔ بچپن میں، میں مینے کی ہر پہلی جمعرات کو شدید بخار میں جھل جاتا تھا۔ دنیا کے علاج کروائے گئے، زمانے بھر کے ڈاکٹر ز مجھے دیکھ گئے پر یہ بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ پھر میری چینیٹی خالہ جو دوسرے شہر میں رہتی تھیں اور امی سے چھوٹی تھیں، انہوں نے امی کو کسی نظر اتارنے والے عامل سے ملنے کا کہا۔ ہمارے ماؤن گھر میں بھدا ایک دقیا نوی باتوں کی محجاش ہی کہاں تھی۔ کشتربا جب کو فوراً اجلاں آ گیا اور امی کو ٹھیک ٹھاک لیکچر سننے کو مل گیا۔ لیکن پھر خالہ خود ہی ہمارے گھر آدھمکیں اور ہا سے چھپ کر وہ مجھے ورائی کو کسی بزرگ کے پاس لے گئیں جنہوں نے بغور میرا معائنہ کیا اور امی کو بتایا کہ میں روحانی طور پر اندر سے بے حد کمزور ہوں لہذا مجھے ساری زندگی نظر بد کا خطرہ لاحق رہے گا۔ انہوں نے مجھ پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور ایک کالا دھاگا مجھے گلے میں پہننے کے لیے دیا۔ ساتھ ہی امی کو تاکید کی کہ ہر مینے کی پہلی جمعرات کو چاہے خود یا چاہے کسی اور کے ذریعے کچھ صدقہ اور نذر و نیاز وغیرہ دے دیا کریں۔ خود ان بزرگ نے کوئی نذرانہ قبول نہیں کیا۔ ایک آدھ ماہ تک تو امی کو یہ سب یاد رہا، پھر انہوں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے شاکر کی یہ بی بیونی لگا دی کہ وہ کچھ ہانٹ دیا کرے۔ شاکر اب تک یہ بی بیونی بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ امی شاید میرے بچپن کی وہ بیماری بھول بھال چکی تھیں۔ البتہ مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد میری جو حالت رہنے لگی تھی اس نے انہیں میرے بچپن کی بیماری کی یاد دلادی تھی۔ فوراً خالہ سے رابطہ کیا گیا اور خالہ نے فوراً امی فون پر ہی تین چار تیر بہدف نئے تجویز کر دیے۔ لیکن میرے دل کی حالت کوئی نہیں جانتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری زندگی کی ہر خوشی، ہر حاصل کا محو صرف اور صرف ”ایمان“ بنتی جا رہی تھی۔

چمک رہا ہے بدن پر لہ سے میرا من  
ہماری دیکھ تو اب غالب رفو کیا ہے

(غالب)

☆☆☆

## یہودی

ایک پرائی کہوت ہے "جو یاری کرے گا، وہ شب بیداری بھی کرے گا۔" سولندن میں میری یہ دوسری رات بھی شب بیداری کی نظر ہوئی۔ صبح کا مران کسی ہڑتال کی وجہ سے فارغ تھا، لہذا اس نے مجھے یونیورسٹی کے گیٹ پر ڈراپ کر دیا۔ نوٹس بورڈ سے پتہ چلا کہ آج سر آئزک ہینڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ نئے آنے والے اسٹوڈنٹس سے ہال نمبر تین میں بذریعہ لکچر خطاب کریں گے۔ سو سبھی نئے آنے والوں کا رخ ہال نمبر تین کی طرف ہی تھا۔

بچپن میں ایک فی دی بیریل ہم سب بچے بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ نام تھا "آخری چٹان" اس میں ایک یہودی کریکٹر کا نام ڈیوڈ تھا۔ بچپن سے میرے دل میں یہودی شخص کی یہی ایک شبیہ چھپ سی گئی تھی۔ جب کبھی کوئی کہیں سی یہودی کی بات کرتا تو وہی بچپن سے دل میں نقش ہوئی صورت لگا ہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ جس دن سے مجھے پتہ چلا تھا کہ ہمارا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بھی ایک یہودی تھا تب سے اس کی بات کرتے وقت ایک مخصوص خلیے کا یہودی میری نظروں کے سامنے آ جاتا۔ دبلا پتلا سا، چہرے پر یہودیوں کی خاص مٹا بہت والی دھڑی، سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، لمبا سا چہرہ، تیز تیز آنکھیں گھمانے والا اور بہت تول کر بولنے والا صبیح صبح تھا۔۔۔۔۔

لیکن سر آئزک کو دیکھنے کے بعد میرے خیالات کو بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت غمیں ضرور لگی۔ یہ تو ایک ڈارن طے کا شخص تھا۔ عمر پچاس سے اوپر، تن پر بہترین اور قیمتی سوٹ، آنکھوں پر نظر کا باریک سا چشمہ، بے حد نرم گفتار سا شخص۔ اس دن میرے ذہن میں سے میرے بچپن والی یہودی کی شبیہ نکل گئی اور اس کی جگہ اس نئی تصویر نے لے لی۔ البتہ ایک مماثلت ضرور تھی کہ سر آئزک کے ہاتھ میں بھی ایک چھوٹی سی صبیح موجود تھی جسے وہ شائد اپنی عادت کے مطابق کبھی ہاتھ میں گھماتے اور کبھی جیب میں ڈال رہے تھے۔ معاشیات کی اس کلاس میں تقریباً پینتیس کے قریب طالب علم تھے جن میں لڑکوں سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ سر آئزک کے ابتدائی لیکن بڑے اثر سے لکچر کا آغاز ہوا۔ شروع میں انہوں نے اپنا تعارف کر دیا اور پھر معاشیات سے متعلق چند بنیادی باتیں بتائیں۔ کچھ یونیورسٹی کے ڈسپلن کے بارے میں بیان کیا اور آخر میں ہم سب سے تعارف کر دانے کو کہا۔ مجھے رول نمبر 17 ملے ہوا تھا اور اسی دن مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اس پوری کلاس میں ایک میں ہی اکیلا مسلمان طالب علم ہوں۔ میں نے اپنی باری پرائیڈ کر جب پنا نام پکارا اور مذہب اسلام بتایا تو مجھے محسوس ہوا کہ کچھ دیر کے لیے تمام کلاس پر تھانا سا چھ گیا ہے۔ شائد یہ میرا وہم ہی ہو لیکن پھر سر آئزک نے مجھ سے میری کچھلی تعلیم اور ڈگریوں وغیرہ کا پوچھ کر سلسلہ آگے بڑھا دیا۔ آخر اسٹوڈنٹس کے تعارف کا سلسلہ ختم ہوا اور سر آئزک نے ان مختصر جملوں کے ساتھ اپنا پہلا لکچر ختم کیا۔

"مائی ڈیر اسٹوڈنٹس۔۔۔۔۔ ازل سے لے کر اب تک۔۔۔۔۔ اور پھر شائد اب تک ہمیشہ دنیا کے اعلیٰ ترین نظریات کو اوسط درجے کے

ذہنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یاد رکھیے۔۔۔ جس نے کبھی غلطی نہیں کی۔۔۔ اس نے کبھی کچھ نیا کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ہوگی۔۔۔ اس لیے نظریہ بنانے اور نیا نظریہ پیش کرنے میں کبھی نکل سے کام نہ لیجے گا، ہمیں غلطی اور اوسط درجے کے ان ذہنوں کی مخالفت کے ذرے سے بہت آگے نکلنا ہوگا۔ میں ایک بار پھر آپ سب کو اس ادارے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔۔۔ کل سے ہم باقاعدہ کلاسز کا آغاز کریں گے، گندوے۔۔۔

سر آئزک اسٹینج سے اتر کر چلے گئے۔ ساری کلاس نے ڈیک بجا کر ان کی تقریر اور خیالات کا خیر مقدم کیا۔ سچ یہ ہے کہ سر آئزک کی باتوں نے مجھے بھی خاص متاثر کیا تھا۔ مجھے کامران کی ان سے بچ کر رہنے کی بات یاد آگئی اور میرے لبوں پر خود بخود ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ کامران نے دوپہر کو دہلی پر مجھے پک کرنے کا کہا تھا اور ابھی اس کے آنے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔ سوہاں سے باہر نکل کر میں نے دھڑ دھڑ دیکھا کہ کس طرف کو نکلا جائے۔ پھر میری نظر دُور پڑے ان پتھر پر گئی جو یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی تھیں (جو کہ دیئے ٹیڑھی ہی ایک شاخ تھی) کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بچائے گئے تھے۔ اس طرف آبی پرندوں کے غول بھی موجود تھے، جواز تے ہوئے آتے دریا کنارے بیٹھے اسٹاف اور دیگر طالب علموں کے ہاتھوں بھنگی گئی اپنی مخصوص خوراک کو چمکتے اور پھراڑ جاتے۔ مجھے بھی یہی گوشہ تنہائی وقت گزاری کے لیے بہتر لگا اور میں انہی لکڑی کے تنگیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا اور سامنے بچتے پانی اور ان پرندوں کی آہٹ میں ہوتی اٹھکیلیوں دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک بوڑھا شخص سر پر ہیٹ پہنے، لمبے سے اور کوٹ اور مغل میں ملیں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پرندوں کو ڈالنے والے دانے کا ایک بڑا سا کاغذی ٹھافہ بکڑا ہوا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر میں ماضیوں بھر بھر کے دانے پرندوں کی طرف اچھال کر وہ ٹھافہ خالی کر دیا اور اسے قریب بنے ہوئے کوڑے دان میں ڈال کر وہ جانے کے لیے چلا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔

”جوزف۔۔۔ کیا تم نئے آنے والے طلبہ میں سے ایک ہو۔“ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھم لیا۔ ”حمدا۔۔۔ فرسٹ سمسٹر۔۔۔“

معشیت۔۔۔ اس نے گرجوٹی سے مجھ سے ہاتھ ملا لیا۔ اور مسکرا کر بولا۔۔۔

”اوہ آئی سی۔۔۔ لیکن ایک من۔ تم یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہو۔۔۔ کیا سینٹر اسٹوڈنٹس کی ریٹنگ (Rating) سے ڈرتے ہو۔“

میں بھی مسکرا دیا۔ ”نہیں۔۔۔ مجھے ڈر صرف اپنے آپ سے لگتا ہے۔ لیکن اس وقت میں خود اپنے آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس طرف آ بیٹھا۔“ جوزف نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

”خوب۔۔۔ اپنے آپ سے باتیں۔۔۔ بھئی اس ملاقات کی طرف تو کبھی اپنا دھیان ہی نہیں گیا، خود سے خود کی ملاقات۔۔۔“

میں نے کھسک کر اس کے لیے تختے پر جگہ خالی کی، جوزف بیٹھ گیا۔ میں نے اسے جواب دیا۔ ”اس ملاقات کے لیے کسی خاص توجہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ ان عمر بھر میں اپنے آپ ہی سے سب سے زیادہ باتیں کرتا ہے اور اپنے آپ کو ہی سب سے زیادہ جھیلتا ہے۔ شاید کسی اور میں اسے اس قدر جھینے کی تاب بھی نہیں ہوتی۔ انسان خود ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ باقی اس کی اپنی ذات سے باہر ہونے والی کبھی دوستیں و کبھی دشمنیاں عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔“

جوزف غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا "خود سے بہت ناراض لگتے ہو۔ کتنی بلا جو تو نہیں سکتی۔ لگتا ہے کوئی بھٹی تمہارے اندر لگ رہی ہے۔" میں نے ہاتھوں کا رخ کسی اور طرف موڑنا چاہا۔ "لیکن آپ۔۔۔ آپ نے نام کے علاوہ اپنا کوئی دوسرا تعارف نہیں کر دیا۔" جوزف نے گہری سی سانس لی۔ "نام تو تمہیں بتائی چکا ہوں۔ یہیں اسی یونیورسٹی میں فائن آرٹس فیلو شپسٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوں۔" میں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ "معاف کیجئے۔۔۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ آپ کا انداز دراصل اساتذہ وال نہیں ہے ورنہ میں اتنی بے تکلفی۔۔۔"

جوزف نے ہنس کر میری بات کاٹ دی۔ "اس معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل میں جان بوجھ کر یہاں کوئی جوانوں کو پہلی دفعہ اپنا پورا تعارف نہیں کرواتا۔ یہاں کرنے سے وہ خوب پھٹا ہوا جاتے ہیں اور میں ان میں گھلنے ملنے کا موقع کھودتا ہوں۔ میں یہی چاہوں گا کہ ہم ہمیشہ اسی بے تکلفی سے ملتے اور بات کرتے رہیں۔ تم ایک مختلف نوعوان ہو۔ تم سے ملنا واقعی ایک انوکھا تجربہ ہے میرے لیے۔" جوزف جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"میری کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے بہت جلد ہماری ایک دوسری ملاقات ہوگی جو اس جیسی کئی ملاقاتوں کا ایک پیش خیمہ ثابت ہوگی۔" جوزف گر جوتی سے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ کچھ دیر میں کامران کے آنے کا بھی وقت ہو گیا۔ میں بھی سامنے بے شفاف پانی اور پرندوں سے رخصت ہو کر یونیورسٹی کی لمبی لمبی راہداریوں سے ہوتا ہوا باہر گیسٹ پر آ گیا۔ باہر کامران کی گاڑی پیسے سے موجود تھی۔ میں نے کامران کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، موصوف کچھ دور ایک پاپ کاروں کی مشین کے قریب کھڑی دونو جوان میسوں کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھے اور انہیں یقین دہا رہے تھے کہ بہت جلد ان کی زندگی میں ایک خوبوایشیائی نوعوان آنے والا ہے جس کے آتے ہی ان کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں آجائیں گی۔ مجھے کامران کی اس صلاحیت پر ہمیشہ سے ہی رشک آتا تھا۔ مجھے کسی اجنبی لڑکی تو کیا، کسی اجنبی مرد سے بھی یہی مرتبہ بات کرتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی تاہم وہ اجنبی خود ہی بات کرنے میں چبل نہ کر دے۔ جب کہ کامران راہ چلتے اٹھتے چلتے، سوتے کسی بھی وقت کسی کو بھی روک کر گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ شاید میرے اندر ٹھکرائے جانے کا ڈر ہمیشہ سے موجود رہا تھا اور کامران ایسے کسی خوف سے بالکل نا آشنا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے میری طرف ہاتھ ہلایا۔ ان گوری میسوں کو اپنا کارڈ دیا۔ ان کے فون نمبرز یہی ور مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھ آیا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں نے کامران کو گھورا، "تم کبھی نہیں سوچو گے۔۔۔ ہے نا۔"

کامران ہنس، "ارے یار پور ہو رہا تھا پندرہ منٹ سے یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑا۔ سوچا ان کا ہاتھ ہی دیکھوں۔"

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں نے تمہاری پچھلی سات لسٹوں میں کسی دست شناس کا تذکرہ تک نہیں سنا۔"

کامران کے ہونٹوں پر اب بھی وہی شریک مسکراہٹ تھی۔ "جانے دے تا یا۔۔۔ یہ بتاؤ کونج کا کپڑا پر وگرم ہے۔ میرے پیٹ میں تو چھپے دوڑ رہے ہیں۔" میں نے سیٹ بیلٹ کچھ ڈھیلی کی۔ "ہوں۔۔۔۔۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ کہیں بھی چلو۔"

کامران نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ "پکاؤ کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ایک نیارینٹورنٹ کھلا ہے۔ کافی تعریف سنی ہے۔"

ہماری گاڑی لندن کی دو روہ اور چار روہی بڑی بڑی شفاف سڑکوں سے ہوتی ہوئی بک بین (Big Ben) کے سامنے سے دائیں کوڑھ گئی۔ لندن

کے مشہور نڈ جوں والے پتل سے ہوتے ہوئے ہم پکاڈلی کی طرف مز گئے۔ مجھے لندن کی یہ چوڑی چوڑی سی سڑکیں ہمیشہ سے بہت بھی لگتی تھیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انٹارویں کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں یورپین حکام نے عوام کی بھاؤتوں و ریلووں کو روکنے کی حکمت عملی کے طور پر ان تمام شاہراہوں کو چوڑا کر دیا تھا تاکہ حکومت اور فوج کا عملہ آسانی کے ساتھ ہجوم کو ایک ہی جگہ قابو میں رکھ سکے۔

پکاڈلی سرکس سے بائیں مڑتے ہی دورویہ درختوں کی لمبی سی قطار سے ڈھکی ایک خاموش اور سنسان سی سڑک شروع ہو گئی۔ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چوڑی سی نالی میں گھسکتی ہوئی برف کا پانی ایک انجانے سے نر کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں اور کامران اس سڑک پر مڑتے ہی ایک دم سے خاموش ہو گئے۔ جیسے قدرت کی اس بے پناہ خوبصورتی نے ہماری زبانیں ہی سلب کر لی ہوں۔ سڑک پر درختوں سے گرے ہوئے سرخ اور زرد پتوں کی چادری چھپی ہوئی تھی۔ جو زور کی ہوا چلنے سے اس ہینگی ہوئی سڑک پر کچھ اس طرح سے لہراتے تھے جیسے کوئی ریشمی کپڑا ہچھے کھینچا ہو۔ چٹان بیٹھ ہو، جوانی گھڑی سے رنگ برنگے نئے تھان نکال کر ہوا میں ہرا رہا ہو۔

کبھی کبھی ہم چند پلوں میں ہی اپنی ساری زندگی بھر سے جی لیتے ہیں، درختوں اور ان سے خزاں رسیدہ پتوں سے گھری ہوئی اس سڑک پر ہم دونوں کا یہ سڑ بھی زندگی کے انہی چند پلوں میں سے ایک تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہم یہ بھول ہی گئے تھے کہ ہم اس سڑک کے اختتام پر بنے ایک نئے ریسٹورانٹ میں لانچ کرنے کے لیے نکلے تھے۔

بالآخر دنیا کی ہر اچھی چیز کی طرح اس سڑک کا بھی اختتام ہو ہی گیا۔ ہم نے لکڑی کے بنے ہوئے اس چھوٹے سے خوبصورت ریسٹورانٹ میں اپنی پسند کا لانچ کیا۔ کامران مجھ سے یوندر دلی کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں نے اسے سڑا سڑک کے لپکھ اور اپنے تعارف پر گلاس روم کی خاموشی کے بارے میں بتایا۔ کامران ایسے موقعوں پر بالکل چنڈ ہو جاتا تھا۔ اسے اپنے غصے پر بالکل کنٹرول نہیں رہتا تھا۔ اس نے زور سے گلاس بیز پر مارا۔۔۔۔۔۔ یہ سارے گورے کہیں کے۔۔۔۔۔۔ ان کی تو۔۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے قابو کیا۔ کامران کا موڈ اب بھی خراب تھا۔ میں نے اسے موڈ میں لانے کے لیے ایک لطیفہ سنایا۔۔۔۔۔۔ "ایک گوری میم پر کسی کتے نے کانٹے کے لیے حملہ کر دیا۔ پاس سے گزرتے ایک شخص نے جان پر کھیل کر اس کتے سے میم کی جان بچائی۔ اگلے دن کے اخباروں میں کتے سے میم کو بچاتے ہوئے اس شخص کی تصویر چھپی اور ہیڈ لائن لگی۔" انگلش بیرو نے عورت کو کتے سے بچا لیا۔"

اس شخص نے اخبار کے دفتر فون کر کے کہا، "میں اب گری نہیں ہوں۔" دوسرے دن اخبار نے پھر سرفی لگائی "غیر ملکی بیرو نے عورت کو جان پر کھیل کر کتے سے بچا لیا۔" اس شخص نے پھر اخبار کے دفتر فون کیا اور بتایا کہ میں غریبی نہیں، "پاکستانی اور مسلمان ہوں۔"

تیسرے دن اخبار نے اسی تصویر کے نیچے یہ سرفی لگائی، "خطرناک دہشت گرد نے پالتو کتے پر حملہ کر دیا۔۔۔۔۔۔" کچھ دیر تک تو کامران حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر ہم دونوں کے منہ سے بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ وہ چھوٹا سا ریسٹورانٹ ہمارے قہقہوں سے گونج رہا تھا اور آس پاس کے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆



## گھائل

بچپن میں جب کبھی مجھے کھیتے ہوئے دوڑ بھاگ میں کوئی چوٹ لگ جاتی تھی تو میں کبھی دوسروں کے سامنے نہیں روتا تھا نہ شدید سے شدید درد میں کبھی میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ لوگوں کے سامنے میرے آنسو نہ نکلیں۔ ایسی صورت میں میں فوراً کسی گوشہ تنہائی کی طرف بھاگتا اور وہاں دل کھول کر روتا۔ دراصل مجھے بچپن سے ہی سب کے سامنے رونا بہت معیوب لگتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ہم دوسروں کے سامنے رو کر اپنی عزت ان کی نظروں میں کھود دیتے ہیں۔

مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد بھی میری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ رونا چاہتا تھا لیکن رونے کے لیے جگہ میسر نہ تھی۔ عجیب ہے کسی تھی۔

مولوی صاحب صحت یاب ہونے کے بعد دوبارہ سے سنی کو درس دینے کے لیے آنے لگے تھے۔ ان دنوں میں کسی بھی بہانے سے سنی اور مولوی صاحب کے آس پاس ہی چکر کا توڑ جاتا تھا۔ اس امید میں کہ شاید سنی ان سے ایمان کی کوئی بات کرے۔۔۔ یا پھر مولوی صاحب ہی اپنے گھر کا کوئی تذکرہ چھیڑ دیں۔ لیکن میری یہ امید بھی ہمیشہ فوتی ہی رہی۔

پھر میرے جنوں نے ایک اور روپ دکھارا۔ میں مولوی صاحب کے آنے کے انتظار میں رہتا اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتے میں گاڑی نکال کر ان کے محلے کے گیٹ کے سامنے اور کبھی کبھار تو بالکل ہی ان کی گلی کے پاس لے جا کر گاڑی لگا دیتا اور مولوی صاحب کے واپسی تک گاڑی میں ہی بیٹھا ٹکٹکی لگائے اس نازنین کی راہ نکلتا رہتا۔ اس امید پر کہ کبھی نہ کبھی تو وہ گھر سے باہر نکلے گی۔ لیکن یہ حسرت بھی ہمیشہ ناکام ہی رہی۔ میں نے کبھی کسی کو اس گھر سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ ہاں البتہ آس پاس سے گزرتے محلے کے کئیں میری گاڑی سے اچھی طرح سے واقف ہو چکے تھے۔ البتہ ان میں سے کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ مولوی صاحب کے گھر کی مرتبہ شا کر کو ایسی بڑی گاڑیوں میں آتا جا تا دیکھ چکے تھے۔ لہذا انہوں نے اسے بھی کچھ اسی طرح سے تعبیر کیا ہوگا۔ البتہ یہ خبریت رہی کہ ان میں سے کسی نے کبھی مولوی صاحب سے تذکرہ نہ کیا۔ ورنہ میرے لیے جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا۔ ون یونی گزرتے جا رہے تھے اور میرا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر جیسے قدرت کو مجھ پر رحم آئی گیا۔ ایک ایسی ہی گرم سہ پہر کو جب مولوی صاحب سنی کو درس دے رہے تھے۔ شا کر انہیں ڈھونڈتا ہوا اسی گول کمرے کی طرف آ نکلا جہاں میں بھی یونی بلا وجہ بیٹھا کب سے رسالے کے ایک ہی صفحے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ شا کر نے آتے ہی مولوی صاحب کو یہ معرہ سنایا کہ اس کی بڑی بیٹی کی منگنی طے ہو گئی ہے اور اگلے چھبیس کی سہ پہر مولوی صاحب بیع خاندان کے اس کے گھر ملے گا۔ مولوی صاحب نے منگنی طے ہونے پر شا کر کو بے حد مبارکباد دی اور خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن انہوں نے شا کر سے معذرت کی کہ جیسے کے دن کا تو وہ پہلے ہی کسی تبلیغی جماعت سے وعدہ کر چکے ہیں کہ ان کے ساتھ علاقے

کے گشت پر چلیں گے اور اب اس وعدے کو ٹالنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ البتہ انہوں نے یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ اپنے بھتیجے عبداللہ کے ساتھ باقی گھر والوں کو ملنگی کی تقریب میں ضرور بھیج دیں گے۔ مجھے یوں لگا جیسے برسوں کی ویران عیاں یا بامیں پھرتے پھرتے اچانک کوئی ٹھٹھان دور سے مجھے نظر آ گیا ہو۔ میں جانتا تھا کہ شا کر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے اس امداد زدہ گھر میں سے کوئی بھی اس کی اس خوشی میں شریک ہونے نہیں آئے گا، ہم سب کو دعوت ضرور دے گا۔ شاید قدرت نے مجھے اس کی ایک جھلک دکھانے کے لیے ہی یہ سب انتظام کیا ہو اور پھر ہوا بھی یونہی۔ بابا نے حسب معمول ایک مہاسا ہنگارا بھرا اور جیب سے پرس نکال کر چند بڑے نوٹ شا کر کے حوالے کر دیے۔

”میری طرف سے بیٹی کے لیے کچھ لے لیتا۔“

امی نے بھی گھر میں کام کرنے والیوں کو پُرانے صندوق اور اناریاں کھنگالنے کا کہا اور کپڑوں اور پُرانے زیورات کی ایک ٹھنڈی شا کر کے جو لے کر دی گئی، شا کرنے سب کی طرف سے مایوس ہو کر میری طرف دیکھیں۔ میں نے اسے تسلیم کر دی۔

”نہیں ضرور آ جاؤں گا۔ وعدہ رہا۔“

ہا کے چہرے پر ناگوار کی کے تاثرات ابھرے، جوان کے پائپ کے دھوئیں کے پیچھے کھومنے۔ امی اور بھابھی نے بھی ناک سُور چڑھائی لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس مرتبہ شا کر کی خوشی میں شرکت کرنے میں میری اپنی شدید غرض بھی شامل تھی، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر بات ایمن کی ایک جھلک کی نہ بھی ہوتی تو میں ضرور شا کر کے گھر جاتا۔ اس کا دور میرا رشتہ نوکر اور مالک سے بہت بڑھ کر تھا اور تمام گھر والے بھی بچپن سے میری شا کر سے اس انسیت سے اچھی طرح واقف تھے۔

شا کر بہت پہلے سووی صاحب کے اس چھوٹے سے محلے میں ہی رہتا تھا۔ اُسے بہت چھوٹی عمر میں دادا جان نے گھر کی ذرا بخوری پر رکھ لیا تھا۔ ہا کی شادی بھی اس کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ بعد میں کچھ سالوں کے بعد شا کر کی بھی شادی ہو گئی تو دادا نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے بچکے کے پیچھے بنے سردنٹ کو رٹ رٹ میں رہنے کی جگہ دے دی۔ سردنٹ کو رٹ رٹ کیا تھے اچھے خاصے بڑے مکان تھے جو ہر پُرانی حویلی کے بچھوڑے بنے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں دادا جان کے ہاں ان کے گاؤں کے رشتے داروں کا بہت آنا جاتا تھا۔ سوانہوں نے کچھلے حصے میں یہ تین چار کو رٹ رٹ ڈھاپے تھے۔ دادا کی وفات کے بعد بابا نے اپنی کسٹری کے تقاضوں کے مطابق اس جدید علاقے میں یہ کونجی خزانہ تھی۔ البتہ ہماری پُرانی حویلی شہر کے مضافات میں اب بھی موجود تھی۔ شا کر اور اس کا خاندان ہی اب بھی اس حویلی کی رکھوائی کرتا تھا اور ان کی رہائش اب بھی وہیں تھی۔ شا کر کی اوداد میں دو بیٹے اور ایک چھوٹی بیٹی شامل تھی۔ دونوں بیٹے محنت مزدوری کے سلسلے میں شہر سے زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔ بابا کی خاص دعوتیں اور اجلاس وغیرہ اب بھی اسی حویلی میں ہی منعقد کیے جاتے تھے۔ بلکہ آج کل تو بابا اس پُرانی حویلی کو اپنا کمپ آفس بنانے کا سوچ رہے تھے۔

شا کر تو اپنی بیٹی کی ملنگی کا نینو تادے کر واپس چلا گیا تھا لیکن اب میرے لیے ایک ایک ہل کا ٹاکس قدر دشوار تھا۔ یہ بس نہیں ہی جانتا تھا۔ دن پہر گھنٹے اور بسے۔۔۔۔۔ مجھے اس قدر طویل بھی محسوس نہیں ہوئے تھے جتنے ان چار دنوں میں، آخر خدا خدا کر کے جمعے کا دن بھی آ ہی گیا۔

مجھے یاد ہے اس دن میرا دل کرہا تھا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی میں پُرانی حویلی کے گیٹ سے محض باغ میں جا بیٹھوں جہاں سے تم،

مہمانوں کو داخل ہونا تھا۔ وہ بھی تو وہیں سے گزرے گی۔ جانے وہ کیسا لمحہ ہوگا جب میں پھر اسے ایک مرتبہ دیکھ پاؤں گا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ تقریب کا وقت شام 4 بجے کا رکھا گیا تھا اور ابھی تک تو ٹھیک سے صبح بھی نہیں ہوئی تھی۔

میں سہ پہر تک کسی کھوئے ہوئے مسافر کی طرح اپنے ہی گھر کی راہداریوں میں اور روشوں میں کئی چٹنگ کی مانند ڈول رہا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ لمحے گھنٹوں کی طرح کیسے گزرتے ہیں۔ نہ جانے کب دن کے دو بجے اور میں اس بچے کی طرح گاڑی نکال کر اپنی پرائیویٹ کی طرف بھاگا جو اپنے روزے کے دن عصر کے وقت سے ہی روزہ کھانے کے انتظار میں دسترخوان پر جا بیٹھا ہے۔

شا کر مجھے اس قدر جلدی وہاں پا کر بے حد خوش اور کچھ پریشان بھی ہوا۔ کیونکہ ابھی تک تو وہ اور اس کے بیٹے نظامت میں ہی مشغول تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے شا کر کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ میری فکر چھوڑ دے۔ وہ اپنے کام جاری رکھے۔ تب تک میں حویلی کا ایک پکڑنگا لوں گا۔ شا کر کو دکھانے کے لیے کچھ دیر تک میں اپنی آبائی حویلی میں گھومتا پھرتا رہا اور جیسے ہی شا کر کا دھیان دوسری طرف ہوا میں نظر بچا کر گیٹ کے پاس والے ہاٹھپے میں لگی کرسیوں میں سے ایک پر آ بیٹھا۔ قہم مہمانوں کو اسی مرکزی گیٹ سے ہی اندر آتا تھا کیونکہ شا کر کے کوارٹر کے لیے حویلی میں دوسرا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ سڑ سے تین بجے سے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی اور میری دھڑکن کی اقل پاقہل بھی۔۔۔۔۔ جب بھی کوئی پردہ نشیں دور سے گیٹ کی طرف آتی نظر آتی۔ میری سانسیں تھمنے لگ جاتیں۔ لیکن جس کے انتظار میں میں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا تھا اس کا اب تک دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ نہیں آئے گی۔ کہیں مولوی صاحب نے ہی منع نہ کر دیا ہو؟ کہیں کوئی اور مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟ ہزار سو سے تھے جو ایک ایک ہل میں دل میں آتے اور میری وحشت کو بڑھا کر واپس چلے جاتے۔

پھر اچانک اس غنڈی سڑک کے موڑ سے، جس کے کنارے ہماری حویلی موجود تھی۔ ایک ٹانگہ اپنی مخصوص جگہ تک کی آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔ میری نظریں آخری امید کے ٹھنڈے دیے کی طرح اس ٹانگے کی مخصوص رفتار پر جمی گئیں۔ ٹانگہ حویلی کے بڑے چوہلی گیٹ کے سامنے آخر رک گیا۔ اس میں اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ ایک بڑا نور چرے اور ہلکی سی داڑھی والا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ سفید شلو کر کرتے میں بیویں اس نوجوان نے اتر کر کوچوان کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور کچھل سیٹ سے سیاہ برقعوں میں بیویں دو لڑکیاں نیچے اتریں۔ فضا تھم سی گئی، ہوا ساکت ہو گئی اور درختوں کے سبکی پرندے چہچہانا بھون گئے۔ وہ وہی تھی۔ میں ان نازک قدموں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یقیناً اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں لڑکیوں کی صرف۔۔۔۔۔ نکلیں نقاب سے باہر نہیں۔ اف۔۔۔۔۔ پھر وہی آنکھیں۔۔۔۔۔ اس نوجوان نے حیرت سے پہلے اس عظیم الشان حویلی کو دیکھا اور پھر لڑکیوں سے جیسے ایک مرتبہ دوبارہ صبح چاہی کیونکہ ایک ڈرائیور کی ایسی رہائش گاہ کا اسے تصور بھی نہ ہوگا۔ پھر شاید جیسے چھوٹی والی نے اسے کچھ سمجھا یا۔ وہ نوجوان انہیں لیے جیسے کسی شش و پنج میں جمکتے ہوئے گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ شاید وہ سب پہلی مرتبہ شا کر کے گھر آئے تھے۔

وفتا اس نوجوان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اور یہ کیا؟ وہ تینوں تو میری جانب ہی بڑھ رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹی والی کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر شامائی کی ایک چمک لہرائی اور اس نے سرگوشی میں ایمان سے کچھ کہا۔ شاید چھوٹی مجھے پہچان گئی تھی۔ ایمان نے ایک نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ یک بجلی سی چمکی۔۔۔۔۔ یہ اس کی دوسری نظر تھی جو میری نظر سے ٹکرائی تھی۔ بے خودی کی ایک ہر مجھ پر طاری ہو گئی۔ مجھے یوں

لگا جیسے اس کی پہلی نظر سے لے کر اس دوسری نظر تک کے فاصلے کے درمیان مجھ پر جو بھی گزری، میری تڑپ، میری کسک، میری وحشت اور میری در بدری۔۔۔۔۔ سب کو قرار مل گیا ہو۔

میرے قریب آ کر لڑکے نے مجھے سلام کیا۔ ”جناب۔۔۔۔۔ یہ شاہ صاحب۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے جن کی بیٹی کی سچ منگنی ہے، اُس کا گھر۔۔۔۔۔؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”جی جی۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک جگہ پر آئے ہیں۔ یہاں سے اس راستے سے ہوتے ہوئے آپ پیچھے چلے جائیں۔ تقریب وہیں ہو رہی ہے۔“

لڑکا میرا شکر یہ ادا کر کے اور ہاتھ مل کر انہیں لیے آگے بڑھ گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی ایمان کی طرف براہ راست دیکھنے سے روک رکھا۔ لیکن نہ دیکھنے کے باوجود اس کے قرب کا ایک عجیب اور لطیف سا احساس میرے ساتھ رہا۔ چھوٹی والی ایمان البتہ کچھ پھیلی گئی تھی۔ وہ جاتے ہوئے پھر سے مجھے غور سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ یوں لگا جیسے زندگی پھر سے حرکت میں آگئی ہو۔ نوا پھر سے چپنے لگی، پرندے پھر سے چہچہانے لگے۔ میں وہیں کرسی پر بٹھ جا رہا تھا کہ میری زندگی میں چند لمحے ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم ہر بار دہینا چاہتے ہیں۔ یہ پہلی میری زندگی کے انہی چند لمحوں میں سے ایک تھا۔ لیکن افسوس ہر بڑی بات کی طرح ہر اچھی بات بھی گزرنے کے بعد صرف ایک یاد بن کر رہ جاتی ہے۔ میں کافی دیر وہیں بیٹھا خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ سب خواب نہیں تھا اور ابھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ یہیں موجود تھی۔ میرے سامنے، میرے اتنے قریب۔

اندروں سے عورتوں کے ہنسنے اور گانے بجانے کی آوازیں آنے لگی تھیں اور پھر اندر سے شاہ صاحب مجھے ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آ نکلا۔ ”ارے حماد بابا۔۔۔۔۔ آپ ادھر بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں تقریب میں بھی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آئیے نا۔۔۔۔۔“

شاہ کر زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر مردانے میں لے گیا۔ وہاں سبھی مجھے دیکھ کر حوذب سے ہو گئے۔ دوران کا ہنسا بولنا اور باتیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ میں اسی لیے اس ہجوم میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی آپ کا اہنا تعارف ہی آپ کے لیے سب سے بڑا روگ بن جاتا ہے۔ یہاں ہر سب مجھے شاہ کر کے مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ریٹائرڈ کسٹمر امجد رضا کے بیٹے کی حیثیت سے پہچان رہے تھے۔ لہذا میں جلد ہی اس محفل سے اکٹا گیا، ویسے بھی میرا دھیان ہی کہیں تھا ان سب باتوں کی طرف۔ پھر شاہ کر کو اندر کسی نے زنانے میں بلوایا اور مجھے وہاں سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں نے شاہ کر کو خصوصی تاکید کی تھی کہ مہمانوں کو بخانے کا اور ان کے طعام کا انتظام کھلی جگہ پر کرے، اس مقصد کے لیے میں نے اصرار کر کے حویلی کا بڑا ہال بھی استعمال کرنے کا کہا تھا۔ اُسے بابا کی ناراضگی کا ڈر تھا لیکن میری ضد کے سامنے اُسے ہمیشہ ہی ہارنا پڑی تھی، اسے بڑے ہال کو اب مردانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اور اس ہال کے پچھلے دروازے کے بالکل سامنے شاہ کر کے کوارٹر کا جھوٹا سا باغچہ اور اس کے پیچھے شاہ کر کا گھر تھا، جیسے ہی میں ہال سے باہر نکلا دہی نوجوان جو ایمان اور حیا کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ مضطرب سا مجھے ہال کے دروازے کے باہر کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔ ”معاف کیجئے۔۔۔۔۔ میں اس وقت آپ کو پہچان نہیں پایا۔۔۔۔۔ میرا نام عبداللہ ہے۔

میں مولوی عظیم الدین صاحب کا بھتیجا ہوں چچا اکثر آپ کی باتیں کرتے ہیں۔“

خوشگوار کی ایک بہری میرے تمام وجود میں پھیل گئی تو گویا کسی بہانے ہی سی۔۔۔۔۔ میرا ذکرنا چیز بھی اس چار دیواری میں ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کبھی میرا نام اس مہ جیوں کے ہونٹوں پر بھی آیا ہو۔ اس وقت جانے کیوں زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے نام پر خود بخود پیارا آنے لگا۔ میں نے اس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اس دن آپ کے گھر آنا ہوا تھا لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی لیکن آپ یہاں باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلیے۔ کچھ ہی دیر میں چائے کا اہتمام ہونے والا ہے۔“

عبداللہ نے کچھ تذبذب سے کہا: ”در اصل مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ تو بچہ کی طبیعت سے واقف ہیں۔ ہمیں اب نکلنا چاہیے۔ میں اس انتظار میں یہاں کھڑا ہوں کہ اندر سے کسی کو بھیج کر گھر کی خواتین کو بلوالوں تو چلوں۔“

اتنے میں شا کر اندر زنانے سے برآمد ہوا۔ ہم دونوں کو باہر کھڑا دیکھ کر وہ جلدی سے ہماری طرف بڑھا۔۔۔۔۔ ”حماد بابا۔۔۔۔۔ خیر تو ہے۔۔۔۔۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔“

میں نے مسکرا کر اسے عبداللہ کی طرف متوجہ کیا۔

”میری طرف سے تو سب خیر ہی ہے۔ لیکن عبداللہ میاں واپسی کی فکر میں ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ دیر ہو رہی ہے۔“

شا کرنے حیرت اور کچھ شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

”ابھی سے۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ابھی تو انگوٹھی بھی نہیں پہنائی گئی۔ اور پھر مغرب کے بعد کھانا کھائے بنا۔ میں ہرگز کسی کو نہ جانے دوں گا۔ ناممکن۔۔۔۔۔ عبداللہ اکساری سے گویا ہوا۔

”شا کر چچا۔۔۔۔۔ مغرب کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہماری طرف کی سواری مٹا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اور پھر بچی۔“

”بھئی مولوی صاحب سے تو میں خود دست لوں گا۔۔۔۔۔ وہ جانتے ہیں کہ میری اکلوتی بچی کی خوشی ہے، ایسے میں دیر سویر تو ہو ہی ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ رہی بات سواری کی۔۔۔۔۔ تو میں خود دم لوگوں کو واپس چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ بس طے ہو گیا۔“

شا کرنے حتمی فیصلہ دے دیا۔ عبداللہ کے پاس بھی مزید بحث کی اب کوئی گنجائش نہ تھی، اس نے شا کر سے مغرب کی نماز کے لیے اجازت چاہی اور قرعہ مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ شا کرنے اُسے جلد واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ پھر جیسے اچانک شا کر کو کچھ یاد آیا۔ اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

”ارے حماد بابا۔۔۔۔۔ دیکھو اب واقعی بوزھا ہوتا جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اندر بگھت کی امی تمہیں بلاتی ہیں۔۔۔۔۔ بگھت شا کر کی بیٹی کا نام تھا۔ بچپن میں میری ساری کتابیں سال ختم ہونے کے بعد بگھت کے پاس ہی جاتی تھیں۔ شا کر کو اپنی بیٹی کی تعلیم کی بڑی فکر لگی رہتی تھی۔ بگھت جب چھوٹی تھی تو وہ اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آتی تھی۔ وہ خاموش سی چھوٹی بچی مجھے اب تک یاد تھی۔ شا کر کی بیوی کو بچپن سے خاندان کا ہاتھ تھا۔

”ارے حماد بابا۔۔۔۔۔ دیکھو اب واقعی بوزھا ہوتا جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اندر بگھت کی امی تمہیں بلاتی ہیں۔۔۔۔۔ بگھت شا کر کی بیٹی کا نام تھا۔ بچپن میں میری ساری کتابیں سال ختم ہونے کے بعد بگھت کے پاس ہی جاتی تھیں۔ شا کر کو اپنی بیٹی کی تعلیم کی بڑی فکر لگی رہتی تھی۔ بگھت جب چھوٹی تھی تو وہ اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آتی تھی۔ وہ خاموش سی چھوٹی بچی مجھے اب تک یاد تھی۔ شا کر کی بیوی کو بچپن سے خاندان کا ہاتھ تھا۔

”ارے حماد بابا۔۔۔۔۔ دیکھو اب واقعی بوزھا ہوتا جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اندر بگھت کی امی تمہیں بلاتی ہیں۔۔۔۔۔ بگھت شا کر کی بیٹی کا نام تھا۔ بچپن میں میری ساری کتابیں سال ختم ہونے کے بعد بگھت کے پاس ہی جاتی تھیں۔ شا کر کو اپنی بیٹی کی تعلیم کی بڑی فکر لگی رہتی تھی۔ بگھت جب چھوٹی تھی تو وہ اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آتی تھی۔ وہ خاموش سی چھوٹی بچی مجھے اب تک یاد تھی۔ شا کر کی بیوی کو بچپن سے خاندان کا ہاتھ تھا۔



جس پر میری اصل خالائیں خاصی جزیرہ تھیں اور ان سے میں خاصا نفوس بھی تھا۔ جیسے آج کل بنی مولوی صاحب کے لیے گھر سے چھپ چھپ کر چیزیں لے جاتا تھا اسی طرح میں بچپن میں نگہت اور خالہ کے لیے اپنے اسکول ایک میں چاکلیٹیں، کتابیں اور دیگر چیزیں لے جایا کرتا تھا۔ اسکول سے واپسی پر میں شا کر سے ضد کر کے چند لٹکوں کے لیے پُرانی حویلی رکتا اور اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم تھے خالہ اور نگہت کو دے دیتا۔ خالہ اس بات پر مجھ سے ہمیشہ ناراض بھی ہوتیں لیکن میرا یہ معمول تمام اسکول لائف میں جاری رہا۔۔۔۔۔ جب تک کہ مجھے بورڈنگ نہیں بھیج دیا گیا۔ ابنتہ بورڈنگ سے بھی جب میں چھٹیوں میں گھر واپس آتا تو اس خاندان سے ملنے ضرور جایا کرتا۔

میں جانتا تھا، خالہ شا کر سے میرے بارے میں ضرور پوچھیں گی اور مجھے اندر ضرور بوائے گی۔ لیکن جانے کیوں میں اس بل سے گھبرا رہا تھا، کھڑا رہتا تھا۔ میں اس وقت اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں سب ہوں گے۔ اور پھر سب نہ بھی ہوں تو کیا ہے وہ تو ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے سامنے میں خالہ سے یا نگہت سے ڈھنگ سے بات بھی کر پاؤں گا یا نہیں۔ پہلے وہ یہاں آتے وقت گیٹ پر میری بڑا بہت ضرور محسوس کر چکی ہوگی۔ لیکن بہر حال، اس وقت شا کر کو نالنے کا یا انکار کرنے کا کوئی موقع بھی مجھے میسر نہ تھا۔ شا کر میرے سر پر ہی کھڑا تھا اور مجھے ساتھ لے کر ہی وہ وہاں سے نکلے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں تنہا کبھی بھی اندر نہیں جاؤں گا۔ شا کر کے ساتھ بھی میرا عجیب رشتہ تھا۔ میں نے کبھی اسے بچا، یا ہایا کسی اور، حرام کے نام سے پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جب کبھی مجھے اسے پکارنا ہی پڑ جاتا تو میں شا کر کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ بچپن سے ہی میری معمول تھا۔ میں نے کبھی کسی روایتی طریقے سے اپنے دل میں موجود احترام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید ہمارے بچے موجود اس رشتے کو کسی روایتی نام یا احترام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

شا کر مجھے لپٹے ہوئے اندر زانے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر سے عورتوں کے ہنسنے بولنے، ڈھونگی اور شادی بیہ کے گیتوں کا شور سنائی دے رہا تھا، صحن میں، برآمدے میں اور اندر کمروں میں ہر طرف عورتیں ہی عورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئیں۔ کچھ نہیں، کچھ نے سرگوشتوں میں ایک دو جے سے نہ جانے کیا کہا، میں اسی لیے اس طرح کے نسوانی جھوم میں جانے سے بیٹھ جھکتا تھا، جب بہت سی عورتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہ بہت بے باک ہو جاتی ہیں اور پھر معاملہ کسی ایسی مغربی یا شادی بیہ کی تقریب کا ہو تو یہ بے باکی مردوں کو بھی مات دیتی ہے۔

خالہ مجھے دیکھ کر ”گے بڑھی اور جلدی سے اُس نے میری بلائیں لے لیں۔ نگہت جو سر جھکائے گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی، اُس نے میری آمد کا شور سن کر ہلکے سے سرائف کر مجھے دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا شا کر نے میرے لیے بمشکل راستہ خالی کر دیا۔ میں نے نگہت کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

”میں جانتا تھا۔ یہ ساری شرارت تمہاری ہی ہوگی، کم از کم اپنی مغلی کے دن تو چپ کر کے بیٹھی رہتیں۔۔۔۔۔“

نگہت گھونگھٹ تلے مسکائی۔

”حمدا بھیا۔۔۔۔۔ ابانے مغلی کے بعد مجھے کالج جانے سے منع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں سسرال والے بُرا مانتا ہے۔ آپ اب اسے بات

کیجئے نا۔۔۔ میری خاطر۔۔۔" لو بھلا۔۔۔ لڑکیاں مہندی اور منگنی والے دن جانے کیا کیا سوچتی ہیں کہ ان کا ہونے والا دولہا کیسا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ اور ان محترمہ کو آج کے دن بھی اپنی پڑھائی کی سی سوجھ بوجھ رہی ہے۔ مجھے مذور کی ہنسی آگئی۔ میں نے دھیرے سے گھبت کے کان میں کہا۔

"تمہارے سسرال داموں کی تو ایسی کی تھیں۔۔۔ بے فکر ہو جاؤ۔۔۔ کوئی تمہیں حزیہ پڑھنے سے نہیں روک سکتا۔ نہ تمہارے ابا اور نہ تمہارا چھ مہینے بعد ہونے والا میاں۔ میں خود بات کر لوں گا۔ اب خوش۔"

اور واقعی خوشی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو ہی تو آ گئے۔ یہ لڑکیوں کا دل اتنا چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟ ذرا ذرا کی بات پر رو دینے والا اور پھر خوش بھی کتنی چھوٹی سی بات پر ہو جاتی ہیں۔ دس کا شیشہ اتنا صاف کیسے رکھ لیتی ہیں یہ سب لڑکیاں۔۔۔؟

وہنا میری نظر چھوٹی حیا پر پڑی۔ وہ اسی کمرے میں موجود تھی جہاں محبت کو بندھا یا گیا تھا۔ حیا پاس بیٹھی کسی عورت سے ہلکی آواز میں کچھ بات کر رہی تھی، لیکن ایمان مجھے اس کمرے میں کہیں دکھائی نہ دی۔ میں اب یہاں سے نکلنا چاہتا تھا لیکن شاکر عورتوں کے اس جھوم میں مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بچپن سے اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ سوچا ساتھ والے کمرے سے ہوتا ہوا پچھلے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا کیونکہ سامنے برآمدے میں تو خواتین کی ایک بڑی تعداد اپنے نچے فرش پر بیٹھ کر دروازے کو کھولنے والے کمرے سے باہر نکلتی تھیں۔ اب اس وقت وہاں کسی کی طرف کسی کے ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ اس دوسرے کمرے کا ایک دروازہ پچھلے مگن میں کھلتا تھا، جہاں اس وقت دیکھیں وغیرہ چڑھائی جاری تھیں۔ میں نے محبت کو اشارہ کیا کہ میں بعد میں اس سے ملوں اور دونوں کمروں کو ملانے والے درمیان کے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں شام کے وقت کی وجہ سے ملگجھا سا اندھیرا مچھایا ہوا تھا اور کمرہ سنسان تھا۔ میں اپنی ہی دھن میں پچھلے مگن کی طرف کھنسنے والے جالی کے دروازے کی طرف بڑھا، چائیک ویوار کے ساتھ نئی ہوئی لکڑی کی بڑی سی الماری کے عقب سے کوئی جلدی میں اپنا آپ سنبھالنے ہوئے نکلا۔ اس الماری میں زیادہ تر گھر کی کرکری اور شیشے کے برتن وغیرہ پڑے ہوتے تھے۔ وہ سایہ اپنی ہی جھونک میں مجھ سے ٹکرایا اور اُس کے ہاتھ سے شیشے کی تین چار بیٹیں پھس کر فرش پر گر گئیں۔ ایک دہلی سی نسوانی چیخ فضا میں ابھری، بیچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی بوکھلا سا گیا، مجھ سے ٹکرا کر وہ سایہ بڑ کھڑا گیا لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن اس تمام معاملے میں سنبھلتے سنبھلتے آجکل ڈھلک کر کاندھوں پر آچکا تھا۔ وہ ایمان تھی، قیامت کی گھڑی کا تذکرہ تو سب نے ہمیشہ سنا ہوگا لیکن وہ قیامت کی گھڑی ہوگی کیسی؟ اس کا شاید کسی کو مجھ سے بہتر اندازہ نہ ہوگا۔ اُس کا حسن بے حجب تھا اور مجھ سے اس قدر قریب تھا کہ اس کی ابھی ہوئی سانسوں کی مہک میں اپنے سینے پر محسوس کر سکتا تھا، اس کی مخصوص ابھی ہوئی سی لٹ بکھر کر اس کے چہرے پر آ پڑی تھی اور اس کا گلابی دودھ جیسا ہلچل چہرہ اس وقت شرم، خوف اور حیا کے مارے انگارہ سا ہو رہا تھا۔

کیا کسی کی دعاؤں کا اثر قدرت نے اس قدر جلد اور اس قدر داخلی انعام کے طور پر بھی دیا ہوگا۔۔۔؟ شاید کبھی نہیں۔

وہ بڑبڑ کر ہوئی۔۔۔ "معاف کیجئے۔۔۔ وہ نہیں۔۔۔ میں یہاں برتن لینے آئی تھی؟"

مجھ سے جواب میں کچھ بھی نہ بولا گیا۔ شاید میری زبان ہمیشہ کے لیے سلب کر لی گئی تھیں۔۔۔ اتنے میں برتن گرنے کی آواز سن کر پاس کے کمرے سے خال اور ایمان کی چھوٹی بہن حیا بڑبڑاتے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئیں اور فرش پر بکھرا کالج اور مجھے اور ایمان کو وہاں کھڑا

دیکھ کر جیسے خود ہی سب سمجھ گئیں۔ ایمان جلدی سے خالہ کی طرف بڑھ گئی۔ خالہ ہنس کر بولی۔ ”ڈر گئیں کیا؟۔۔۔ ارے یہ اپنا ہی بچہ ہے، حماد۔۔۔ گھبت کا تیسرا بھائی ہی سمجھو۔“

جینے ہنسی روکنے کے لیے پلو منہ میں لے لیا تھا۔ اب ایمان بھی سنبھل چکی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر، تھے تک لے جا کر جیسے مجھے آداب کیا۔ خالہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”اچھا تم جاؤ۔۔۔ میں اور حیا یہ کچھ اٹھائیں گے۔ وہاں گھبت اکیلے ہے۔“ ایمان جلدی سے سسٹ پٹائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خار نے پھر سے مجھے کھانا کھائے بغیر واپس نہ جانے کی ہدایت کی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اس کمرے سے کب اور کس طرح باہر نکلا تھا۔ یہ ایک بل میں کیا ہو گیا تھا۔ کیا آج قدرت نے ایک ہی دن میں میرے اس حقیر ختم میں کی ہوئی چند گنی جتنی نیکیوں کا صمد دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میرے کس قدر قریب تھی۔ میری شرگ سے بھی قریب۔ سچ یہ ہے کہ اس دن مجھے خدا پر جس قدر نوٹ کر دیا، اتنا پسے کبھی نہ آیا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے ناشکرے ہوتے ہیں۔ اس پاس کی چیزوں سے، رشتوں سے، خدا کی بانی ہوئی نعمتوں سے دن میں جانے کتنی مرتبہ پیار جنتا رہے ہیں۔ ان کے پیار کا ذکر کرنے سے ہی ہماری۔۔۔ کہیں تک پہنچنے لگتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس خدا پر کبھی یاد نہیں آتا جو ہمارے جینے کے یہ سب بہانے پیدا کرتا ہے۔

مجھے بھی پسے کبھی نہیں آیا تھا، لیکن اس دن آیا اور بہت نوٹ کر آیا، مجھے میری تو قحط سے کہیں بڑھ کر لواڑا تھا اس نے، میں بے خود سہ کسی سے کش کی طرح اس پاس سے بیگانہ۔ وہیں کسی گوشے میں بیٹھا رہا۔ کھانا لگ چکا تھا۔ شاکر نے اسی گوشے میں مجھے کچھ کر دیا۔ جانے کب تقریب ختم ہوئی اور لوگ دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے۔ میں تب چونکا جب میرے سامنے سے عورتوں کی آخری ٹولی بھی جلدی جلدی، اپنی چادریں اور برقعے سنبھالتی گزر گئی۔ مجھے اپنی بے خودی پر غصہ آیا۔ کتنی دیر بیت گئی تھی۔ وہ ضرور واپس چلی گئی ہوگی۔ میں جلدی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف آیا، وہاں عبداللہ کوش کر کے ساتھ کھڑے دیکھ کر میری جان میں جان ہی آ گئی۔ میں تیز قدم اٹھاتا ان کے قریب پہنچا۔ شاکر نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”لو۔۔۔ حماد یا بھی آ گئے۔ اب مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

پتہ چلا کہ مہمانوں کو واپس پہنچانے کی غرض سے جو گاڑی کرائے پر منگوائی گئی تھی۔ اُسے شاکر کا بڑا بیٹا لے کر گیا تھا لیکن اس کی واہی میں دیر ہو گئی تھی۔ عبداللہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ میں نے سمجھتے ہوئے شاکر کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو میں گھر جاتے ہوئے انہیں مولوی صاحب کے یہاں چھوڑتا جاؤں گا۔

”یہی تو نہیں عبداللہ میں کو کہہ رہا ہوں بابا۔۔۔ لیکن یہ حضرت کچھ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔“

”اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔ میں ویسے بھی بس کل ہی رہا تھا۔ راستے میں آپ لوگوں کو گھر چھوڑتا جاؤں گا۔“

عبداللہ کے پاس میری تجویز، نئے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ رات ڈھلچلی جا رہی تھی اور اس وقت کسی دوسری سواری کا ملنا بھی اس علاقے میں محال تھا۔ جب تک میں گاڑی لے کر حویلی کے مرکزی گیٹ تک پہنچا، شاکر اندر سے دونوں لڑکیوں کو بھی بلا دیا تھا۔ ایک ہی دن میں اتنے معجزے رونما ہو جائیں گے۔ یہاں آنے سے پہلے، ایسا نہیں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ شاکر سے رخصت ہو کر وہ سب گاڑی میں سوار ہو گئے۔ عبداللہ میرے ساتھ آ گئے بیٹھ گیا اور ایمان اور حیا پچھلی سیٹ پر۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔ یا خدا۔۔۔ یہ کوئی خواب تو نہیں تھا۔ نہیں۔۔۔

ضروریہ کوئی خواب ہی ہوگا۔ وہ میرے ساتھ، میری ہی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر موجود تھی ایک ویپر میں میری نظریں اس کے سراپے کا طواف کرتی رہیں۔ گودہ مکمل پردے میں تھی اور صرف اس کی آنکھیں ہی اس کے خواب سے باہر تھیں لیکن اس کا اس قدر قریب ہونا ہی کس قدر جاسوسہ احساس تھا۔ میں کسی خواب کے عالم میں ہی گاڑی چلاتا رہا۔ عبداللہ خود بھی خاموش طبیعت اور کم کوفہ کچھ میں بھی اپنے خیالات کی رو میں بہہ نکلا ہوا تھا۔ راستے بھر ہم خاموش ہی رہے۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے سڑکوں کے خالی ہونے اور رات کی وجہ سے رش نہ ہونے پر بے حد غصہ آیا۔ فاصلہ بہت تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر وہ دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ ایمان مسلسل کھڑکی سے باہر گزرتے نظاروں کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی دانستہ پٹا دانستہ طور پر سامنے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور میں سب کی نظر بچا کر مسلسل شیشے میں اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ جانے اس انجانی سی لڑکی نے مجھ پر یہ کیسا جادو کر ڈالا تھا کہ میں دھیرے دھیرے اپنے اوپر اپنا تمام اختیار ہی کھوتا جا رہا تھا۔۔۔

پلک جھپکنے میں ہی موہوی عظیم کا محلہ آ گیا۔ رات کی وجہ سے محلہ بھی بالکل سنسان پڑا تھا۔ میں نے مولوی صاحب کی گلی میں موڑ کر گاڑی کھڑی کر دی۔ عبداللہ نے نہایت ممنونیت سے میرا شکریہ ادا کیا اور سنا اندر آنے کو بھی کہا۔ میں نے شکریہ کہا کہ رات بہت بیت چکی ہے۔ بھر کبھی سکی، ایمان اور حیا بھی گاڑی سے اتر چکی تھیں۔ ایمان تو خاموش رہی البتہ حیا نے اترتے اترتے دھیرے سے شکریہ کہا، میں صرف سر ہا کر رہ گیا، میں نے گاڑی واپس سوڑی اور عبداللہ کو سام کرتے ہوئے آگے بڑھا دی۔ گلی سے نکلتے نکلتے میں نے بیک ویپر میں دیکھ کر دروازہ مکمل چکا تھا اور وہ تینوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ بھر جانے کب میں گھر پہنچا اور کس طرح میں نے خود کو اپنے بستر تک پہنچایا۔ لیکن مجھے، چھٹی طرح یاد ہے۔ اس ساری رات میں میں ایک پل کے لیے بھی پلکیں نہیں جوپک پایا تھا۔ اس رات مجھے احساس ہوا کہ عشق کا ڈنگ اپنا و رک رک چکا ہے۔ دراب زہر دھیرے دھیرے میرے جسم کی تمام رگوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔۔

☆☆☆

## عشق کا شین (II)

کتاب گھر پر عظیم الحق حقی کے تحریر کردہ ناول **عشق کا عین** اور **عشق کا شین (I)** کی بے پناہ کامیابی، اور قارئین کے پرزور اصرار پر اب پیش خدمت ہے **عشق کا شین (II)**۔ ان تمام قارئین کے لیے تحفہ خاص، جو اس ناول کا دوسرا حصہ **عظیم الحق حقی کا تحریر کردہ پڑھنا چاہتے تھے**۔ عشق مجازی کے ریتزاروں سے عشق حقیقی کے گلزاروں تک کے سفر کی روداد **عظیم الحق حقی کی لازوال تحریر**۔ **عشق کا شین (II)** کتاب گھر کے **معاشرتی رومانس ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

## پہلی کلاس

اچانک میری آنکھ الارم کلاک کی خیر تھنٹی سے کھل گئی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ شور کیا ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ آج صبح نندن کا آسمان پھر سے سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور شاید ہلکی ہلکی بوند باندی بھی ہو رہی تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آج سے میری باقاعدہ کلاس شروع ہو رہی ہیں اور مجھے نو بجے والی پہلی کلاس کے لیے آٹھ بجے تک ہر حال میں سب وے پہنچ جانا چاہیے کیونکہ اگر آٹھ بج کر دس منٹ والی ٹرین نکل گئی تو کچھو پہلا پیریز بھی گیا۔

انسان کی بہت عجیب فطرت ہے۔ جس چیز کا اسے پابند بنادیا جائے، اسے رفت و رفتہ وہ پابندی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ عام حالات میں میں اگر پوری رات بھی شب بیداری کر کے اٹھتا تو مجھے جب بھی کبھی اتنا زبردستی کا جتنا اس دن مجھے یونیورسٹی پہنچنا لگ رہا تھا۔ دل خواستہ میں نے نیم گرم پانی سے شاور لیا اور گرم کافیا کا ایک ٹک حلق میں اٹھایا، کامران جا چکا تھا۔

لباس تبدیل کر کے نہیں پہنے اترا، کسی بھی شہر کی صبح، اس کے عام دن کے مقابلے میں بہت مختلف اور کبھی کبھی بے حد خوشگوار ہوتی ہے۔ کبھی لوگ خیند سے جاگ کر اپنے اپنے روزمرہ کے معمولات کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ جیسے اس وقت وہ اسٹینشمن ٹار بجانے والی لڑکی سامنے سے گزرتی فرام سے بس اتاری ہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا وہی مخصوص گن رکھتا تھا۔ صبح یہ ہے کہ صبح صبح اس کے چہرے پر جوتاڑی تھی اور آنکھوں میں خیند کا ہلکا سا جوفہ تھا، اس نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ حسین بنادیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ہم دونوں میں اب کافی شناسائی ہو چکی تھی۔ میں نے جیب سے چند سکے نکال کر اسے دینا چاہے، لیکن اس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا۔ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ وہ پیسے صرف اپنی گن رکھنے کے عوض لیتی ہے، اور اس نے تو ابھی تک مجھے کوئی دھن سنائی ہی نہیں ہے۔ اس لیے وہ یہ پیسے قبول نہیں کر سکتی۔ مجھے اس کی یہ بات جانے کیوں بہت اچھی لگی۔ میں نے فس کر اسے کہا کہ یہ آج کی دھن کے پیسے نہیں ہیں۔ دو دن پہلے میں کافی فاصلے پر کھڑا اس کی دھن بہت دیر تک منتا رہا تھا لیکن جب میری جیب میں سکے نہیں تھے۔ یہ اسی دن کا دھارہ ہے۔ یہ سن کر وہ بھی فس پڑی اور پھر اس نے انکار نہیں کیا اور میری ہتھیلی پر پڑے سکے اٹھا لیے۔ اس دن پہلی مرتبہ اس نے مجھے اپنا نام بتایا۔ ”جینی“ اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرا نام دھراناس کے لیے تھا آسان نہ تھا۔

”آ۔۔۔ ماڈ۔۔۔ مجھے ہنسی آگئی۔ اس نے بالکل ایسے کہا تھا کہ جیسے ہمارے ہاں کوئی کہے ”آ۔۔۔ بیل۔۔۔ مجھے مار۔۔۔“ میں نے اسے اپنے نام کا مختصر صورت بتائی۔ ”میڈی۔۔۔“ اس نے خوشی سے دہرایا۔ سینور۔۔۔ میڈی۔۔۔ میں فس کر آگے بڑھ گیا۔ جب تک میں یونیورسٹی پہنچا۔ جب تک یوندا باندی باقاعدہ بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کلاس میں کبھی اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ پہلی کلاس سر آرتھر کی ہی تھی۔ ان



کے کلاس میں داخل ہوتے ہی کلاس میں سنا سنا چھ گیا اور واحد آواز صرف کلاس کی اونچی اونچی بڑی شیشے کی کڑکیوں پر پڑتی بارش کی بوجھڑکی تھی۔ کبھی کبھی یہ آواز باقاعدہ ایک جھڑنگ کی سی کیفیت اختیار کر لیتی تھی۔ سر آئزک نے پہلے ہیرڈ میں معاشیات کی چند موٹی موٹی باتیں بتائیں جن میں سے آدھی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ بہت دنوں سے میں کتابوں سے بہت دور رہا تھا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ میرا دھیان کلی طور پر ٹیکر کی طرف نہیں تھا۔ جب ہمیں ٹائم ٹیبل بتایا گیا تھا تو اس میں ایک سبجیکٹ (Subject) میرے لیے قطعی طور پر نیا اور انجانا تھا۔ اس مضمون کا نام ٹائم ٹیبل شیٹ میں "ہیومنیرنگ" (Humaneering) دیا گیا تھا۔ آج اس مضمون کا پہلا ٹیکر ساڑھے گیارہ بجے ہال نمبر سات میں تھا۔

مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب سر آئزک پھر سے کالا گاؤن پہنے کلاس میں داخل ہوئے۔ پتہ یہ چلا کہ یہ خاص مضمون خود سر آئزک کی ہی فرمائش پر کورس میں شامل کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر لفظ ہیومنیرنگ دو لفظوں کا مرکب تھا نمبر ایک ہیومن و نمبر دو انجینئرنگ یعنی "ہیومن انجینئرنگ" یا دوسرے لفظوں میں آپ اسے انسانی نفسیات کی تعمیر بھی کہہ سکتے ہیں۔

سر آئزک کے خیال میں ان کی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلباء کو نہ صرف اپنے شعبوں میں کامیابی سے داخل ہونا چاہیے بلکہ انہیں نفسیاتی طور پر بھی اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پوری قوت کے ساتھ اپنے مختلف محکموں میں رائج کر سکیں۔ اسی لیے خصوصی طور پر انہوں نے ہیومنیرنگ کا یہ سبجیکٹ (Subject) خود اپنے پڑھانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ آج پہلے ٹیکر کا موضوع تھا "بہت زیادہ عقل مندی بھی حماقت کا دوسرا نام ہے۔"

سر آئزک کا کہنا تھا کہ ہم اپنی زندگی میں جن لوگوں کو بہت شدت سے چاہتے ہیں۔ اندر ہی اندر ہم کہیں نہ کہیں انہی ناموں میں ان سے ایک خاص قسم کی چڑچڑاہٹ بھی پال رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے پیار میں ہماری بے بسی اور انہیں کھودینے کا خوف ہمیں ان کے سامنے اس مخالف جذبے کے اظہار سے روکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ اندرونی چڑچڑاہٹ اندر ہی اندر گل سرگز شدہ نفرت کا زرخ و دھار بنتی ہے۔ اسی لیے جب کبھی ایسے شدید محبت کے رشتے ٹوٹتے ہیں تو ایک ہل میں ہی شدید نفرت کا زرخ اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ہل میں ہوئی نفرت دراصل پچھلے بہت بے عرصے سے ہمارے اندر چلنے والی نفرت کا پھوڑا ہوتا ہے۔

اُس دن ہمیں نے محسوس کیا کہ سر آئزک صرف ایک اچھے اور مہر معاشیات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ایک فلاسفر ایک دانش ور بھی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ ٹیکر ختم ہونے کے بعد انہوں نے کلاس کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ میں نے اپنی باری آنے پر کہا۔ "جذبہ چاہے شدید محبت کا ہو یا شدید نفرت کا، دونوں صورتوں میں انسان کو توڑ دیتا ہے۔" میں ذاتی طور پر نفرت سے زیادہ محبت کو خطرناک جذبہ سمجھتا ہوں۔ اور پھر۔۔۔۔۔"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی میرے سامنے بیٹھی سہارے بالوں والی ایک لڑکی نے غصے اور نفرت سے پلٹ کر مجھے دیکھا اور یولی۔ "کچھ لوگوں کی فطرت میں ہی ہر بات سے اختلاف کرنا شامل ہوتا ہے ایسے لوگوں کی تربیت میں ہی خدا اور ہٹ دھرمی موجود ہوتی ہے۔"

میں اس لڑکی کو نام سے نہیں جانتا تھا، لیکن اس کا رول نمبر ہمیں تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جس دن سے میں یونیورسٹی میں آیا تھا یہ لڑکی اور اس کے چار پانچ دوستوں کا مخصوص گروپ کسی نہ کسی طور پر میرے مذہب اور میری قومیت کو طنز اور مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ عام طور پر میں ان کی سٹی، ان سٹی کر دیتا تھا کیونکہ میں ان بے مطلب کی باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت جانے کیوں میں بھی اپنے آپ پر اکتفا رکھو بیٹھا۔

”اس احساں کسٹری کا شکار تو مجھے وہ لوگ لگتے ہیں جنہیں بظاہر اپنی تربیت پر بے حد ناز ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے اندر کی جہالت کہیں نہ کہیں رنگ دکھائی جاتی ہے۔“

یہ سننے ہی اس رول نمبر ہمیں کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر مجھے کچھ جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن سر آ نرک نے دوسٹرم پر زور سے ڈسٹر مار کر ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”ہیز ہیز۔۔۔ آپ لوگ آپس میں بحث کرنے سے گریز کریں۔ اختلاف رائے ہم سب کا حق ہے لیکن اسے اخلاق کی حدود میں ہی رہنا چاہیے۔ کس سارہ ہیز، آپ مجھ سے الجھنے کے بعد میرے آفس میں ملیں۔“

اتنے میں الجھن ختم ہونے کی تھنی بھی نہ گئی۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ اس آتش مفت کا نام سارہ ہے۔ دیکھنے میں کسی بہت معقول گھرانے کی لائق تھی لیکن جانے مجھ سے اس کی کیا پر عا ش تھی۔ سارہ اور اس کا گینگ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کلاس سے نکل گئے۔ میں نے بھی اپنا بیگ گلے میں لٹکایا اور باہر نکل آیا۔ ہارٹ تھم چکی تھی لیکن سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ رگڑ کر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ اور بھی آگے بڑھنے کا ارادہ کریں رہا تھا کہ اینڈنٹ نے آکر بتایا کہ سر آ نرک مجھے اپنے دفتر میں یاد کر رہے ہیں۔

میں نے اس رہداری کی طرف قدم بڑھا دیے جس کے اختتام پر سر آ نرک کا دفتر موجود تھا۔ بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر دیکھا اندر سارہ غصے میں بھری سر آ نرک کے میز کی مخالف سمت پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس مختصر وقفے میں سارہ کے منہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ سنائی دیے۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے ایک مسلمان کو کیا کسی خاص وجہ کے اپنی یونیورسٹی میں اینڈمشن کیسے دے دیا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ۔۔۔“ سارہ کی بات آدمی رہ گئی کیونکہ میں تب تک اندر داخل ہو چکا تھا۔ سر آ نرک نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”آؤ سارہ۔۔۔ آؤ۔۔۔“

سارہ واپس ہی ہو گئی۔ میں میز کے سامنے لگی دوسری کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ سر آ نرک نے سامنے پڑی فائل پر کچھ نوٹ کر کے اسے بند کر دیا اور پھر نظر اٹھا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

”میں چاہتا تھا کہ تم دونوں کا آپس میں تعارف کروا دوں۔ شاید اس سے چیزوں کو سمجھنے میں کچھ آسانی ہو جائے۔ سارہ۔۔۔ ان سے ملو۔۔۔ یہ حماد احمد رضا ہیں۔ ان کے دادا برٹش گورنمنٹ میں وائسرائے کے ذیلی ستاف میں نہایت اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں دھمکی کی تمام کڑی شرائط پر پورا اترنے کے بعد ان کا داخلہ منظور کیا گیا ہے، ان کا شمار ہمیشہ سے بہترین طالب علموں میں رہا ہے۔“

سارہ نے یہ ساری گفتگو ایک خاص نغوت بھرے انداز میں سنی۔ پھر آنزک نے سارہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور مسٹر صاحبہ۔۔۔۔۔ ان سے میسے۔۔۔۔۔ کس سارہ سے؟۔۔۔۔۔ سارہ آنزک سے؟۔۔۔۔۔ اس یونیورسٹی کی پچھلے چار سمسٹر سے لگاتار پوزیشن ہوڈر۔۔۔۔۔ اور میری بیٹی۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اس کی سطح کلامی کا زیادہ آخر نہیں لیا ہوگا۔“

اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ خوبصورت بلاسر آنزک کی بیٹی تھی۔ ایک یہودن۔۔۔۔۔ تبھی اس کے لہجے سے ہر وقت ایک خاص قسم کا زہر نکلتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چہرہ دوسری طرف کیے، تکبرانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر میں یا ایک انسان نہیں بلکہ کوئی حقیر کیڑا مکوڑا بیٹھا ہو۔ پھر سر آنزک نے ہم دونوں کو کلاس روم کے آداب اور یونیورسٹی ڈسپلن کے بارے میں ایک چھوٹا سا لیکچر دیا اور ہم دونوں سے امید ظاہر کی کہ آئندہ ہماری وجہ سے کلاس کا ماحول تناؤ کا شکار نہیں ہوگا۔ ہم دونوں ہی پُپ کر کے سختے رہے اور پھر ہمیں دس جانے کی اجازت مل گئی۔ ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی کمرے سے نکلے اور ایک دوسرے کو دیکھے یا مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ اس دن مجھے احساس ہو گیا تھا کہ شاید میں اس یونیورسٹی سے معاشیات کی ڈگری حتیٰ آسانی سے لے کر نہیں جا پاؤں گا۔ میرے اور سارہ کے درمیان جس سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ بہت جلد ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کرنے والی تھی۔

☆☆☆

## دجال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے در آمد ایک خوفناک ناول۔ عظیم الحق حقی کا شاندار اناذ بیباں۔ شیطان کے پیروں و روبرو کاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیست (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پر اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ محصور ہے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

**دجال** یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے صیہونیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دنیا کا، حول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ وجاہت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دنیا کے قرام ان فون پر خطر کی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعوئی ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

## زہرِ عشق

نہیں اس رات ایمان کو اس کے مگر چھوڑ تو آیا تھا لیکن اس ہل کے بعد مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ ہرگز ہی جیسے میرے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہو۔  
نہیں نے عشق اور محبت کی بہت سی داستانیں سن رکھی تھیں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس عشق کا ذہن اتنا ہریلا ہوگا۔ ایک ہی ہل میں یہ عشق کا زہر  
میری نس نس میں سریت کر گیا اور اب میری حالت ایسی تھی کہ دن رات کی تڑپ ہی میرا مقدر تھی۔  
محبت بذاتِ خود ایک سب سے بڑے عذاب کی صورت میں وارد ہوتی ہے۔ اور اگر بد قسمتی سے یہ محبت یک طرفہ ہو تو یہ ہر ہل انسان کو  
کچھ کے لگاتی رہتی ہے۔ ایک ایک ہل میں انسان سوسا بار جیتا ہے اور سوسا بار مرتا ہے۔

مجھے کوئی صورت بھائی نہیں دے رہی تھی کہ آخر کس طرح ایمان تک میرے اندر لگی اس آگ کی آغوش پہنچ سکے۔ اس کا گھر سے لکھنا محال  
تھا۔ نہیں پہیے ہی کئی کئی دن گھنٹوں تک اس کے گھر کے باہر پہرہ دے چکا تھا۔ اور اب تو عبد اللہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ گھر کے باہر کھڑے  
رہنے میں اس سے سامنا ہونے کا خطرہ بھی ہر لمحے موجود تھا۔ اور پھر ایمان جیسی لڑکی کو یوں سراہا روک کر بات کرنا بھی اب مجھے بے حد معیوب محسوس  
ہو رہا تھا۔ جانے وہ اس بات سے میرے متعلق کیا تاثر لیتی؟۔۔۔۔۔ تو پھر کیسے۔۔۔۔۔ آخر اس تک رسائی کیسے ہو۔۔۔۔۔؟ دن رات بس یہی ایک  
سواں اور یہی ایک دھن میرے سر پر سوار رہتی تھی۔

یہ سچ ہے انسان کی آرزوؤں اور خواہشات کی کبھی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ ہر منزل پر پہنچ جانے کے بعد اسے وہ منزل ایک سنگ میل  
لگنے لگتی ہے اور کوئی نئی دراصلی منزل اس کی خواہش کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور اسی سفر میں ہی انسان کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ یہ پھر انسان کا مقدر ہی  
ہمیشہ اور کبھی نہ ختم ہونے والا یہ سفر ہوتا ہے۔

کل تک ایمان کی صرف ایک جھلک کو پانا ہی میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ قدرت نے میری یہ خواہش پے در پے کئی مرتبہ  
پوری کر دی تھی لیکن آج میری التجاؤں کی حد صرف دیکھ لینے سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں اس تک اپنے جذبوں کی آغوش پہنچانا چاہتا تھا۔ اپنے یہ احساس  
اس تک منتقل کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید ان کی ناشکری کی بنیادی وجہ بھی کسی مقصد کسی آرزو کو پایا ہوتا ہے۔ نہ ہم آرزو کو پاتے  
اور نہ ہی نئی خواہشات جنم لیتیں۔۔۔۔۔ بس ساری زندگی کسی ایک تمنائیں ہی گزر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

نہیں ایمان کو اس پارٹی کے بعد دوبارہ کبھی دیکھ پانا اور نہ ہی آج میں اس لحوں میں جیل ہوتا۔ ساری زندگی در بدر اس کی دوسری جھلک  
دیکھنے کے لیے ہی بھٹکتا رہتا تھا تو اچھا ہوتا۔

دن اسی کش مکش میں گزر رہے تھے اور راتیں اسی کرب میں کٹتی تھیں۔ ایک دن شاکر شام کے وقت مجھے ڈھونڈتا ہوا اچھٹ پر آ پہنچا

”جہاں میں بہت دیر سے بیٹھا جاتی گرمیوں کا سورج ڈھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ گرمیوں کا سورج ڈھلتے ڈھلتے بھی کتنا وقت بیٹھا ہے، جسے رات سے اس کی کوئی جنگ چل رہی ہو، اور وہ اپنی دوست شفق کو رات کے کالے سایوں کے حوالے نہ کرنا چاہتا ہو۔“

”ارے حماد بھائی آپ یہاں ہو۔۔۔۔۔ کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں، یہ نگہت نے آپ کے لیے دیا ہے۔“

شا کر نے ایک رقعہ میرے حوالے کیا اور پھر واپس چل دیا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ”اور ہاں۔۔۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ حماد بھائی سے کہنا کہ اپنا وعدہ جلدی پورا کریں۔“ شا کر بیٹی کا پیغام دیتے ہوئے اپنے آپ ہی مسکرا دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے رقعہ کھول کر دیکھا۔ صرف چند سطریں ہی لکھی تھیں۔

”پیارے بھیا۔“

اپنا وعدہ بھول گئے نا، اب اسے میری پڑھائی کی بات بھی نہیں کی۔ امتحانات سر پر آرہے ہیں۔ اگر فارم نہیں بھرے تو میرا سال ضائع ہو جائے گا۔ آپ کی سفارش کی بھٹکر۔۔۔“

تب مجھے یاد آیا کہ واقعی میں نے نگہت کی مٹکائی کے دن اُس سے شا کر سے بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب بھائی سے کیا خبر کہ آج کل تو مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ کسی سے کیے ہوئے وعدوں کا کیا بھرم رکھ پاتا۔ لیکن میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ہی شا کر سے اس مسئلے پر حتمی بات کروں گا۔ میں جانتا تھا کہ شا کر میری بات کبھی رو نہیں کرے گا۔ اور اس کے لیے اگر ہم دونوں کو نگہت کے منگیتر کے پاس بھی جانا پڑتا تو میں اس کے لیے واقعی طور پر تیار تھا۔

میں نگہت کا رقعہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے یونہی خالی الذہن سا بیٹھا دو بجے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی اچانک میرے ذہن میں جیسے ایک جہم کا سا ہوا۔ نگہت۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ نگہت بھی تو وہ ذریعہ ہو سکتی تھی۔ وہ ایمان اور حیا کی پہلی تھی۔۔۔۔۔ ایمان تک براہ راست پہنچنے کا واحد ذریعہ۔۔۔۔۔ حیرت ہے۔ اتنے دن پہلے تک میں دیواروں سے لگتا رہا لیکن مجھے نگہت کا خیال کیوں نہیں آیا؟

اور اب جب یہ خیال میرے ذہن میں آئی گیا تھا تو جیسے میری بے چینیوں کو بھی اک نئی راہ مل گئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طور اُڑ کر شا کر کے گھر پہنچ جاؤں۔ بحر طور میں نے جیسے جیسے کر کے وہ رات کاٹی۔ اور اگلی صبح سویرے ہی میں پُرانی حویلی پہنچ گیا۔ گزری شام میں نے شا کر کے جاتے جاتے اس سے نگہت کی مزید تعلیم کے مسئلے میں بات بھی کر لی تھی۔ شا کر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ نگہت کے منگیتر مرے اس مسئلے میں خود بات کر لے گا۔

گھر سے نکلے ہوئے میں شا کر کو بتاتے ہوئے آیا تھا کہ میں پُرانی حویلی کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ ایسی کوئی خفاف معمول بات نہیں تھی۔ میں کئی مرتبہ اپنے دوستوں کی وہاں پارٹیز وغیرہ منعقد کر چکا تھا۔ کامران جب بھی لندن سے واپس آتا تو ہم دونوں کا دن رات کا ٹھکانا وہی پُرانی حویلی ہی ہوتی تھی۔ تب میں کتنا زائدہ دل تھا، ہر وقت اس حویلی کے در و دیوار ہمارے قہقہوں سے، تیز میوزک سے اور ہمارے ہلے گلے سے گونجتے رہتے تھے۔ ایسے میں ہم نگہت اور خانہ سے ہی فرمائش کر کر کے حے حے کے پکوان بجاتے تھے۔ خاص طور پر سادہ کی بارشوں میں ہم دن بھر



پائیں باغ میں دھوا چوڑی چاتے۔ پوریاں کھوائی جاتیں۔ سوسے اور پکڑے بھائے جاتے، کوئلہ ڈرنک کے کرےٹ باغ میں بہتی صاف پانی کی نالی میں رکھوا دیے جاتے، آموس کی بڑی بڑی ٹوکریاں چھکڑوں میں لٹوا کر حویلی کے نعمت خانے میں پہنچا دی جاتیں۔ آہ۔۔۔۔۔ ابھی چند ہفتے پہلے تک میں کس قدر بیتا جاتا انسان تھا۔ اس ایک محبت نے تو جیسے میرے جسم سے روح تک ہی نچوڑ لی تھی۔

گھٹ اور خالہ کا معمول تھا کہ ان میں سے جس کسی کو بھی میرے حویلی پہنچنے کی اطلاع کسی چوکیدار وغیرہ سے ملتی تو وہ فوراً میرے ساتھ آنے والے مہمانوں کے بارے میں پوری معلومات کر کے فوراً چائے ناشتہ وغیرہ بھجوا دیتیں۔ میں کبھی تھا ہوتا تو گھٹ خود آ جاتی سے نہ نئی کتابیں پڑھنے اور منگو نے کا بہت شوق تھا، شا کر کے سامنے تو وہ مکمل کر کوئی فرمائش نہ کرے نہیں پاتی تھی کیونکہ شا کر اس کی فرمائشوں پر اُسے ہمزک دیتا تھا۔

اس دن بھی یہی ہوا، جیسے ہی گھٹ کو میرے آنے کی خبر ہوئی۔ وہ کچھ ہی دیر میں چائے اور ٹیکین۔ سبکٹ وغیرہ ایک لڑے میں رکھ کر وہاں آ کر پہنچی۔ اس دن گھٹ کے چہرے سے ہی خوشی بھوٹ رہی تھی۔ پتہ چلا کہ رات ہی شا کر نے اُسے اپنے طور پر آگے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وردہ جانتی تھی کہ یہ سب میری ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے آتے ہی میرا غلوں دل سے شکریہ ادا کیا۔ مجھے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔ گھٹ بھی میری کشمکش کو بھانپ گئی۔

”کیا بات ہے عہاد بھائی جان۔۔۔۔۔ آپ کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہیں۔“ ”گئی۔۔۔۔۔ اُس دن مٹکی میں تمہیں وہ لڑکی یاد ہے۔۔۔۔۔ وہی جو مجھ سے اندھیرے کمرے میں لکرائی تھی۔“

گھٹ اپنی ہی دماغ میں کپ میں چائے اٹھ پلٹے ہوئی بولی۔

”کون۔۔۔۔۔ ارے ہاں۔۔۔۔۔ امی جان نے مجھ کو بتایا تھا“ ”گھٹ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

”وہ ایمان تھی۔ ہمارے ہمارے محلے میں رہتی ہے۔ مولوی علیم الدین صاحب کی بیٹی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے بھیا۔“

پھر جیسے گھٹ کو کچھ خیال آیا اور وہ فوراً میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”خیر تو ہے بھیا۔ آپ ایمان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں ایک خاص شرارت تھی۔ میں کچھ گڑبڑا سا گیا۔ دل کے کچھ بچ چھپا ناکس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ جس گھٹ کی ہم سب مل کر مٹکی اور شادی کے نام پر خوب کھپائی کیا کرتے تھے، اتنی کہ وہ اکثر رونے لگ جاتی تھی۔ آج اس کی ایک معصوم شرارت بھری مسکان نے مجھ سے میرا تمام اعتماد ہی چھین لیا تھا۔ شاید دل میں چور ہونا اسی کو کہتے ہوں گے۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ وہ دراصل نہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔“

گھٹ نے میری چوڑی چوڑی بولی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔۔۔ بھیا۔ دیکھیں اس کے ساتھ کوئی شرارت نہ کیجئے گا۔۔۔۔۔ وہ بہت بھولی بھولی سی سہیلی ہے میری۔۔۔۔۔ اور بہت مذہبی گھرانے سے تعلق ہے اس کا۔“

گھٹ میری بہت سی سہیلیوں کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ میری تمام دوستوں کو میری سہیلیاں ہی کہتی تھی۔ اور ایمان کے بارے میں

میری پوچھ گچھ کو بھی میرے انہی ہندسے معمولات میں سے ایک سمجھ رہی تھی۔ میں نے محبت کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہیں اپنے پاس بٹھایا۔  
”بٹھو یہاں۔۔۔ اور غور سے میری بات سنو۔“

میں نے ”اے“ سے ”ی“ تک اب تک کی تمام کہانی محبت کو سن دی۔ محبت حیرت سے میری رم کھینچتی رہی۔

”اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں۔۔۔ میں بہت مشکل میں ہوں کئی۔۔۔“ ہوں۔۔۔ یہ تو خاصا گھمبیر معاملہ ہے۔۔۔ تو ایمان بی بی نے میرے پیارے بھائی کی خندیں حرام کر رکھی ہیں۔۔۔ لیکن بھیا۔۔۔ آپ جیسا سمجھ رہے ہیں۔۔۔ وہ دیکھی لڑکی نہیں ہے۔۔۔ ساری زندگی کسی نافرمان سے بات کرنا تو ذرا کی بات ہے۔۔۔ اس پر ایسی کسی چیز کا سایہ تک نہیں پڑا۔ اپنی ساری تقسیم بھی اس نے پردے میں ہی حاصل کی ہے۔ اسے اپنی اور اپنے گھر کی عزت اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔ محلے کا ہر گھرانا اسے اپنی بھونٹنا چاہتا ہے اور آپ سے پہلے بھی کئی نوجوان اس کی ایک جھلک کے لیے سالوں اس کے گھر اور گلی کے چکر کاٹتے رہے ہیں۔ لیکن ایمان نے نظر اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ میرا آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔۔۔ وہ ذرا سے ہنسی یہ بڑی میز می کھڑ ہے۔ آپ کا تو کچھ نہیں بگاڑے گا بہت نہیں اپنی سب سے پیاری دوست کو ہمیشہ کے لیے کھودوں گی۔“

مجھے محبت کی بات سن کر غصہ آ گیا۔ میں اٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم رہنے دو۔۔۔ میں خود ہی کچھ کر لوں گا۔“

میں نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ محبت نے جاتے جاتے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے چہرے پر شری مسکراہٹ تھی۔

”اوہو۔۔۔ روٹھ گئے پیارے بھیا۔۔۔ لگتا ہے آپ واقعی ایمان کے لیے تنگ ہیں۔۔۔ پھر تو واقعی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”تو پھر کچھ سوچو۔۔۔ آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ اپنے بھیا کا اتنا سا کام نہیں کر دو گی۔“

میں اور محبت سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور ایمان تک یہ راز دل پہنچانے کے مختلف طریقوں پر غور کرنے لگے۔ کبھی مجھے کوئی طریقہ سوچتا تو محبت اُسے رد کر دیتی اور کبھی محبت کے ذہن میں کوئی بات آتی تو وہ طریقہ مجھے نہ بھاتا۔ اسی شش و پنج میں جانے کتنی دیر بیت گئی لیکن ہم کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پائے۔ میں نے محبت کو ایمان کے نام ایک مختصر سا رقعہ لکھ کر دینے کی تجویز بھی دی تھی لیکن محبت نے صاف انکار کر دیا تھا اس کے کہنے کے مطابق ایمان کبھی اس رقعے کو کھول کر نہ پڑھتی اور اسے پھاڑ دیتی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس بات پر محبت سے بھی ہمیشہ کے لیے بات چیت بند کر سکتی تھی۔

تھک ہار کر میں تو سر قہم کروں جیٹھ گیا۔ محبت سے اپنے لاڈلے بھیا کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی اور اُس نے حیا کو اس معاملے میں اپنا راز دینے کی ٹھان لی۔ مے پیہ پیا کہ محبت کسی بھانے ایمان اور حیا کو اپنے گھر بوائے گی۔ حالانکہ اس معاملے میں مولوی صاحب بہت سخت اصول پسند واقع ہوئے تھے لیکن محبت کے مطابق وہ ایک ہار نہیں مولوی صاحب سے بھی اجازت دلوائی دے گی چاہے اس کے لیے اسے خود مولوی صاحب کی منت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اس دن مجھے بھی اطلاع کر دی جائے گی اور محبت چند لمحوں کے لیے میری ایمان سے تنہائی میں ملاقات کا بندوبست کر دے گی۔ میں جانتا تھا کہ محبت کے لیے یہ سب کس قدر مشکل ثابت ہوگا لیکن میری محبت میں اس نے اپنی بچپن کی دوستی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

طے یہ پایا کہ آنے والی جمعرات کو اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ لیکن میری وہاں سے واپسی تک نگہبست نے ہزاروں بار مجھ سے تصدیق چاہی کہ میں کہیں ایمان سے غلط تو نہیں کر رہا۔ کہیں وہ بھی کہیں میری بہت سی سہیلیوں کی بھیڑ میں کھو تو نہیں جائے گی۔ آخر کار مجھے اس کے کان پکڑ کر اُسے یقین دلانا پڑا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا اس کی بچپن کی سبکی تھی ہی اک ایسی گورنایاب۔۔۔۔۔ اس سے مجھے نگہبست پر بے حد رشک بھی آیا۔ وہ کتنی آسانی سے اس مرد و اس گل رخ سے مل سکتی تھی، بات کر سکتی تھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام سکتی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں گھنٹوں بیٹھیں، بیٹھا نگہبست کے ساتھ ایمان کی باتیں کرتا رہوں۔۔۔۔۔ اس سے ایمان کی باتیں سنتا رہوں۔۔۔۔۔ محبت میں محبوب کا ذکر بھی کس قدر جاس فزا ہوتا ہے۔ بس اُس کے ذکر سے ہی بھوک پیاس مٹتی رہتی ہے۔ صدیاں گزریں میں بیت جاتی ہیں۔ نقد یونہی خود بخود ہی دل کش لگنے لگتی ہے۔ آس پاس کا سبھی شور بھی جیسے غصوں میں ڈھل جاتا ہے۔ سخت جس زدہ پھیل دھوپ میں بھی جیسے نہ وائیاں ہی چلتی محسوس ہوتی ہیں۔ رات اور دن سب ایک خواب زدہ کیفیت میں گزرتے رہتے ہیں۔ ہونٹوں پر اپنے آپ ہی ماکسی بات کے ایک خاص میٹھی سی مسکان پھیلی رہتی ہے۔ سب دشمن بھی دوستوں جیسے پیارے لگنے لگتے ہیں۔ جانے کیا کچھ ہونے لگتا ہے۔

میں بھی اگلی جمعرات کے آنے تک انہی سب محسوسات سے گزرتا رہا۔۔۔۔۔ کہتے ہیں یک طرفہ عشق دوسروں کا گھر ہوتا ہے۔ مجھے بھی اچانک عجب سے دوسرے ڈسنے لگتے۔ پتہ نہیں وہ آ بھی پائے گی یا نہیں؟ کہیں مولوی صاحب منع ہی نہ کر دیں۔ وہ مجھ سے ملے گی بھی یا نہیں؟۔۔۔۔۔ جانے وہ میری اس کوشش کو کیا معنی دے گی۔۔۔۔۔؟

آخر جمعرات کا دن بھی آئی گیا۔ نگہبست نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کے مطابق سر پہرتیں سے چار بجے کا وقت اس ملاقات کے لیے نہایت مناسب تھا۔ گرمیوں کی اس لمبی سر پہر میں ہر طرف سناٹا ہی چھا ہوا رہتا تھا۔ پلان کے مطابق مجھے دو بجے ہی نہ نی حویلی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ حویلی کے بڑے برآمدے کے ساتھ ہی۔ جہاں گرمیوں کے موسم میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے بڑی بڑی ٹیکسٹائل دی جاتی تھیں، ایک بڑ سا کمرہ تھا جسے ہم غنڈا کمرہ کہا کرتے تھے۔ اصل میں یہ کبھی دادا کی سنڈی تھی۔ کمرے کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ گرمیوں میں جو کے رخ پر بولہا شدہ بدعتی دو چہرہ میں بھی یہ کمرہ غنڈا رہتا تھا۔ اب بھی اس کمرے کے حلیف نادر کتب سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں گرمیوں کی لمبی لمبی سی دو چہرہ میں ہم اسی کمرے میں اونٹن سے پڑے نازن اور عمر و میر کی کہانیاں پڑھتے ہوئے گزار دیتے تھے۔

نگہبست نے ایک اور انکشاف بھی کیا تھا کہ ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون تھا، اور اس معاملے میں وہ اکثر نگہبست سے کتابیں مستعار لیتی رہتی تھی۔ نگہبست نے اُسے میرے دادا کی اس اسنڈی اور ان میں رکھی کتابوں کا بھی بتا رکھا تھا اور بقول نگہبست، ایمان کو ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ لیکن زیادہ تر یہ اسنڈی بندی رہتی تھی۔ آج میں خصوصی طور پر اسنڈی کی چابی لے کر حویلی آیا تھا اور نگہبست نے بھی ایمان کو اسنڈی دکھانے کے بہانے ہی حویلی طلب کیا تھا۔ البتہ حیا کو وہ اہماد میں لے چکی تھی کہ اصل میں مقصد میری ایمان سے ایک ملاقات کا اہتمام ہے۔

مجھے اسنڈی میں ہی ان کا انتظار کرنا تھا۔ نگہبست حیا اور ایمان کو لے کر اسنڈی دکھانے آتی تو انہیں چند لمحوں میں مجھے ایمان سے اپنے دل کی بات کہنی ہوگی۔ اب یہ آگے میرا نصیب تھا کہ وہ میری بات سنتی، رد کرتی یا پھر غصے میں پلٹ جاتی۔۔۔۔۔ میں اسنڈی میں اسی نش و نشان میں بیٹھا

سامنے لگی لکڑی کی بڑی سی قدیم کھڑی کی سوئیاں گن رہا تھا۔ ابھی صرف دن کے ڈھائی ہی بجے تھے اور مجھے یہاں پہنچے صرف آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صبح جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا ہوں۔ سنڈی کے بڑے سے روشن دان میں چڑیوں نے پنا گھونسل بنا رکھا تھا اور اس وقت چڑیا بھی اپنے بچوں سمیت اپنے گھونسلے میں سستاری تھی۔ روشن دان سے سامنے کی دیوار پر پڑتی دھوپ دھیرے دھیرے سرک رہی تھی اور ڈھلتے ڈھلتے دیوار پر نئے زاویے بناری تھی۔ کبھی کبھی یہ انتظار بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی سانسیں تک رکتی محسوس ہوتی ہیں۔ منیں نے گھبرا کر اس پاس کی لماریوں میں لگی کتابوں کو نونالٹ شروع کر دیا۔ لیکن حرف میری آنکھوں کے سامنے گھٹنڈ سے ہونے لگے۔ ہر آہٹ پر منیں جیسے اچھل ہی تو پڑتا تھا، لیکن ہر آہٹ کے بعد باہر پھر سے طویل سناٹا چھا جاتا۔ گرمیوں کا مخصوص اور طویل سناٹا جس میں وقفے وقفے سے دُور کسی درخت پر بیٹھے کوسے کی کانیں کانیں کے علاوہ اور کوئی بھی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یا پھر حویلی کے باہر سے گزرتی بسی کالی سنان سڑک پر کسی ٹانگے کی گزرنے کی آواز، یا پھر کسی موز گازی کی گھر گھر۔۔۔۔۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ آخر تین بج گئے، میرے دوسرے بڑھتے گئے۔ نہیں۔ وہ نہیں آئے گی۔۔۔ جیہ نے سے گہمت کے سارے منصوبے کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ وہ گہمت سے بھی ہاراض ہو گئی ہوگی۔ ہمیں ایسا منصوبہ بنانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ یہ سب غلطی ہی میری ہے۔

جانے دس میں کیسے کیسے وہم آنے لگے تھے۔ سو اتنی بجے تک تو میرا ممبر بھی جواب دے گیا۔ منیں نے گھبرا کر وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی منیں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے، دُور برآمدے کے موز سے کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور چند سوانی ہنسی اور ہاتوں کے جلتے تک سے دُور سے بچتے سنائی دیے۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔ یہ تو ہی کے قدموں کی چاپ ہے۔۔۔۔۔ خدا۔۔۔۔۔ مجھے ہمت عطا کر۔۔۔۔۔

اچانک دروازہ کھلا اور سب سے آگے گہمت اور اس کے پیچھے ایمان اور اس کے پیچھے جیہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ گہمت نے مجھے دیکھ کر مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ حماد بھئی آپ۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ اس وقت؟“ میری توقع کے عین مطابق ایمان کے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی ہی پھیل گئی۔ اُس نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا اور فوراً جانے کے لیے پلٹی، لیکن جیہ اس کے سامنے اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی لہذا اس کا راستہ رک گیا۔ گہمت نے بھی جاتی ایمان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”شاید تمہاری دوست کو میری یہاں موجودگی کچھ پسند نہیں آئی۔ میرا خیال ہے مجھے یہاں نہیں رکنا چاہیے۔“ ایمان نے گھبرا کر پھر سرائٹھ کر میری طرف دیکھا۔ گہمت نے اُسے نظروں نظروں میں ہی گھورا، پھر جلدی سے بولی۔

”نہیں نہیں بھئی۔۔۔۔۔ ہم تو دراصل یہاں کچھ پرانی کتابیں دیکھنے آئے تھے۔ دراصل ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون ہے تاہیں اسی لیے۔۔۔۔۔“

اب ایمان نے گہمت کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، لیکن گہمت نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا۔

”ضرور۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ آپ لوگ کتابیں دیکھتے۔۔۔ میں ابھی حاضر ہوا۔“ میں جلدی سے اسٹڈی سے نکل گیا۔ مجھ میں اس کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ آج اُس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور کالے دوپٹے میں کچھ زیادہ سی غصہ ڈھاری تھی۔ وہ وہ کر میری آنکھوں میں اس کی رزقی پلکیں اور کانپتے ہونٹوں کا منظر ابھر رہا تھا اور اس کی وہی ایک پریشان سی لٹ۔۔۔۔۔

باہر برآمدے میں کچھ دیر کھڑا میں اپنے حواس قابو میں لانے کی کوشش کر رہا۔ سارا معاملہ ہی الٹ پٹ ہو گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں کسی بہانے گہمت کو حیا سمیت چند گھرہوں کے بیے باہر برآمدے میں بھیج دوں تا اور ایمان سے بات کر لیتا لیکن اُسے دیکھ کر میں سب بھول کر خود ہی باہر نکل آیا تھا۔ مجھے اپنے اوپر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ شاید اب دوبارہ اس سے بات کرنے کا کبھی موقع نہ مل سکے۔ شاید میں یہ بازی ہمیشہ کے لیے ہار چکا تھا۔ اتنے میں اسٹڈی کے دروازے کی طرف کچھ آہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ گہمت دروازے سے دبے پاؤں نکل رہی تھی۔ اس نے مجھے غصے سے بھرے اشعاروں میں پوچھا کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ جواب میں میں صرف کاغذ سے اچکا کر رہی رہ گیا۔ پھر گہمت نے اندر حیا کو کچھ اشارہ کیا اور حیا بھی باہر نکل آئی۔ میں اب بھی گم سم اور گنگ سا وہیں کھڑا تھا۔ گہمت آگے بڑھی اور میری گدی پر تمام کر بیٹھ کر مجھے اسٹڈی کے دروازے تک لے آئی اور مجھے اندر دھکا دیتے ہوئے اُس نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”صرف تین منٹ۔۔۔۔“

میں گھبرایا ہوا سا گہمت کے دھکے کے زور میں اسٹڈی کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ایمان دور آفری الماری کے قریب کھڑی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ آہٹ ہوئی تو اُس نے بے دھیانی میں ہلٹ کر دیکھا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ گہمت اور حیا دونوں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی ہیں اور ان کی جگہ اب میں دروازے پر کھڑا ہوں۔ گھبراہٹ کے مارے اس کے ہاتھ سے کتاب نیچے گر گئی۔ اس نے سر کا پلو جلدی سے ٹھیک کیا اور باہر جانے کے لیے لپکی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت یہ تھا کہ اسٹڈی میں آنے اور جانے کا صرف ایک ہی بڑا سا دروازہ تھا جس کے پتھر بیچ میں اس وقت کھڑا تھا۔ جس قدر تیزی سے اُس نے قدم بڑھائے تھے۔ اتنی ہی جلدی اُسے رکن بھی پڑ۔ بے بسی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور وہ سر جھکائے، ہنسا کچھ کہے کمرے کے بیچ دوڑ کر کھڑی تھی۔ شاید اُسے گہمت اور حیا پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا اور ان کی منصوبہ بندی بھی اب اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ چند لمبے ہم دونوں خاموش رہے اور صرف ہمارے درمیان موجود خاموشی بولتی رہی۔ مجھے اس کی سانسوں تک کی آواز اس سناٹے میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنی ہمت جمعیت کی اور اس کی آواز کا سر کمرے میں بکھرا۔ اس کے وجود کی طرح اس کی آواز بھی رز رہی تھی۔

”میں باہر جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔ آپ راست چھوڑ دیں۔“ میں نے پہلی مرتبہ اس کے منہ سے اتنے بہت سے لفظ اکٹھے سنے تھے۔۔۔۔

کچھ دیر تو میں بالکل مبہوت سا کھڑا رہا۔ پھر یکایک جیسے مجھے ہوش آیا۔

”آپ کا راستہ اس طرح روکنے کی معافی چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میری یہ حرکت تمام عمر کے لیے مجھے آپ کی نظروں سے گر۔“



وے۔۔۔۔۔ لیکن یقین جانئے۔۔۔ میں نے بہت مجبور ہونے کے بعد یہ قدم اٹھایا ہے۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ مجھے غلط نہ سمجھئے۔“

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ مجھے جانے دیجئے۔۔۔ خدا کے لیے۔“

اُس کی آواز اب بھرانے لگی تھی۔ آنسوؤں کا ارتعاش اس کی پلکوں کے گرد جمع ہو کر چھلکنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

”میں صرف آپ سے اتنا کہتا چاہتا ہوں کہ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ میرا آپ میرا اپنا نہیں رہا۔ میرے پاس شاید وہ لفظ ہی نہیں ہیں جن سے میں اپنی کیفیت آپ پر ظاہر کر سکوں۔۔۔۔۔ میرے جذبے کے لیے اس وقت دنیا کی سبھی ڈکشنریوں میں موجود ہر لفظ مجھے عیاں نہ لگ رہا ہے۔ شاید میری طریقہ بھی بے حد عامیانہ اور ہلکا ہے لیکن میں کیا کروں۔۔۔۔۔ میرے پاس اور کوئی ذریعہ تھا بھی نہیں۔ یہ میری اور میرے دل کی شدید مجبوری ہے جس نے مجھے آپ تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ایسا کراہو راست اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔“

وہ اب بھی یونہی خاموشی سر جھکائے کھڑی نیچے کچھے قالین میں نظریں گاڑے ہوئی تھی۔ اس نے پھر دہی بات دہرائی۔

”آپ نے اپنی بات کہ دی۔۔۔۔۔ اب مجھے جانے دیں۔۔۔۔۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔“

”مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔“

میں اس کے رستے سے ہٹ گیا۔ وہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح وہاں سے اپنا نازک وجود سنبھالتی ہوئی نکل گئی۔ بس اس کی خوشبو کمرے میں بکھری رہ گئی۔ میں نے باہر کے برآمدے کی طرف اسٹڈی کی کھینے والی کھڑکی میں اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھٹ اور حیار کے پاس بڑے بغیر گئے بڑھ گئی۔ گھٹ اُسے آوازیں دیتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی۔ حیار کی نظر کھڑکی سے ہوتی ہوئی مجھ پر پڑی اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے آداب کیا اور پھر وہ بھی ایمان کے پیچھے بھاگ گئی۔ مجھے اس لمحے حیا بہت اچھی لگی۔ اس لڑکی نے ایک انجانے انسان پر اعتبار کر کے اپنی جان سے پیاری بہن کو اس سے ملنے بھیج دیا تھا۔ جانے گھٹ نے اُسے کس طرح میرا اعتبار دلایا ہوگا۔ بہر حال جو بھی تھا، فی الحال تو گھٹ اور حیا دونوں کی ہی خبر نہیں تھی۔ ظاہر ہے ایمان ان سے شدید ناراض ہو گئی ہوگی۔ جانے اب وہ دونوں اسے کس طرح منائیں گی۔

میں بہت دیر تک اس کمرے میں یونہی محرومہ سا بیٹھا رہا۔ جانے کیوں وہاں سے باہر جانے کے لیے میرا دل ہی نہیں مان رہا تھا۔ میں بار بار اس منظر کو آنکھیں بند کر کے محسوس کرنا چاہتا تھا جب وہ ناز بیکر یہیں اس کمرے میں سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا نازک وجود کسی بچے کی طرح لرز رہا تھا، اور وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔

دھوپ ڈھل چکی تھی اور اب روشن دان سے اندر چھننے والی روشنی میں وہ حدت باقی نہیں تھی۔ میری کھڑکی پر نظر پڑی تو شام کے سڑھے پانچ بج رہے تھے۔ بادل خواست میں وہاں سے اٹھا۔ اچانک میری نظر اس کتاب پر پڑی جو ایمان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کتاب اٹھائی۔ بانو قدسیہ کی ”رہا گدھ“ تھی۔ اچانک میری نظر کتاب کے پاس ہی پڑے دو چھوٹے سے موتیوں پر پڑی۔ ایسے موتی تو میں نے ایمان کے سینڈل میں لگے دیکھے تھے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کی نظر پور وقت زمین میں

گڑی ہوئی تھی اور میری نظر بھی اس کے نظر کے تعاقب میں اس کے قدموں کی طرف کئی بار اٹھی تھی۔ ضرور جب اس کے ہاتھ سے کتاب گری ہوگی تو اس کے قدموں سے ٹکرائی ہوگی۔ تبھی یہ موتی عیدہ ہو کر گر پڑے ہوں گے۔ میں نے وہ دونوں موتی اٹھ کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔

اب نگہت کا انتظار کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ مجبوراً میں نونے قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ رات بھر میری چمکوں تلے وہ سارے منظر کسی فلم کی طرح چلتے رہے۔ میری حالت اس نالائق حالب علم کی تھی جو پرچے میں ایک بھی سوال ٹھیک طرح سے حل کر کے نہ آیا ہو لیکن پھر بھی 'سے نتیجے کا بے چینی سے انتظار ہو۔

کبھی کبھی ہم زندگی میں کچھ ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہمیں نتیجے کی کیفیت سے زیادہ نتیجہ کا پتہ چل جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا یا مخالفت میں، بس فیصلہ ہو جانے کی تمنا ہوتی ہے۔ عام طور پر یہاں کمزور اعصاب والوں کے ساتھ ہوتا ہے جو انتظار کی اذیت اور جھمن کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ذہنی دباؤ کے ہاتھوں تنگ آ کر دھائی دینے لگتے ہیں کہ بس جو بھی ہوتا ہے وہ آج ہی ہو کر رہے۔ ایسے لوگ اس وقت اس بات سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کہ جس نتیجے اور جس فیصلے کا اپنی مخالفت میں ملے ہو جانے کا خیال ہی انہیں اس قدر ہلکان کر رہا ہے کہ وہ بے چینی سے اس کے اعلان کی دعائیں کر رہے ہیں، وہ فیصلہ اعلان ہونے کے بعد جب واقعی ان کے حق میں نہیں ہوگا تو تب ان کا کیا حشر ہوگا۔۔۔؟

میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی اس رات۔ مجھے ایمان کے فیصلے کا انتظار تھا اور نہیں ایک ایسے کرب سے گزر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، بس مجھے جلد از جلد اس کا فیصلہ سنائی دے دیا جائے۔ شاید اس جلد بازی میں میرے دل کی ایک اور چوری تمنا کا بھی عمل دخل تھا۔ میرا دل اس وقت کسی طور بھی اس دلبر کی طرف سے کسی ریلے، کسی کلام کی خواہش میں ٹپل رہا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پہ بس میرا نام آئے۔۔۔ چاہے، برسرِ الزم ہی آئے۔ جانے عشق میں یہ دل ایک چھوٹے بچے کی طرح کیوں برتاؤ کرنے لگتا ہے۔ عشق میں دل کو صرف اسی پل، اسی لمبے، اسی دن کی فکر ہوتی ہے جو گزر رہا ہوتا ہے۔ مستقبل کا ڈر، خوف یا دوسرے اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ عشق کو بس حال سے غرض ہوتی ہے۔ عشق انجام سے بے خبر اور لاعلم ہوتا ہے۔

جانے وہ رات کیسے ڈھلی اور کب صبح ہوئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اڑ کر نگہت کے پاس پہنچ جاؤں، وہاں سے کل کی تمام روداد پوچھوں، کرید کرید کر سوال کروں، لیکن روز روز یوں بے انانی حویلی جاتا بھی تو کچھ ٹھیک نہ تھا۔ نگہت میری منہ بولی بہن ہی سہی لیکن آس پاس حویلی کے دوسرے نوکر چاکر بھی تو تھے۔ جانے وہ میرے روز روز کے یوں وہاں آنے اور نگہت سے تنہائی میں مٹے کو کیا رنگ دیں۔ پھر نہیں نے خود ہی ان فضول خیالات کو سر سے جھٹک دیا۔ یہ نہیں کیا سوچ رہا تھا، یہ بے بنیاد سے وہم میرے اندر کہاں سے پلنے لگے تھے۔۔۔؟ شاید محبت انسان کو اپنے اوپر شک کرنا بھی سکھ دیتی ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے شا کر مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے کمرے تک آن پہنچا۔ میں ابھی تک کمرے میں ہی بند تھا صبح سے، شا کر نے مجھے نگہت کا دہانہ ایک بند لفظ تمھارے اور حسب معمول پوچھا۔۔۔۔۔ "بابا۔۔۔۔۔ کل آپ حویلی گئے تھے۔۔۔۔۔ کچھ کام تھا کیا۔۔۔۔۔؟"

حال نہ شاکر نے اپنے معمول کے مطابق عام سا سوال ہی کیا تھا لیکن جانے کیوں میں گڑبڑ اُسا گیا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔  
 ہاں۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ خاص نہیں۔۔۔۔۔ غبت سے کچھ کتابیں نکالنے کا کہا تھا سنڈی سے۔۔۔۔۔ وہی مینے کیا تھا۔۔۔  
 شاکر نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”دیکھیں حد دہا۔۔۔۔۔ اُسر آپ نے غبت کو مزید غنی کتابیں دلوائیں تو میں بہت ناراض ہو جاؤں گا۔ ضرور اس نے اس لفافے میں نئی کتابوں کی فہرست بھیجی ہوگی۔“

مجھے شاکر کے انداز پر ہنسی آگئی۔ جانے وہ کیا سمجھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اس مینے میں غبت کو مزید کوئی کتاب نہیں دواؤں گا۔ شاکر کے جاتے ہی میں نے بے تابی سے فوراً لفافے کو چاک کیا اور اندر سے غبت کا خط نکال۔ میری بے چین نظریں خط پر پھسلنے لگیں بلکھا تھا۔

”بھیا جی۔۔۔۔۔“

نہ پھنسیا آپ نے، وہ مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ بہت ناراض ہو کر گئی ہے یہاں سے۔ اپنی چھوٹی بہن سے بھی بات نہیں کر رہی تھی۔ میں نے آپ کو کہا تھا تاکہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔۔۔۔۔ بہر حال جو ہو اسو ہوا۔۔۔۔۔ آج میں اُس کے گھر جاؤں گی اور میں اور حیا ر سے مل کر منہای لیں گے۔۔۔۔۔ لیکن آپ کے مقدمے کا کیا فیصلہ دیتی ہے۔ یہ اب خدا ہی جانے۔ میری مائیں تو آپ اپنے گھر والوں سے بات کر کے اُس کے گھر بھیجیں۔۔۔۔۔ اس سے آپ کی سچائی بھی اس پر واضح ہو جائے گی، ورنہ وہ ان ٹریوں میں سے نہیں ہے جو ہاکی رشتے کے ایسا کوئی تعلق جوڑے۔۔۔۔۔ خوش رہیں۔“  
 اس چھوٹے سے خط میں غبت نے وہی سب کچھ لکھا تھا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میں وہ چند سطور پڑھ کر بے حد اُداس اور پہلے سے کہیں زیادہ بے چین ہو گیا۔ وہی ہوا، پہلے نتیجہ آنے کی بے چینی تھی اور اب فیصلہ سننے کے بعد کی بے تابی۔  
 نا اس کروٹ لیکن تھا، شا اس کروٹ آرام۔

لیکن انسان کی قدرت میں قدرت نے اُمید اور آس کی ڈور سے ہمیشہ بندھے رہنے کا ایک عجیب سا انتظام کر رکھا ہے۔ ایک ڈور ٹوٹی ہے تو وہ دوسری تمام دیتا ہے۔ دوسری ٹوٹی ہے تو تیسری۔۔۔۔۔ یوں یہ سلسلہ اس کی سانس کی ڈور ٹوٹنے تک چلتا ہی رہتا ہے۔ شاید قدرت نے انسان کی طبیعت میں یہ آس اور اُمید کا سلسلہ نہ رکھا ہوتا تو وہ پہلی نا اُمیدی پر ہی ختم ہو جاتا، یوسی سے مر جاتا۔  
 میں بھی ایک نئی آس اور اُمید میں مبتلا ہو گیا کہ غبت اور حیا جب اس مدد جیں کو منائیں گے تو شاید تب اُسے میرے حال پر کچھ رحم آجائے۔۔۔۔۔ شاید وہ کچھ کہے۔

اب میری دھڑکنوں کو اس کی طرف سے کسی پیغام کا انتظار تھا۔ مجھے اس انتظار کی سولی پر ابھی حریہ کچھ روز لٹکنا تھا۔۔۔۔۔

☆☆☆

## زور لندن

لندن کی شام آگروں بھر دھوپ نکلنے کے بعد ہو تو شاید ہی اس سے حسین شام دنیا کے کسی اور خطے پر اترتی ہوگی۔ اور گرم موسم خزاں کا ہو تو پھر تو سونے پہ سہاگہ والی بات ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سرخی کا رنگ تھا اور زمین پر خزاں میں جلے سرخ چٹوں نے جیسے اک آگ سی لگائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی معذرت کرنے صرف سرخ اور زرد رنگ کی آمیزش سے کیوں پر ایک خوبصورت تصویر بنا ڈالی ہو۔

میں اور کامران اس رور ہائیڈ پارک سے شہر کی طرف جاتی ہوئی سنسان سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ سڑک دونوں طرف سے کھٹے پتیل کے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جس کے خزاں رسیدہ پتے ہوا سے ہمارے سروں پر یوں گر رہے تھے جیسے کسی دوسلے کے سہرے پر پھول پھجا کر کیے جاتے ہیں۔ سردی کی شدت نے ہم دونوں کو اپنے اپنے اور کورٹ گلے تک بند کرنے اور ان کے کاروائی نے پر مجبور کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے جمی ہوئی برف کے ڈھیر و ڈھیر سے پگھل کر ساتھ بنی لوہے کی جالیوں سے ڈھکی نالیوں میں ایک بدمعس سے شور کے ساتھ گر رہے تھے۔ قریب ہی ایک جزا سردی سے بے نیاز، وہاں کھڑی آئس کریم گاڑی سے اپنی پسند کی کون آئس کریم غوار ہاتھ بیچ رہے تھے، آئس کریم کھانے کا حذر تو شدید سردی میں ہی آتا ہے۔ لڑکی اپنے پاس میں خود بھی اس وقت کوئی رنگ برنگی آئس کریم ہی لگ رہی تھی۔ لڑکے نے جانے اسے کیا کہا، دونوں ایک ساتھ زور سے ہنسنے۔ کامران نے حسب معمول بڑا سامانہ بنایا اور لندن کی تمام حسین اور جوان لڑکیوں کی عقل کا ماتم کیا۔ زور کہیں سورج ڈھل رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ سڑک ہمیں سیدھے آس ڈوپتے سورج کے گولے کی طرف ہی لے جا رہی ہو۔

"کچھ بھی ہو یا رمیزی۔۔۔۔۔ مجھے اس بہودن کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔ تم یہاں سکون کی تلاش میں آئے ہو۔ میں تو کہتا ہوں چھوڑو یہ پڑھائی وڑھائی کا چکر، میں بھی کچھ دن آف لیتا ہوں اور لکھتے ہیں سنسز لینڈ کی طرف۔ کچھ نئی محبتوں کی تلاش میں۔۔۔۔۔ ہوس۔۔۔۔۔ کیا بولتا ہے۔"

میں جانتا تھا کامران کس قسم کی نئی محبتوں کی تلاش میں نکلتا چاہتا تھا۔ "سدرہ جاؤ مسٹر کامران۔ تمہاری پتی حرکتوں کی وجہ سے تین لڑکیوں کا قاعدہ ساں ساں تک تمہاری مکتی ترہنے کے بعد تمہیں چھوڑ کر جا چکی ہیں اب تک، اب کیا ذلیل بیسٹ ٹرک کا ارادہ ہے۔"

ہم چوک پر بنے ہوئے بڑے سے فوارے کے پاس پہنچ چکے تھے جس کے درمیان ایک بڑے سے لوہے کے بنے شیر کے منہ سے خون کی دھاروں کی بجائے پانی کی پھواریں نکل رہی تھیں۔ البتہ اس وقت شدید سردی کی وجہ سے دوچار دھاریں جم کر باقاعدہ برف کی پتی کمانوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ "خری ٹرام نکلنے ہی والی تھی۔ ہم دونوں باقاعدہ دوڑتے ہوئے پیلے رنگ کی ٹرام جس پر بڑی سے مال لکیریں ڈلی ہوئی تھیں، میں سوار ہو گئے۔ اندر ایک چچی عجیب سے گھبراہٹا لباس میں باقی لوگوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کامران کو اور کامران اسے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے حیرت سے کامران کی طرف دیکھا۔

”تم اسے جانتے ہو۔“

”نہیں۔۔۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو مجھے جانتی ہے، تمہی تو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔“ اتنے میں چھپی نے واہانہ انداز میں ہاتھ پھیلائے اور کامران کی طرف بڑھی۔ کامران کے دل کی کلی کی طرح اس کا چہرہ بھی کھل گیا اور اس نے بھی ہاتھ پھیلا دیے۔ چھپی ہم دونوں کے درمیان میں سے ہوتی ہوئی ہمارے پیچھے کھڑے لمبے بالوں والے ایک میلے سے ہنسی کے گلے جا گئی، کامران ویسے ہی بازو پھیلائے کھڑا رہ گیا۔ مجبوراً مجھے ہی اسے گلے لگانا پڑا۔ چند لمحوں تو وہ حیرت اور غصے کے عالم میں ہی گنگ سا کھڑا رہ گیا اور پھر ہم دونوں ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ٹرام اپنی مخصوص دھیمی سی رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

کچھ لوگ محبت کو زندگی میں سب سے خالص جذبہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں سچی محبت سے زیادہ خاص جذبہ کوئی اور ہونی نہیں سکتا۔ اتفاق سے میں اور کامران دونوں ہی اس نظریے سے متفق نہ تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی ہم دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔

میں نفرت کو دنیا کا سب سے مکمل اور خالص جذبہ سمجھتا تھا، محبت میں تو پھر بھی کہیں کچھ ملاوٹ، کچھ کھوٹ ہو سکتا تھا، لیکن نفرت ہٹا کسی کھوٹ اور ملاوٹ کے ہوتی ہے۔ بالکل اصل، شدید اور خالص۔۔۔۔۔ جب کہ کامران کے خیال میں ”ہوس“ دنیا کا سب سے سچا جذبہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان صرف ہوس کے معاملے میں ہی خالص اور سچا ہوتا ہے۔ باقی سب جذباتوں میں وہ کہیں نہ کہیں لاندی ماری جاتا ہے۔ چاہے محبت ہو یا چاہے نفرت لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ چاہے محبت ہو یا نفرت، چاہے عشق ہو یا پھر صرف ہوس۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ چاروں ایک ہی جذبے کے چار رخ دکھائی دیتے تھے۔ محبت کی بنیاد پر نفرت کرنے والے یا عشق کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اپنی ہوس ٹھپانے والے مجھے ہمیشہ ہی سے منافق لگتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کھلے عام ہوس کا رشتہ رکھنے والے ہی اصل میں بہادر اور سچے لوگ ہوتے ہیں۔ شاید ہوس ہی دنیا کا ازلی اور شاید ابدی رشتہ ہوتا ہے۔ اور ہم سب بھی ایسے ہی کسی رشتے کی پیداوار ہیں۔

کامران نے رات سونے سے پہلے پھر مجھے سر آنک کی بیٹی مس جیریز کے ساتھ اٹھنے سے منع کیا۔ دراصل اسے بچپن سے میری ایک خاص عادت کا بہت چھی طرح سے اندازہ تھا۔ میں کسی ایک خاص حد تک ہی چیزوں کو ٹال پاتا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ معاملہ میرے دماغ کی رگوں پر سوار ہونے لگتا تو پھر میں اپنے نفع و نقصان کا احساس نہلا کر اس معاملے کو سدھارنے کے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ کامران جانتا تھا کہ میں یہاں اپنے ماضی کی پرچھائیوں سے بچھا چھڑانے کے لیے آیا ہوں لہذا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی قسم کا تاؤ برداشت کروں۔ لیکن شاید قدرت اس وقت کامران کی خواہش کے حق میں نہیں تھی۔

اگلی صبح میری پہلی مڈ بھیڑی مس جیریز سے ہو گئی۔ یونیورسٹی کے معاملے میں جوزف ندی کنارے اپنی پسندیدہ جگہ پر کھڑا پرندوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اُس نے مجھے زور سے آتے دیکھا تو دو جین سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلانے لگا۔ میری کلاس میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ سوچا دو گھنٹی جوزف سے بیہواہ نہ کروں۔ میں جوزف کی طرف بڑھنے کے لیے جیسے ہی لکڑی کے بنے ہوئے اس بل پر چڑھا جو ندی کے دونوں کناروں کو



ملانے کے لیے بنا ہوا تھا۔ تو اچانک دوسری طرف سے سارہ اپنے چار دوستوں کے گینگ کے ہمراہ اس پل پر چڑھ آئی۔ اس کے دوستوں میں دوڑ کے اور دوڑ کیوں شامل تھیں اور یہ سب میری ہی کلاس کے اسٹوڈنٹ تھے۔ سارہ نے قریب سے گزرتے ہوئے عبرانی زبان میں کچھ کہا۔ وہ شاید اس بات سے بے خبر تھی کہ متروک زبانیں کبھی میری خاص دلچسپی کا حامل ہوا کرتی تھیں۔ جیسے لوگوں کو نکلت جمع کرنے، سکے اکٹھے کرنے مصوری کرنے کا شوق ہوتا ہے، اسی طرح کبھی میرا واحد شوق دنیا کی پرانی زبانوں کے بارے میں جانتا تھا۔ یہ شوق مجھے دادا جان سے منتقل ہو تھا۔ ہماری پرانی حویلی کی باغیچہ پریری اور سنڈی میں اب بھی اس طرح کی کئی قدیم کتابوں کے نسخے محفوظ تھے۔ جن میں تورات اور زبور کے قدیم نسخے بھی شامل تھے۔

اسی لیے مجھے سارہ کی کبھی بوٹی بات سمجھ میں آگئی۔ اُس نے میرے مذہب کے بارے میں کوئی غلط بات کہی تھی۔ لیکن انگریزی کے بجائے عبرانی زبان اس نے شاید اس لیے استعمال کی تھی کہ متعہد شاید مجھے چوٹ پہنچانے سے زیادہ اپنے دوستوں سے داد و صوص کرنا تھا۔ میں بھی اتنی عبرانی تو بول ہی سکتا تھا، سو میں نے بھی عبرانی میں ہی اسے جواب دیا۔

”کوئی مذہب کسی دوسرے کے مذہب پر کچھ اُچھالنے کی اجازت نہیں دیتا، اور کچھ اُچھالنے والے دراصل خود اپنے مذہب کو ہی گالی دے رہے ہوتے ہیں۔“

میری بات سنتے ہی چند لمحوں کے لیے سارہ گنگ سی رہ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کی بات سمجھ جاؤں گا۔ نہ صرف سمجھوں گا بلکہ اُسے اس کی زبان میں ہی جواب بھی دوں گا۔ اس کے گروپ میں سے ایک لڑکا جو شاید عبرانی نہیں جانتا تھا جلدی سے سارہ کے قریب آیا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ میں نے اس سے کیا کہا ہے۔ سارہ اب بھی خاموش کھڑی تھی۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ دوسرا لڑکا میرے راستے میں آکھڑا ہوا اور میرا دستہ بند کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک دوسرے کے سامنے کھڑے خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اک دو جھکے ہوئے رہے۔

جوزف جو اب تک دُور کھڑا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ شاید معاملے کی سنگینی کو محسوس کیا، اسی لیے وہ تیز تیز قدموں سے ہماری طرف چلا آیا اور دُور ہی سے چلا کر کہنے لگا ”ہے حماد مین تم کہاں ہو۔۔۔؟ جلدی یہاں آؤ۔۔۔۔۔ مجھے شتم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

جوزف چونکہ اسی یونیورسٹی کا ایک نمبر تھا لہذا اُس کے سامنے ان لڑکوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ میں بھی سامنے کھڑے لڑکے کو ہٹ کر جوزف کی طرف بڑھ گیا۔ سارہ کا گروپ بھی دوسری جانب چلا گیا۔

جوزف نے پریشانی سے مجھے دیکھا۔

”کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ تمہیں۔“

”کچھ نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تائن الیون کے بعد یہ مذہبی تعصب ان بڑی یونیورسٹیوں تک پھیل چکا ہے۔“

”ان لوگوں سے نہ ہی اُلجھو تو بہتر ہے۔ یہ سب ہی یہاں کے اُنچے درجے کے یہودی امراء کے بچے ہیں۔ تمہارے لیے کسی بھی وقت کوئی مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔“

میں اور جوزف چلتے ہوئے اپنے مخصوص شیجر پر جا بیٹھے۔ ہمارے ارد گرد کبوتروں کا ایک غول دانہ چک کر ایک زوردار آواز کے ساتھ اڑا رہی بھر گیا، اور اس کی جگہ نئے کبوتروں نے لے لی۔

”میں کسی سے الجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن جانے یہ لوگ کیوں ہر بار میرا راستہ کاٹ جاتے ہیں۔ جانے انہیں مجھ سے کیا پر خاش ہے۔“

جوزف نے خاکی کاغذ کے لفافے سے کبوتروں کا دانہ نکال کر فضا میں اچھال دیا۔ ”میں جانتا ہوں تم اپنے کام سے کام رکھتے ہو، مذہبی تم نے کبھی ان لوگوں سے از خود اُٹھنے کی کبھی کوئی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ لوگ اس یونیورسٹی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور یہاں کے اسٹوڈنٹس کو اپنی رعایا۔ اور تم رعایا کے جملہ حقوق پر پورے نہیں اتر رہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔ رعایا کے جملہ حقوق پر کیسے پورا اترنا جاسکتا ہے۔“

”در اصل تمہارے انداز میں تمہاری چال و حال میں اور تمہارے بات کرنے کے انداز میں ایک خاص متانت، ایک خاص غور و رس ہے۔ تمہاری شخصیت میں مرحومیت کی ذرا بھی جھلک نہیں ہے۔ اور یہی بات ان سب کو کھلتی ہے۔ جو شخص ان سے مرحوب نہ ہو۔ ان کے سامنے تن کر چلے۔ یہ بھلا اُسے کہاں برداشت کر سکتے ہیں۔“

مجھے حیرت آگیا۔

”مرحوب ہونے یا ان سے دہنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔۔۔۔۔ میں کسی خیراتی سکارشپ پر تو یہاں آیا نہیں ہوں۔ ہزاروں پونڈ فیس بھری ہے۔ اس یونیورسٹی کا میرٹ نیٹ پاس کیا ہے۔ بلکہ میں شاید یہاں پر موجود ہر اسٹوڈنٹ سے زیادہ ڈنیشن اور فیس دیتا ہوں کیونکہ مجھے انٹرنل سیٹ پر یہاں داخلہ دیا گیا ہے۔ پھر بھلا میں کسی کے رعب میں کیوں آؤں؟“

”تمہارے اسی ڈنیشن اور تمہاری اسی بھاری فیس نے ان یہودی ساہوکاروں کے منہ بند کر رکھے ہیں۔ تم ان کے لیے ایک سونے کی کان ہو جسے یہ اپنی انا کے ہاتھوں کھو نہیں سکتے۔۔۔۔۔ نر امت ماننا۔۔۔۔۔ یہ تمہاری قابلیت نہیں تھی جس کی وجہ سے تمہیں یہاں داخلہ ملا۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تمہاری بینک بیلنس کی ٹیٹ جو تمہارے ریکارڈ کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اُس نے تمہیں اس یونیورسٹی تک پہنچایا ہے۔“

میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”یہ سب آپ کو کیسے پتہ چلا؟“

”تم نے شاید غور نہیں کیا۔۔۔۔۔ یہاں گئے گئے پچھے مسلمان اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ تر برائے نام مسلمان ہیں۔ جو یہاں کی تہذیب میں رل مل کر اپنا اور دوسروں کا فرق مٹا چکے ہیں۔ باہر سے صرف تہی ہو۔ یہ یونیورسٹی داخلہ دیتے وقت سات شجروں تک حسب نسب کٹگانے کی عادی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے شجرہ نسب میں انہیں کوئی قابل فکر چیز بھی نہ ملی ہو۔“

میں نے چونک کر جوزف کی جانب دیکھا، یہ بات تو اس نے چاہے انجانے میں ہی کہی۔ لیکن بالکل ٹھیک کہی تھی۔ میرے دادا، پرداد برٹش گورنمنٹ کے خاص وقادار اور وظیفہ خوار روپے تھے، ہماری سات نسلوں میں کوئی باقی پیدا نہیں ہوا تھا۔

میں نے غور سے جوزف کو دیکھا۔

”لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ بھی تو اسی یونیورسٹی کی انتظامیہ کا ایک حصہ ہیں۔ پھر انتظامیہ کے یہ راز مجھ پر کیوں

کھول رہے ہیں۔“

جوزف مسکرایا۔

”میں خود بھی اس بات پر کبھی کبھی بہت حیران ہوتا ہوں کہ آخر تم میں ایسی کیا بات ہے جو اپنا اپنا لگنے پر مجبور کرتی ہے۔ تم اور وہ سے

مختلف کیوں دیکھتے ہو؟۔۔۔ شاید اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تم نے کبھی ٹوٹ کر کسی سے محبت کی ہے۔۔۔ اور میرے دل میں محبت کرنے

والوں کا بہت اونچا مقام ہے۔۔۔ بہت اونچا۔“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”گویا آپ نے بھی کسی سے کبھی محبت کی ہے۔۔۔ لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے کبھی ٹوٹ کر کسی کو چاہا ہوگا۔۔۔؟ ہو

سکتا ہے میں محبت کے نام سے بھی واقف نہ رہا ہوں۔“

”ناممکن۔۔۔ تمہاری آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔۔۔ ان کی گہرائی میں محبت کے کتنے راز، کتنے درد چھپے ہیں۔۔۔ یہ شاید تم

خود بھی نہیں جانتے۔۔۔ محبت، انسان میں ٹھہراؤ لے کر آتی ہے۔۔۔ وہ اوپر سے جتنا بڑا سکون نظر آتا ہے، اندر سے اتنا ہی بے چین ہوتا

ہے۔۔۔۔۔ تم بھی ایک ایسی خاموش اور بڑا سکون سمندر ہو۔۔۔ جو اپنے اندر ہزاروں طوفان چھپائے بیٹھا ہے۔“

میں نے ایک لمبی سی سانس لی۔۔۔ تو گویا اب یہ دل کے راز میرے چہرے سے بھی عیاں ہونے لگے تھے۔۔۔۔۔ کہیں

جاؤں۔۔۔۔۔؟ کیسے چھپاؤں اپنے اس کرچی کرچی دل کے آئینے کو۔۔۔۔۔؟

میں اور جوزف یونٹی خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارے سامنے نہر میں پانی بہنے سے فضا میں اک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ ہمارے آس

پاس کبوتروں اور دانے چتے پرندوں کی جلی جلی آوازیں تھیں۔ سرد ہوا میری آنکھوں سے ٹکرائی تو مجھے پتہ چل گیا کہ میری آنکھوں کے گوشے ہریک چمکے

ہیں۔ میں نے ٹوٹ کی جیب سے گہرا کالا چشمہ نکال کر پہن لیا۔ دل کے راز جب دل میں ہی رہیں تو اچھا ہوتا ہے۔۔۔ لیکن جب یہ آنکھوں سے

بہہ کر چھٹکے لگیں تب ان پر پردہ ڈال بیٹھی بہتر ہوتا ہے۔

☆☆☆

## محبت کی دو پہر

محبت انسان پر دھوپ کی طرح دھیرے دھیرے اُترتی ہے، جون، جولائی میں کسی صحرائی تپتی دھوپ کی طرح۔ جس کی حرارت کا مچ کے پہلے پہر میں انسان کو اتنا پتہ نہیں چلتا، لیکن جیسے جیسے محبت کی دو پہر قریب آتی ہے، بے چینی اور ٹھنکن سے انسان کا اندر اُجال ہونے لگتا ہے۔ پیاس سے طلق میں کانٹے اُگ آتے ہیں۔ دم لہوں پر آ کر اُٹک جاتا ہے، اندر جان جسم کے اندر رہتی، نہ پوری طرح جسم سے باہر نکلتی ہے۔

مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میں ایمان کی محبت کے پہلے پہر سے نکل کر اس محبت کی دو پہر تک جا پہنچا تھا۔ مجھے تو اس کی محبت کے پہلے پہر کا سکون بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب تک میں اس محبت ابتدائی کے جھٹکے سے سنبھلا، تب تک اس کی محبت کی کڑکٹی دو پہر میرے سر پر موجود تھی۔

اس دن حویلی کی سٹڈی میں روکے جانے پر اور اس سازش میں اپنی عزیز ار جان سبکی اور اپنی بہن کے شریک ہونے پر وہ اس قدر براہم تھی کہ اُس نے کئی روز تک اپنی بہن حیا اور نگہت سے بات نہیں کی۔ لیکن نگہت بھی اپنی دھن کی پکی تھی۔ دو ہا قاعدہ دھرتا دے کر ایمان کے گھر کے کچے مچن میں جا بیٹھی کہ جب تک مجھے معاف نہیں کر دیں، میں یہیں بیٹھی رہوں گی۔ ایمان کی اماں نے پہلے نگہت کو اور پھر ایمان کو ڈھکیاں دیں کہ گھر کے مردوں کی وہی کا وقت ہے، خدا کے لیے ان دونوں کے درمیان جو بھی جھگڑا ہے ختم کر دیں۔ خاص طور پر ہمیں مولوی صاحب کا وقت۔ اگر وہ گھر آ جاتے اور نگہت کو یوں مچن میں بیٹھا دیکھ لیتے تو جانے کیا سمجھتے۔۔۔۔۔؟ ان کا بچوں پر رعب بھی تو بہت تھا۔ مجبوراً ایمان کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ نگہت کو بازو پکڑا اٹھا کر اپنے اور حیا کے کمرے میں لے گئی اور پھر وہاں مضبوطی کے سارے بند مچن ٹوٹ گئے۔ دو نگہت کے گلے لگ کر خوب روئی اور اُس نے نگہت سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی جس سے ایمان یا اس کے ماں باپ کی عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔

نگہت نے اس سے وعدہ تو کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ یقین دلانے کی بھی پوری کوشش کی کہ میں اُس عام نوجوانوں میں سے نہیں ہوں جو اس طرح کے رشتوں کو کھیل سمجھتے ہیں۔ نگہت نے اپنے ماں باپ کی قسم کھا کر اسے میری اور میرے جذبے کی سچائی کا اعتبار دمانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس معاملے میں ایمان نے صرف اتنا ہی کہا کہ اس کی زندگی کا اختیار صرف اس کے ماں باپ کو ہے، وہ جہاں چاہیں گے، جیسے چاہیں گے اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات کہنا چاہتی ہے اور نہ ہی سننا چاہتی ہے۔

یہ تمام باتیں مجھے نگہت کی زبانی پتہ چلی تھیں۔ نگہت نے نہ اپنی حویلی بلا کر یہ ساری داستان میرے گوش گزار کرتے ہوئے مجھے پھر یہی مشورہ دیا کہ میں اگر ایمان کی جانب کوئی پیش رفت کرنا چاہتا ہوں تو اس کا صرف، واحد اور ایک ذریعہ میرے گھر والوں کی طرف سے اس کے گھر رشتے کا جانا ہی تھا۔

بہر حال مجھے ایک بات کا اطمینان تو ہو گیا تھا کہ ایمان فی الحال کہیں منسوب نہیں تھی لیکن اس جیسی مانتاب کے لیے جانے کتنے اور دل

دھڑکتے ہوں گے۔ جانے اور کشتوں کی دودھ نظر ہوگی۔ مجھے جو بھی کرنا تھا، بہت جلدی کرنا تھا۔ لیکن مجھے اپنے گھر والوں کے رد عمل کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ شہر کے سب سے دلچسپ اور امیر گھرانے کا رشتہ اور وہ بھی کسی غریب مولوی کے گھر؟ ہماری شان اور انا بھائیہ سب کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن گھر والوں سے بات کیے بنا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ مجھے مولوی صاحب کے گھر تک پہنچنے کے لیے اپنے گھر والوں کی شناخت کی ضرورت تھی۔ میری اپنی تو فی الحال کوئی شناخت بھی نہیں تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ پورے گھر میں جیسے ایک بھونچال سا آگیا۔ سب سے پہلے امی چلائیں۔ ”کیا۔۔۔؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“

کشنر صاحب کو جلاس آگیا۔ وہ منہ سے پائپ کا دھواں اُگلنے ہوئے دھواڑے ”ہماری سات نسلوں کی عزت کو بے لگائے چلا ہے یہ۔“ عبرینہ بھائی نے نراسمانہ بتایا۔ ”واٹ ر۔۔۔ What Rubbish۔۔۔“ سجاد بھائی نے سر پینٹ لیا۔ ”مجھے پتہ تھا یہ کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلے گا۔“ پورے گھر میں صرف جود تھا جس نے آکر میری چپٹھوکی ”گریٹ میڈی بھائی گریٹ۔۔۔۔۔ زبردست چوٹس ہے۔ بیٹ آف لک۔۔۔“ لیکن جود بے چارہ یہ نہیں جانتا تھا کہ صرف قسمت کے لیے دعا دینے سے کسی کی قسمت اچھی نہیں ہو جاتی۔ اور پھر مجھے تو اپنی قسمت کی لکیر پھر نئے سرے سے تراشی تھی۔ صرف ایک تیشے کی مدد سے پھر سے دودھ کی نہر کھودنا تھی۔ زندگانی پھر سے کوہکن کا امتحان لینے کو تیار تھی۔

میرے دادا دین اور بڑوں نے اس معاملے میں میری کوئی بات سننے سے ہی صاف انکار کر دیا۔ مجھے یاد ہے ہم سب ڈرنیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا دعا پھر سے دہرایا۔۔۔۔۔ بابا نے غصے میں ہاتھ میں بکڑے چھری اور کانٹے کوزہ سے پلیٹ میں دے مارے۔

”بس۔۔۔۔۔ بہت سن لی تمہاری عشق کی داستان۔۔۔۔۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔۔۔۔۔ تم اگلے بیٹے مندن جا رہے ہو۔ میں نے وہاں کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں تمہارے داخلے کا انتظام کر دیا ہے۔ دو سال کی ڈگری ہے۔ پہلے پڑھائی ختم کرو۔۔۔۔۔ شادی وادی بھی ہوتی رہے گی۔“

”لیکن میں مندن نہیں جانا چاہتا۔۔۔۔۔ مجھے اگنا کس کی ڈگری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

امی چلائیں ”تو پھر کس چیز میں دلچسپی ہے تمہیں ہاں۔۔۔۔۔؟ چار دن میں ہی ایسا کیا جادو کر دیا ہے تم پر اس شریف زوی نے۔۔۔۔۔؟“

عبرینہ بھائی نے فوراً تڑکا لگایا ”مجھے تو اسی دن اس پر شک ہو گیا جس دن وہ یہاں پارٹی میں ٹیک پر دین بنی بیٹھی تھیں۔ آف۔۔۔۔۔ یہ پھولے لوگ۔“

میں مزید یہ لغویات نہیں سن سکتا تھا، لہذا میں غصے میں اپنی کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نیپکن زور سے میز پر جھٹک کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بھی امی کی تیز غصے میں بھری آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ شاید بابا سے کہہ رہی تھیں۔

”دیکھا۔۔۔ دیکھا آپ نے۔۔۔۔۔ کس قدر خود مر ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ میں تو کہتی ہوں۔۔۔۔۔“

ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے میں ڈانٹنگ ہال سے باہر نکل چکا تھا۔ لیکن کاش میں اس دن وہاں کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے امی کا پورا جملہ سن لیتا تو اگلے دن وہ غضب مند ہوتا جو ہوا۔



سوائے عباد کے تمام گھروالوں نے میرا مکمل بایکاٹ کر رکھا تھا۔ اگلے دن میں یونہی گم سم اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اچانک نیچے سے امی اور بھابھی کے زور زور سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی سے لڑ رہی ہوں۔ پہلے تو میں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ آج کل گھر میں ایسے ڈرامے تقریباً روزی ہوتے تھے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ معاملہ تو کچھ مجھ سے متعلق ہے۔ میں جلدی سے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ریٹنگ کے قریب آ کر دیکھا تو نیچے لاؤنج میں مولوی عظیم سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ پر ندامت کا سپینہ آنکھوں میں آنسو اور سارے بدن میں جیسے لرزش سی تھی، امی اور بھابھی مل کر جانے نہیں کیا کیا مغلطعات سن رہی تھیں۔ میرے قدموں کے نیچے سے تو جیسے زمین ہی نکل گئی۔ میں وہیں اوپر سے کھڑے کھڑے چلایا۔ "ای۔۔۔ بس کریں بہت ہو گیا۔"

امی اور بھابھی مجھے دیکھ کر پُپ ہو گئیں اور لاؤنج سے ملحقہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ مولوی صاحب بھی پلٹے اور نوٹے ہوئے قدموں سے واپس ہو لیے۔ جب تک میں جوتے پہن کر بھاگتا ہوا باہر پہنچا وہ اپنی سائیکل نکال کر گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ میں بھاگتا ہوا ان کے سامنے آ گیا اور ان کے راستے میں حزام ہو گیا۔ مولوی صاحب کی آنکھوں سے آنسو اس رفتار سے بہہ رہے تھے کہ ان کی سفید داڑھی بھی بھیگ چکی تھی۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا بس میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"ان سب کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ حالانکہ ان کا گناہ قابل معافی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔"

مولوی صاحب نے نظر اٹھا کر مجھ کو دیکھا، ان کی اس ایک نظر میں جو شکوہ تھا اس نے جیسے مجھ پر گزروں پانی ڈال دیا۔ میری نظر خود بخود دھجک گئی۔

"میں نے تمہارا کیا باز اتھا حاد مہاں۔ غریب آدمی کے پاس صرف ایک سی بھرم ہوتا ہے۔ اس کی عزت کا بھرم۔۔۔ تم نے آج مجھ سے وہ بھرم بھی چھینوا دیا۔ کیوں۔۔۔ آج بھرے بازار میں میری معصوم بچیوں کے کردار پر کچڑ اچھا لگ گیا۔ انہیں زسوا کیا گیا۔ صرف تمہاری وجہ سے کاش۔۔۔ کاش میں تمہیں کاشیں کوئی بددعا دے سکتا۔۔۔ لیکن۔۔۔ بہر حال وہ بڑا انصاف والا ہے۔۔۔ میرا انصاف بھی وہ خود ہی کرے گا۔"

مولوی صاحب کی آواز جذبات کی رو میں ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیے۔ میں سر جھکائے وہیں گیٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔

میرے ذہن میں طوفانوں کی آغوشی چل رہی تھی۔ میرے ذہن میں پہلے یہ بات کیوں نہیں آئی کہ میرے گھر والے اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا مجھ پر کوئی زور نہیں چل سکتا۔ اس لیے انہوں نے رات ہی کو اس وجہ کو ہی ختم کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا جس کی وجہ سے میں نے عبادت کی جرأت کی تھی۔ کاش۔۔۔ کاش اگر مجھے پہلے ان کے ارادوں کا علم ہو جاتا تو میں مولوی صاحب کو راستے سے ہی واپس بھیج دیتا۔۔۔ کاش۔۔۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ امی اور بھابھی نے موقع پا کر اپنا وار کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کو گالی دی گئی تھی کہ وہ منصفوں میں اپنی بیٹیوں کو سجا کر اس لیے بھیجتے ہیں کہ مجھ جیسا کوئی رئیس زادہ ان پر فریفت ہو جائے۔ ان کے منہ پر اس ماہ کی تنخواہ مار کر انہیں آئندہ اس گھر کا رُخ نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ذرا سوچئے۔۔۔ اس سلوک اور ان الزامات کے بعد ایک سفید پوش اور ایک پاک باز غیرت مند انسان کے پاس سوائے مرجانے کے اور کیا چارہ رہ گیا ہوگا؟ لیکن مولوی صاحب جیسوں کے پاس تو موت جیسی عیاشی سرزد ہونے کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ اگر ہمارے مذہب

میں خود کشی حرام نہ ہوتی تو اس روز مولوی صاحب یقیناً خود کو ختم کر لیتے۔ اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں اس کی اس بے عزتی کا ذمہ دار تھا۔ مجھے اس سے خود سے ہی شدید نفرت کا احساس ہوا۔ میں غصے میں واپس اندر کی طرف پلٹا اور پھر میرے راستے میں ڈرائنگ روم، لاؤنج، مانی کی جو بھی چیز آئی وہ نوٹ کر کرچوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ بھابھی تو ڈر کے مارے اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلیں۔ ابنت امی کے ساتھ خوب بحث ہو گئی۔ انہوں نے روایتی عورتوں کی طرح مجھے طعنے دیے۔ مجھ پر مولوی صاحب کے گھر والوں کی طرف سے تعویذ گندوں کے زیر اثر ہونے کا الزام بھی لگا۔ پھر آخر میں وہی۔۔۔ جو ایک ماں کا آخری ہتھیار ہوسکتا ہے۔۔۔ آنسو۔۔۔

رات کو کشفِ صاحب کی عدالت لگی اور میرے خلاف حتیٰ فیصلہ دے دیا گیا کہ مجھے اس گھر کی روایتوں کو توڑنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور اگلے ہفتے مجھے ہر حال میں لندن کی فلائٹ لینی ہی ہوگی۔ میں نے اس رات کشفِ صاحب سے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں چا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا تھا۔

دوسرے دن صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں پڑانی حویلی جا پہنچا۔ شا کر کو حویلی کے دوسرے نوکروں سے اس معاملے کی سن گن مل چکی تھی۔ لیکن گھر پہل موجود نہ ہونے کی وجہ سے اُسے پوری بات کی خبر نہیں تھی۔ اس قدر صبح وہ مجھے پڑانی حویلی میں پا کر اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور برا گاہ گامیرے پیچھے حویلی کے پڑانے بڑے گول کرے میں چلا آیا۔

”حماد بابا۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔۔۔ کل مولوی صاحب کو لو کر کے فارغ کر دیا گیا۔۔۔ بلکہ، مجھے تو شرافت چاہیادار نے بتایا ہے کہ۔۔۔“

”تم نے ٹھیک سنا ہے، اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

میں نے شا کر کو ساری بات الف سے لے کر ی تک سنا دی۔ شا کر سر قہم کر دیں جینہ گیا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا بابا۔۔۔؟ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ کے گھر والے اس رشتے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔۔۔ اور مولوی صاحب۔۔۔ وہ تو بہت نازک انسان ہیں بابا۔۔۔ اور نگہت۔۔۔ اس سے تو مجھے اس بے وقوفی کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔“

”اس میں نگہت کا کوئی قصور نہیں ہے، تم جانتے ہو وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔ پلیز تم اُسے کچھ مت کہنا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن جو زیادتی گھر والوں نے مولوی صاحب کے ساتھ کی ہے اس کا ازالہ کیسے ہوگا۔“

”اس کا ازالہ بھی نہیں ہی کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرا رشتہ لے کر مولوی صاحب کے گھر جاؤ۔“ شا کر اچھل پڑا۔

”کیا۔۔۔؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، حماد بابا۔۔۔ میں بھلا کیسے۔۔۔؟“

”اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی نہیں۔۔۔ اسی طور پر اب بھی اس گھر رشتہ لے کر نہیں جائیں گے اور مولوی صاحب کے اچھے دامن پر جو داغ

میری وجہ سے لگا ہے وہ کبھی مٹ نہیں پائے گا۔ اس لیے میں نے یہ حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے یا نہیں؟“

شا کر خاموش بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

نگہت چپ چاپ اندر آئی اور چائے کی ٹرے رکھ کر میرے اور شاہر کے لیے پیالیوں میں چائے ڈال کر واپس چلی گئی۔ شاہر نے سر اٹھایا۔  
 ”بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے آپ نے مجھے بابا۔۔۔“

ایک طرف برسوں کی مولوی صاحب سے دوستی ہے تو دوسری طرف آپ کا برسوں کا تنک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شاید میں اس طرح مولوی صاحب کی برسوں کی دوستی کو کھونے چلا ہوں۔ لیکن کیا کروں۔۔۔ میں آپ کو بھی تو نہیں کھوسکتا۔“

شاہر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ لیکن جانے کیوں اس کی یہ خاموشی مجھے کسی گہرے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔

☆☆☆

پاکستان کی مشہور رات فرحت اشتیاق کے بہترین ناول

# 2 نئے ناول

شائع ہو گئے ہیں



عالم و عسل پبلشرز

فون: 7352332، 7232336، 7223584

عالم عرفا

## یادیں

”یادیں بھی ہمارے ساتھ کبھی کبھی کیسے نکلیں نکلتی ہیں۔ یہ ہمیں وہ سب سوچ کر بھنے پر مجبور کر دیتی ہیں جب ہم کسی کے ساتھ مل کر رہے تھے۔۔۔ اور کبھی ہمیں یہ سوچ کر رونے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کبھی ہم کسی کے ساتھ مل کر رہے تھے۔“

اس دن عبرانی زبان والی لوک جھونک کے بعد سارو کافی محتاط ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی مجھ پر طنز کے وار تو کرتی تھی۔ لیکن اب اس کے انداز میں احتیاط کا پہلو نمایاں تھا۔ جوزف سے اب بھی ہمارے اسی پسندیدہ اور مخصوص بیچ پر تقریباً روزانہ سی ملاقات ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے، اپنی بہت سی اندرونی باتیں بھی بتادی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اُس کے خاندان میں اب صرف وہ اور اس کی بیوی ہی ایک چھت تھے رہتے ہیں۔ تینوں بچے جوان ہونے کے ساتھ ہی ایک ایک کر کے گھر چھوڑتے گئے۔ اس عمر میں وہ یہ نوکری بھی اس لیے کر رہا ہے کیونکہ گزر بسر کے لیے اس کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں اور وہ اوڈن ہوم جانا نہیں چاہتا۔ وہ ایک دن مجھے یونیورسٹی سے واپسی پر برج گاؤں میں واقع اپنے چھوٹے سے گھر بھی لے کر گیا تھا۔ اس کی بیوی نیری ایک مہربان عورت تھی جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی گہری آداسی تھی۔ وہ مجھ سے اسی طرح پیش آئی جیسے ایک ماں اپنے کسی چھڑے بیٹے سے پیش آ سکتی ہے۔ اُس نے دیر تک مجھے داپس نہیں جانے دیا اور اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی بہت سی چیزیں بھی کھائیں اور ہمارے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی طرح جاتے ہوئے میری جیبوں میں بھی بھر دیں۔ جیسے بچپن میں میری نانی اور میری دادی ان کے گھر سے واپسی پر میری جیبیں اُٹھوات، کشمش، پتے اور خوبانوں سے بھر دیتی تھیں۔۔۔۔ شاید دنیا کے ہر خطے کی محبت کی ایک ہی بولی ہوتی ہے، شیرے جیسی میٹھی اور کچے دھوس جیسی آ نکھیں چلا لے والی بولی۔۔۔۔

مندان کے موسم کا بھی بے وفا محبوب کی طرح کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی پل میں دھوپ چمک رہی ہوتی ہے کہ دوسرے ہی پل ریم جھمک کر چھڑی آپ کا تن من بھگوانے لگتی ہے۔ اُس دن بھی جب صبح میں نے یونیورسٹی کے لیے نکلنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا تو دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن جب میں گھر سے نکل کر سڑک کے کنارے پر لگی کافی کی مشین تک پہنچا تب تک آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور میرے یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے پھوڑ پڑنا شروع ہو چکی تھی۔ میں یونہی بھیٹکا ہوا، کانہ سے پر اپنے نوٹس کا بیگ لٹکائے کلاس روم میں داخل ہوا۔ لیکن یہ کیا۔ آج تو کلاس بالکل خالی پڑی تھی۔ کیا سس جلدی گھسیٹا تھا یا پھر ٹیکسٹ کی کسی اور کمرے میں ہونا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا کلاس سے نکلنے کے لیے پلٹا۔ اس لمحے میری نظر ٹیکسٹ ہاں کے بلیک بورڈ پر پڑی۔ اور وہاں لکھی تحریروں نے میرے قدم جکڑ لیے۔ بلیک بورڈ پر مسلمانوں کے لیے تشکیک آمیز جملے لکھے ہوئے تھے۔ اور ہر جملے کے بعد یہودیوں کا مخصوص نشان (Davidstar) یعنی چھ کونوں والا ستارہ بنا ہوا تھا۔ ہر جملے سے ذہر چمک رہا تھا، ڈاؤن ویڈ مسلم (Down with Muslim)، ٹیرورسٹس (Teromists)۔ یہودی آردی اوٹلی گریٹ ہٹا مسلمانوں یہ کیسے چھوڑ دو، اور اس طرح کے دوسرے بہت سے فقرے۔۔۔۔

میں جانتا تھا کہ اس کلاس میں صرف میں ہی ایک اکیلا مسلمان تھا اور یہ سب کچھ میرے لیے ہی لکھا گیا تھا۔ ورس نے لکھا تھا۔ یہ بھی نہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ میرے خون میں ایک عجیب سی گرم لہر دوڑ گئی۔ مجھے پہلی مرتبہ کامران کی کہی ہوئی باتوں میں صداقت محسوس ہوئی۔ اسنے میں کلاس میں رہیکا داخل ہوئی رہیکا آسٹریلیئن تھی اور میرے ہی سیشن میں میری ہم جماعت بھی تھی۔ اس نے بلیک بورڈ پر لکھی تحریریں دیکھ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ یہ سب کو اس کس نے لکھی ہے یہاں پر۔“

کلاس کی سب سے مغرور اور بد دماغ لڑکی نے۔۔۔۔۔ اور بھلا کوئی ایسا کیوں کرے گا۔“

”یوٹین سارہ۔۔۔۔۔؟ نوٹین۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔“

”اگر تمہیں کہیں وہ مل جائے تو اس سے کہنا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ خود کو عظیم کہنے اور سمجھنے والے اس قدر کمزور ہوں گے کہ ان میں اپنے مخالف کے منہ پر بات کہنے کی جرأت بھی نہیں ہوگی۔“

میں رہیکا کو یہ پیغام دے کر وہاں سے نکل آیا۔ اب میرا کلاس لینے کا بھی بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں اب بھی ویسے ہی ہلکی سی مٹھواری کا سسہ چاری تھا۔ جن دنوں بارش یا برف باری ہوتی تھی، ان دنوں گھاس کے میدانوں میں اور یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی نہر کے کنارے پرے پٹلیوں اور کرسیوں پر لگی بڑی بڑی نیلی چٹی چھتریاں کھول دی جاتی تھیں۔ ہاں ٹپکتے ہی جوزف بھی مجھے ایک ایسی نیلی چھتری کے نیچے نہر کنارے اپنے پسندیدہ مقام پر بیٹھ نظر آیا۔ آج دوبارش کی تصویر کشی کرنے کے لیے اپنے ساتھ کیٹوس سٹینڈ وغیرہ بھی لے کر آیا تھا اور نہر میں گرتی بوندوں سے پیدا ہونے والے پانی کے ارتعاش اور اس ارتعاش سے گزرتے، سکتے پانی کے عکس پر بنی شیبہوں کی تصویر کشی کر رہا تھا۔

میں اس کی طرف بڑھ گیا اور جھٹ کر اس کی تصویر بننے دیکھتا رہا۔ واقعی جوزف بہت اچھا مصوّر تھا۔ اس نے نہر میں یونیورسٹی کی عمارت کے عکس کی تصویر بنائی تھی، لیکن یہ سہکت عکس کی تصویر نہیں تھی بلکہ نہر کے پانی میں گرتی بارش کی بوندوں سے ہوئی پھل کے دوران اس عکس میں ہوتی تبدیلیوں کی تصویر تھی۔ جوزف نے بہت چھوٹی چھوٹی سی جزئیات کا بھی پورا احسان رکھا تھا۔ جوزف تصویر بناتے بناتے میری طرف پلٹا۔

”کہو کیسی لگی۔۔۔۔۔؟“

”بہت خوب، لگتا ہے کہ کیٹوس خود ایک نہر ہے۔ جس پر تم بارش کے چھینٹوں کی صورت میں رنگ پھینک رہے ہو۔“

جوزف نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تال بجائی۔

”واہ۔۔۔۔۔ میری تصویر کی آج تک کسی نے اتنی مکمل تعریف نہیں کی۔ واقعی تمہارے لفظوں کا جواب نہیں ہوتا۔ میں رنگوں سے تصویر بناتا

ہوں اور تم لفظوں سے تصویر کشی کرتے ہو۔“

جوزف اپنی تصویر کو اتنی سی سرگد دے کر میرے ساتھ بیٹھ پر آ بیٹھا۔

”کیا بات ہے۔ آج تم کچھ اچھے ہوئے سے نظر آ رہے ہو۔“



میں نے جوزف کو کلاس روم میں پیش آنے والا سارا واقعہ سنا دیا۔ جوزف کو بھی غصہ آ گیا۔

"ٹھیک نظری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن جانے کیوں میں بھی ریکا کی اس بات سے متفق ہوں کہ سارہ ایسا نہیں کر سکتی۔ شاید میں نے تمہیں پہلے بتایا نہیں۔ وہ یہاں داخلے سے پہلے بھی ایک اور ادارے میں مجھ سے شام کی میٹنگ کلاسز لیتی رہی ہے۔ اور وہ خود بھی ایک بہت اچھی مصورہ ہے۔ تم لوگوں کے خلاف اس کے دل میں واقعی بہت بغض بھرا ہوا ہے اور وہ اس دشمنی میں کسی انتہا تک جا سکتی ہے۔ لیکن اسے سامنے سے وار کرنے کی عادت ہے۔ وہ یوں ٹھپ کر کوئی ایسا بیخ اقدام نہیں کر سکتی۔ دراصل وہ اسے بھی یہودیت کی توہین سمجھتی ہے کہ دشمن کی پیٹھ پیچھے وار کیا جائے۔"

میں نے بے زاری سے سر ہلایا۔

"کیا کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔۔ اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ میرا ان لوگوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ شاید پروٹیسٹنٹ ایسی ان یہودیوں کا سب سے بڑا انتہا رہتا ہے۔"

"ٹھیک سمجھے ہو تم، اسی لیے یہ لوگ ساری دنیا میں کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کاروبار کو اپنے پروٹیسٹنٹ کے لیے اور پروٹیسٹنٹ کو اپنے کاروبار کی وسعت کے لیے اس کا سیاسی سے استعمال کرتے ہیں کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔ اور اس پرنسپل سے یہ اتنا کھاتے ہیں کہ ان کی دولت دنیا کی چند سب سے بڑی مملکتوں کی بادشاہت بدلنے کا باعث بنتی رہتی ہے۔ شاید تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ دنیا میں فرنچائز سسٹم کے بانی بھی یہی یہودی ہیں اور اسی سسٹم کی بدولت آج یہ دنیا کے ہر گلی کوچے میں اپنا کاروبار پھیلا چکے ہیں۔"

میں نے غور سے جوزف کی طرف دیکھا۔

"اگر یہ اتنے ہی کامیاب ہیں تو پھر اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔"

جوزف مسکرایا۔ "شاید یہ ایک خوف ہی ان کی قسمت میں ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ آج تک دنیا میں سب سے زیادہ نبی اسی قوم پر اترے ہیں۔ یعقوب سے لے کر موسیٰ تک چار ہزار نبی اس قوم پر مبعوث ہو چکے تھے۔ اگر اس تعداد کو تم ان کی فی نسل پر تقسیم کرو تو ان کی ہر نسل پر نوے نبی اترے ہیں لیکن پھر بھی یہ قوم گمراہی رہی۔ یہ خوف اسی گمراہی کا خوف ہے۔"

میں حیرت سے جوزف کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ یہودیوں کی تاریخ کے بارے میں اتنی تفصیل سے جانتا ہوگا۔ جوزف نے گہری سانس لی۔

"بہر حال میں تم سے پھر یہی کہوں گا کہ ان لوگوں سے نہ الجھتا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ سارا ہتھری لڑائی میں دشمنی ہمیشہ سر ہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی عظمت اور برتری کا جنون ہے، جسے ان کے دماغوں سے نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔"

ہمارے سامنے نہر میں بننے والوں میں ایک دم تیزی آ گئی۔ ہارٹ تیز ہو گئی تھی، مرتعابوں کی ایک ڈار نے تیز بارش سے گھبرا کر لمبی سی اڈا بھری۔ ساکت فف میں پروں کے پھڑ پھڑانے کا شور گونجا۔ جوزف نے اپنی تصویر اور دیگر سامان جمع کرنا شروع کر دیا۔ میں بھی اس کی مدد کرتا رہا۔ لیکن میرا دھن ب بھی جوزف کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ شاید جوزف بھی میری بے خیالی بھانپ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔"

”سوچ رہا ہوں کہ کہیں نہ کہیں یہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ اصل میں وہ خود عظیم نہیں ہیں، عظیم کوئی اور لوگ ہیں۔ اور اصل میں ان کا یہ خوف اسی وجہ سے ہے کہ کہیں وہ دوسری نسل اپنی عظمت کو دوبارہ پہچان نہ لے۔ اسی لیے وہ ان کو اور کسی دوسری نسل کو بھی سمجھنے نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کو اگر روزانہ ایک ہی تسلسل اور روانی سے بولا جائے تو ایک وقت آتا ہے کہ جھوٹ جھوٹ نہیں رہتا۔ سچ بن جاتا ہے اور لوگ سچ کو جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ شاید یہ یہودی بھی اسی کھچے پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ ان کا جھوٹ دنیا پر سچ بن کر ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ہمارا سچ بھی اب لوگوں کو جھوٹ لگتا ہے۔ یہ دنیا زور آوروں کی ہے۔ زور آور جو کہے گا، وہی سچ ہوگا۔ اور اس وقت یہودی عی وہ زور آور ہیں۔“ جوزف بھی مہری بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

## کیا آپ کتاب چھوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر، مصنف، موفت ہیں اور اپنی کتاب چھوانے کے خواہش مند ہیں تو نفلک کے معروف پبلشرز ”علم و عرفان پبلشرز“ کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب بیچئے

خواتین کے لیے شہری موقع۔۔۔ سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسے پیشگاہی ادارے ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں

عمیرہ احمد	ہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنوس نازی	گلبد عبد اللہ	رفعت سراج	نبیدہ عزیز	گنبد سیمہ	میمونہ خورشید علی
اقراء صغیر صدیقی	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔ اے۔ راحت	اعتبار ساجد	شیر مجید (تحقیق)
حی الذین نواب	علیم الحق ختی	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ ایم۔ ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور۔ [ilmolrnanpublishers@yahoo.com](mailto:ilmolrnanpublishers@yahoo.com)

## محبت نامہ تمام

شکر سے پناہ شدہ ایمان کے گھر لے جانے کی بات کرنے کے بعد اس دن شام کو میں واپس گھر پہنچا تو کشتہ حب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ میں لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہا تھا کہ ان کی گرجتی آواز نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔

”غمبرو۔“

میں رک گیا۔ امی اور سجاد بھی کبھی میری بھانجی سمیت اپنے کمرے سے نکل آئے۔ اب آج ایک مکمل کشتہ حب کے روپ میں موجود تھے اور میں ان کے سامنے کسی بستہ ”ب“ کے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

”تو تم لندن نہیں جاؤ گے۔“

”میں لندن جانے کے لیے تیار ہوں، اگر آپ لوگ اس گھر میں مولوی عظیم کے ساتھ کی گئی بدتمیزی کا زلہ کر دیں۔“

کشتہ حب دھاڑے۔

”واٹ۔۔۔؟۔۔۔“ تو کیا اب تم چاہتے ہو کہ رینارڈ کشتہ امیر رضا جس کے نام کی گونج ایوان صدر تک ہے وہ اب ایک معمولی مولوی کے سامنے صدر تہیں بیٹھ کر تپا پھرے گا۔ جسٹ فارگٹ اٹ۔ Just forget It۔“

”تو پھر آپ سب بھی یہ بھول جائیں کہ میں آپ لوگوں کی کسی بدایت پر عمل کروں گا۔“

میں نے سیڑھیاں چڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

کشتہ حب پھر دھاڑے۔

”تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ تم جس چھت تلے رہتے ہو وہاں صرف میری ہدایات اور میرا حکم ہی چلتا ہے۔“

گویا مجھے باواسطہ یہ دمکی دی جا رہی تھی کہ اگر میں نے کشتہ صاحب کے احکامات کی تعمیل نہیں کی تو مجھے گھر بدر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ کشتہ حب اپنی کشتہ کے دور میں بھی تو یونہی مجرموں کو شہر بدر اور قحبہ بدر کرتے رہے ہوں گے۔ اور پھر میرا تو جرم بھی بہت بڑا تھا ”بڑم عشق“۔۔۔ اور اس جرم کی معافی تو کسی بھی دور میں روا نہیں رکھی گئی۔ آج میں بھی اپنے گھر والوں کی اس خود ساختہ عدالت میں محبت کا مجرم بنا کھڑا تھا۔

میں کشتہ صاحب کی طرف پلٹا۔

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ مجھے اس گھر میں مزید رہنے کا کوئی حق نہیں۔“

امی گھبر گئیں۔ شاید انہیں بات کچھ بگڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”نہیں بیٹا۔۔۔ ہم بھلا ایسا کیوں چاہیں گے۔۔۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ذہن اور دل سے اُس لڑکی کا خیال نکال دو۔“

”نہیں اُسے اپنے ذہن اور دل سے نکالنے سے زیادہ آسان اس گھر سے نکلنے کو سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔“

نہیں نے وہیں جانے کے لیے قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ امی چلائیں۔

”نہاد۔۔۔ یہ کیا حماقت ہے؟“

کشمش صاحبہ گرجے، ”ان کے بچے میں طنز اور حقارت کا ایک طوفان چھا تھا۔

”جانے دو اسے۔۔۔۔۔ دو دن میں آئے دال کا بھاد مسطوم ہو جائے گا۔ اسے باہر کی دھوپ ابھی تک لگی نہیں ہے۔ نو کروں کی فوج کی

خدمتوں تلے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی گزارنے والے اور منزل و اثر پینے والے اس شہزادے نے ابھی تک گھر سے باہر کی غیتوں کی اک جھلک

بھی نہیں دیکھی۔۔۔۔۔ ایک رات باہر رہے گا تو عشق کا سارا بھوت سر سے اتر جائے گا۔ اسے تو ٹھیک سے پیدل چلنا بھی نہیں آتا، کہو میاں جہاں

جانا چاہتے ہو وہاں تک چھے جاؤ گے یا ڈرائیور سے کہوں کہ قسمیں وہاں تک چھوڑ آئے۔“

نہیں کشمش صاحبہ کی طرف چلا۔

”بچے کو پیدل چلنا اس کے ماں باپ سکھاتے ہیں۔ افسوس آپ دونوں نے مجھے واقعی پیدل چلنا نہیں سکھا دیا۔ لیکن وقت سب کچھ سکھ

دیتا ہے۔ وہ بھی جو انسان کے ماں باپ اسے سکھانا بھول جاتے ہیں۔ میں بھی نو کروں، ایئر کنڈیشنڈ کمروں اور منروں و ٹرکے بنا جینا سکھ ہی جاؤں

گا۔ اور اگر نہ بھی سکھ پاؤں تو آپ اطمینان رکھیے۔ آپ سے مدد مانگنے پھر بھی نہیں آؤں گا۔“

امی چلاتیں رہ گئیں، سجاد بھائی شینا کر رہ گئے۔ باہر نکلا کر اپنے پائپ کا دھواں اُگلنے رہے اور میں اس گھر سے نکل آیا۔

میرے سامنے شہر کے کھلے راستے تھے اور سر پر دھوپ اگھٹا آسمان، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف کی راولوں۔ پابانے بچ کہہ تھا، میں

کبھی پیدل گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ میں نے اس شہر کا ہر راستہ اپنے نئے ماؤں کی گاڑی کی دھڑکن سے ہی دیکھا تھا۔ آج زمین پر ان راستوں پر

چلتے ہوئے ان کی طوالت اور اصل منظر کا احساس ہو رہا تھا۔

کہتے ہیں ہر انسان دنیا کو بدلنے کی باتیں تو کرتا ہے۔ لیکن خود کو بدلنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ آج سے میں نے خود کو بدلنے کی کوشش

شروع کر دی تھی۔ بہت دیر تک میں ایک پارک کے بیچ پر بیٹھا ان بدلے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا۔ میری جیب میں دو چار سو روپے ہی موجود تھے۔

اپنا اے۔ ٹی۔ ایم کارڈ اور کریڈٹ کارڈ میں وہیں لاؤنچ میں گھر سے نکلنے سے پہلے گھر والوں کے سامنے پھینک آیا تھا۔ جانے یہ پیسے کیسے رو گئے

تھے جیب میں۔ شام و میرے دھیرے پارک میں اترتی جا رہی تھی۔ لوگ جو آس پاس چہل قدمی یا سستارہ تھے دھیرے دھیرے اپنے اپنے

گھروں کو روانہ ہونا شروع ہو چکے تھے، در کچھ ہی دیر میں وہ پارک خالی ہو گیا۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ پارک کے چوکیدار نے مجھے آ کر پارک بند

ہونے کی اطلاع دی۔ ظاہر ہے اس کے کہنے کا مقصد یہی تھا کہ صاحب پارک بند ہو چکا ہے۔ اب آپ بھی اپنے گھر جائیے۔۔۔۔۔ لیکن میرا تو آج

کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ میں کس کے گھر جاؤں۔۔۔؟ بچپن سے لے کر آج تک میں جسے اپنا گھر سمجھتا رہا وہ تو کسٹرن صاحب کی عدالت اکلہ۔ ہات، مانو تو رہو۔۔۔ نہ مانو تو نکل جاؤ۔ ایسے ماں باپ ہم بچوں سے سالانہ ایک کنٹریکٹ فارم کیوں نہیں بھردالیا کرتے۔۔۔؟ جس میں تمام شرائط درج ہوں اور ہر سبب بچوں کو پڑھ کر سنائی جائیں۔ تاکہ ہم کبھی اس چار دیواری کو کبھی اپنا ذاتی گھر سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔

رات کا اندھیر اب سڑکوں پر اتر آیا تھا اور سڑک کے کنارے کھڑے ٹھیلوں پر لٹکے گیس کے بھاری روشن دان اب جھنکے لگ پڑے تھے۔ چلتے چلتے میری نظر گورنمنٹ سول ہسپتال کے گیٹ پر پڑی۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب میرے تایا یہاں سول سرجن ہو کرتے تھے تب میں اور کامران اسکول سے واپسی پر یہاں سے ضرور گزرتے تھے۔ ہمارا اسکول اسی ہسپتال سے آگے جاتی سیدی سڑک پر واقع چوک کے بعد آتا تھا۔ ہم دونوں تایا کے دفتر بھی جاتے اور گھنٹوں اس ہسپتال کی لمبی راہداریوں میں دھماچوڑی مچاتے رہتے۔ ہسپتال کی صوبہ بھر سے درختوں سے ڈھکی سڑکوں پر کھینچے رہتے تھے، مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ہسپتال کے لمبے لمبے اور گرین کے درختوں کے ٹکڑی کے لمبے لمبے بیج پڑے ہوئے تھے۔ جن پر مریضوں کے دولوا قین پڑے آرام کرتے رہتے تھے جو دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے ہوتے تھے اور شہر میں کوئی ہوٹل یا کسی کمرے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میری آج کی رات بھی ایک ایسے ہی ٹکڑی کے بیج پر گزرنے والی تھی۔ اس وقت مجھے ان چند روپوں کا دھین بھی نہیں رہا تھا جو اس وقت میری شرت کے جیب میں پڑے ہوئے تھے۔

میں ایک خالی بیج دیکھ کر اسی پر جا کر لیٹ گیا۔ بہت دنوں کے بعد سر پر کھلے آسمان اور تاروں کو ہوں پنے آپ سے باتیں کرنا محسوس کیا تھا۔ بچپن میں جب ہم نانی کے گھر گرمیوں کی رات کو ان کے کھلے مگن میں چار پائیاں ڈال کر سو یا کرتے تھے تو تب بھی کہانی سناتی نانی جان کی آواز صرف ہم تک نہیں بلکہ ہمیں دیکھ کر ان مسکاتے تاروں تک بھی جاتی تھی۔ تبھی تو ہمارے مگن میں چار پائیاں ڈال کر ن پر پڑتے ہی یہ سارے تارے بھی ہماری چار پائیوں کے اوپر نانی کے گرد دست آتے اور پھر جب تک ہم کہانی سن کر سو نہیں جاتے۔ یہ تارے بھی ہمارے ساتھ جاگتے رہتے، ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے رہتے۔

بچپن کی طرح آج بھی یہ سارے تارے میری آج رات کی تنہائی کے ساتھی تھے۔ میں ان تاروں سے کچھ شرمندگی ہی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے انہیں اتنا عرصہ بھلائے رکھا تھا لیکن آج جیسے ہی تنہا ہو کر میں نے بیگی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا تو میرے یہ سبکی پڑنے دوست بنا کسی شکوے اور شکایت کے پھر سے ماضی کی طرح میرے سر پر آن جمع ہوئے تھے، میرا درد بانٹنے کے لیے۔۔۔ بچپن میں ہر چہرہ جی پسند کا ایک تارہ منتخب کر لیتا ہے۔ دو کامران والا تارہ تھا، یہ گلی کا تارہ، یہ دو عبد نے اپنے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ اور یہ ہا میرا تارہ۔ سب سے چمک دار مجھے بچپن سے ہی سب سے اگلا اور سب سے نمایاں چیزیں چھنے کی عادت تھی۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔ سب میں نمایاں، سب سے اگلا، اگر میرے دل نے اس کی خواہش کی تھی تو اس میں ایسا کیا بُرا تھا۔ یہ سارا زمانہ میرا دشمن کیوں ہو گیا تھا۔۔۔؟ یہ زمانہ ہمیشہ ہی سے محبت کرنے والوں کے خلاف کیوں ہو جاتا ہے؟ ایسے ہی کچھ بے نام سے سوالوں کی پلٹاڑی میں ساری رات بیت گئی۔ میں تب چونکا جب میرے دوست ستاروں نے ایک ایک کر کے مجھ سے وداع لینا شروع کر دی اور صوبہ بھر چیز اور چیری کے درختوں پر پرندوں کے گھونسلوں سے ان کے ننھے ننھے بچوں کی چیخ و پکار بلند ہونا شروع



ہوگی۔ شاید پرندوں کے گھونسنے بھی ہمارے گھروں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ پہلے بڑے جاگ کر بچوں کے لیے ناشتے پانی کا بندوبست کرتے ہیں پھر چھوٹوں کا جنگایا جاتا ہے۔

ہسپتال کی چھوٹی سی مسجد سے اذان کی آواز ابھری اور پھر نمازی ایک ایک کر کے مسجد کی طرف چل پڑے۔ میں کچھ دیر حیرت سے ان نمازیوں کو دیکھتا رہا جو یوں صبح سویرے، منہ اندھیرے اپنی نیند ترک کر کے، آنکھیں ملے ایک جذبے کے ساتھ مسجد کی طرف روانہ تھے۔ میں آج تک کبھی یوں صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھنے کی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ جانے یہ کیسے لوگ تھے اور وہ کون سا جذبہ تھا جو انہیں یوں مسجد کی جانب کھینچے جارہا تھا؟ میری ساری رات آنکھوں آنکھوں میں ہی کٹ گئی تھی اور اس وقت سورج کی کرنیں اونچے، لمبے پیڑوں کی شاخوں سے چمن چمن کر زمین تک پہنچ چکی تھیں۔ زندگی کا کاروبار رواں دواں ہو چکا تھا۔ شاید کسی بڑے ڈاکٹر کے دورے کا وقت تھا۔ ہسپتال کے سفید وردی میں بیوس محلے نے جلدی جلدی ہم سب بیچ کے کمینوں کو وہاں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ میرا اب دیسے بھی یہاں بیٹھے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے شک کے گھر جانا تھا۔ شاید وہ کل مولوی صاحب کی طرف گیا ہو؟ شاید اس کے پاس کوئی نئی خبر ہو؟ میں نے جیب میں غیر ارادی طور پر ہاتھ ڈالے تو نوٹوں کی کڑواہٹ محسوس ہوئی۔ ہاتھ نکال کر دیکھا تو سوسو کے وہی چند نوٹ جو گھر سے چلتے وقت میری جیب میں رو گئے تھے، ہر گھل آئے۔ میں نے ہسپتال کے گیٹ کے قریب کھڑے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگے میں بیٹھ کر اپنے حویلی کی طرف چلنے کا کہا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ تانگے کی جھیلی سیٹ پر بیٹھنا ان کو اس پاس کے تمام منظر یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کوئی قلم اُنی چل رہی ہو۔

شاکر جو اس وقت حویلی کے گیٹ سے نکل ہی رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی جیسے اپنے حواس کو بیٹھا، اور میری طرف دوڑا چلا آیا۔ کچھ دیر تک تو دو مجھے یوں ناول ناول کر دیکھتا رہا جیسے میں کسی اور جہاں کی مخلوق ہوں۔

”حماد بابا۔۔۔۔۔ آپ کدھر چلے گئے تھے۔ رات کہاں گزاری ہے آپ نے، یہ کیا حالت بنائی ہے اپنی۔“

شاکر مجھے لے کر اپنے ہی کوارٹر میں چلا آیا، کیونکہ میں نے حویلی کے ڈرائنگ روم کی طرف جانے سے انکار کر دیا تھا۔ شاکر نے جلدی سے اپنے کوارٹر کی بیٹھک کا دروازہ کھول جو ہر حویلی کے پچھواڑے والے باغ میں کھلتا تھا۔ میں آنکھیں موندھے وہیں صوفے پر بیٹھا رہا جب تک شاکر اندر سے جلدی سے ناشتے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ تجھت نے جلدی جلدی چند پرائٹے، تلے ہوئے اور اُجھے ہوئے اندوں کا خاگینہ اور چائے بنا دی تھی لیکن میرا دل اس وقت کسی چیز کو ہاتھ لگانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ شاکر نے بے حد اصرار کر کے چند گھنٹ چائے کے میرے حلق سے نیچے اُتروائے۔ مجھے شاکر سے مولوی صاحب کے گھر کے حالات جاننے کی جلدی تھی۔ لیکن شاکر نے پہلے میرے گھر کا احوال دیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اس وقت مولوی صاحب کی طرف گیا ہوا تھا جب میں نے گھر چھوڑا تھا۔ شاکر جب ہمارے گھر پہنچا تو نوکروں نے گھر میں ہونے والے ہنگامے کا اس سے ذکر کیا۔ شاکر کے مطابق وہی کچھ پریشان تھیں جب کہ بابا اور سجاد بھائی کو یہ طمینان تھا کہ میں در بدر کی شوگر میں کھ کر رات بھر میں ہی واپس آ جاؤں گا۔ البتہ چھوٹا عبادت بھر مجھے میرے دوستوں کے گھروں میں تلاش کرتا رہا تھا۔

میں نے شاکر کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے رات کہاں گزاری تھی۔ اس کے تمام سوالوں کے جواب میں میں نے صرف ایک سوال کیا۔

”تم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔۔۔؟ وہاں کی کیا خبر ہے۔“ شاکر میرا سوال سن کر خاموش رہا۔

”ہاں گیا تھا، مولوی صاحب تو اسی دن سے بستر پر پڑے ہیں جس دن سے وہ آپ کے گھر سے واپس آئے تھے۔ پورے گھر پر سوگ جیسی کیفیت طاری ہے۔ ایسے میں مجھے ان سے کوئی دوسری بات کرنا اچھا نہیں لگا۔ بس ان کی عیادت کر کے واپس چلا آیا۔ انہیں اس صدمے نے بالکل غرق کر دیا ہے۔ شریف آدمی کی زندگی بھر کا اثاثہ صرف اس کی غیرت ہوتی ہے بابا۔۔۔ اگر کوئی اس پر ہی وار کر دے تو پھر وہ صرف ایک چلتی پھرتی ماشین کر رہ جاتا ہے۔“

میں جانتا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر اس وقت کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔ شاکر نے اچھا ہی کیا کہ وہ بتا کچھ بات کیے وہاں سے واپس چلا آیا۔ اب میرے وہاں مزید بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس لیے میں بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاکر نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”کہہ رکھا راہ ہے حماد بابا۔۔۔ میں اب آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔“

”میری اب کوئی منزل نہیں ہے۔ جس طرف قدم اٹھیں گے چلا جاؤں گا۔ مجھے اپنے آپ کو بچانے کا ایک موقع ملتا ہے۔ مجھے روک کر اسے ضائع نہ کرو۔ ورنہ میں ساری زندگی باپ کو کیا خدا اپنے سامنے بھی نظریں نہیں اٹھا سکوں گا۔“

شاکر میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا کہ میں جو بات ایک مرتبہ دل میں ٹھان لوں۔۔۔۔۔ پھر اس سے پلٹنا میرے لیے ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ جانتا تھا کہ میری ساری زندگی پھولوں کی بیج پر گزری ہے۔ یہ کانٹے مجھے بہت جلد لپہان کر دیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں نہیں رکوں گا اور یہ در بدری ہی اب میرا مقدر ہے۔ شاکر میرے ساتھ حویلی کی آخری حد تک آیا گھر سے نکلے ہوئے گھٹ پر میری نظر پڑی جو اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کرتی دروازے سے لگی کھڑکی تھی۔ میں نے کچھ آگے جا کر زبردستی شاکر کو گھر واپس بھیج دیا۔ اُسے پتہ ڈیوٹی پر بھی پہنچنا تھا۔ کسٹرن صاحب کا پارہ دیسے ہی رات سے بہت چڑھا ہوا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ آج حویلی کے لوگوں کی شامت کی ہوگی۔ شاکر روتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

سڑک پر کچھ دُور چلنے کے بعد مجھے پھر ایک ٹافٹ مل گیا۔ میں نے تانگے والے کو ریوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ کامران کے ایک دُور کے رشتے دار ریوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ شاید جاوید صدیقی نام تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے لیکن میں نے کامران سے ان کا بارہ ذکر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب تو کوئٹہ ریوے اسٹیشن پر ہی تھیں ہوں؟۔۔۔۔۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اور پھر مولوی عظیم صاحب کا ایک جملہ میرے کانوں میں جیسے انک کر رہ گیا تھا۔

اس دن جب میں ان سے گیت پر معافی مانگ رہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ میرے گھر والوں کی زیادتی کی جو سزا چاہیں مجھے دے دیں۔ تو اس دن شاید انہوں نے میں ہی سہی، لیکن ان کے منہ سے ایک بہت بڑا جج نکل گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

”تمہاری اپنی شناخت ہی کیا ہے؟۔۔۔ معافی مانگتے اور معاف کیے جانے کا حق صرف انہیں ہوتا ہے جو خود اپنی کوئی شناخت رکھتے ہیں۔ تم تو خود ان کے تاج ہو جنہوں نے آج میری سفید پوشی پر اور میری معصوم بچیوں پر کچھ اچھالا ہے۔“

جاتے جاتے وہ یہ کیسا طمانچہ مار گئے تھے میرے منہ پر۔ واقعی سچ ہی تو تھا۔ میں تو خود ان لوگوں کے نگاروں پر پل رہا تھا۔ میں بھلا کس بل بوتے پر ان سب کی طرف سے معافی مانگ رہا تھا۔ گویا اتنی زندگی میں نے بنا کسی شناخت کے ہی کاٹ دی تھی۔ صرف کشترا امجد رضا کا بیٹا بن کر۔ میری معاشرے میں جو عزت تھی وہ قاتر وہ سب کسی اور کی دین تھا؟ لیکن اب میں نے خود اپنی شناخت بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں اب موسوی عظیم کا صاحب ہی کرنا چاہتا تھا جب میرے پاس حاد رضا کے پاس اپنی کوئی شناخت ہوتی۔

اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے جاوید صدیقی صاحب کا پوچھا۔ خوش قسمتی سے وہ ابھی تک یہیں تعینات تھے۔ میں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر کھڑان کے چڑی کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا جو اندر میرے نام کی چٹ لے کر گیا تھا۔ کچھ دیر میں مجھے اندر بوا بیا گیا۔ جاوید صدیقی صاحب بچپن کے پینے میں ایک بھرے بدن اور درمیانی قد کے معزز سے شخص تھے۔ سفید بالوں کو ایک طرف سے مانگ نکال کر سیدھے سے جھڑکھا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور کان پر ایک بال پوائنٹ۔ انہوں نے فائیکو پر نظریں دوڑاتے ہوئے مجھ دیکھا اور پھر سے فائل کا ورق پٹنے پٹنے ہوئے بولے۔

"ہاں تو محمد دہماں۔۔۔ تم کا مران کے دوست ہو۔۔۔ بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں تمہارے لیے۔"

"جی سر۔۔۔ میں بے روزگار ہوں۔۔۔ اگر کچھ کام مل جاتا تو۔۔۔ چاہے عارضی ہی کسی۔۔۔"

صدیقی صاحب نے چونک کر سر اٹھایا اور اس مرتبہ غور سے مجھے دیکھا۔

"اوه۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی سیٹ ریزرویشن وغیرہ کا مسئلہ ہے۔ لیکن میوں۔۔۔ شکل سے تو تم بڑے لکھے لگتے ہو۔۔۔ بھلا تمہارے رائق یہاں کیا کام ہو سکتا ہے۔ کتنا بڑے ہو۔"

کبھی کبھی انسان کی اعلیٰ تعلیم بھی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ لوگ آپ سے ہمدردی تو رکھتے ہیں لیکن آپ کو کوئی کام دیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ میں اپنی تعلیم اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔

"جی بس گزارہ کر لیتا ہوں۔ آپ مجھے کسی بھی کام پر رکھ سکتے ہیں، میں بہت امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔"

صدیقی صاحب نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا جیسے پڑھائی دہائی بات پر انہیں یقین نہ آیا ہو۔ لیکن وہ جہاں دیدہ آدمی تھے انہوں نے اس بات پر وہ بارہ کوئی بحث نہیں کی۔

"سہان اٹھو گے۔"

"جی ضرور۔"

انہوں نے میز پر پڑی ہاتھ سے بچنے والی پڑائی سی گھنٹی پر ہتھیلی ماری۔ ٹنگ کی آواز گونجتی ہی چڑا سی کسی حکم کے غلام جن کی طرح نمودار ہو گیا۔ صدیقی صاحب نے اسے حکم دیا۔

"غفورے کو بلاؤ۔"

چڑا سی سر ہٹا کر باہر چلا گیا۔ اور چند لمحوں میں ہی ایک مضبوط بدن والے بکی عمر کے شخص کے ساتھ واپس آ گیا۔ جو قلیوں کے لباس میں

میں تھا۔ کاندھے پر ری، سرخ قمیض اور ہاتھ پر لوہے کا ٹکڑا (ج)۔۔۔۔۔ اس نے کمرے میں گھسنے سے پہلے بیڑی بچھ دی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صدیقی صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔ غور انڈیا کر سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔  
صدیقی صاحب نے پھر سر اٹھایا۔

”ہاں بھئی غور۔۔۔۔۔ تمہاری نظری پوری ہوئی یا نہیں۔“

”کہہ صاحب جی۔۔۔۔۔ وہ سنا کا بیٹا جسے پچھلے مہینے منویا ہو گیا تھا۔ اس نے ابھی تک ڈیوٹی پر رپورٹ نہیں کی ہے۔ دو ایک ور بھی ہیں حرام خور، جو مفت کی چھٹیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کاغذ بنا لیا ہے، کل آپ کو کپیٹ مل جائے گی۔“  
معلوم ہوا کہ غور اسٹیشن پر موجود رانی پورٹ کا لیبر انچارج تھا۔ صدیقی صاحب نے مجھے اسی کے ساتھ عارضی طور پر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ مستقل فکری بننے کے لیے عکسے سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا تھا اور یہ لمبا کام تھا۔ ابھی یہ صدیقی صاحب کے اختیار میں تھا کہ وہ روز کی اجرت پر عارضی طور پر رکھے جانے والے مزدوروں یا فیکوں میں میرا نام ڈلوادیتے۔

”غور۔۔۔۔۔ یہ تمہارے۔۔۔۔۔ آج سے یہ نو جوان تمہارے اندر کام کرے گا۔ فی الحال عارضی ہے۔ کام دیکھ کر فیصلہ کریں گے کہ کچا پرمت جاری کریں یا نہیں۔“

غور نے حیرت سے سر سے جھٹک کر اجازت لیا۔ جانے میرے چہرے پر ایسی کون سی تحریر تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے مزدور تسلیم کرنے پر رضی طور پر رضامندی نہیں ہو پا رہا تھا۔ پہلے صدیقی صاحب اور اب یہ غور۔ شاید عمر بھر کی خوش حالی از خود ہمارے چہرے پر ایک خاص تحریر اور ایک خاص چمک پیدا کر دیتی ہے۔ لگتا تھا یہ تحریر مٹنے مٹنے مٹنے کی اور یہ چمک جاتے جاتے جاتے گی۔

صدیقی صاحب نے جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ کسی بھی وقت کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو میں ان کے پاس آ سکتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس رہنے کا کافی الحاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور میں اکیلا ہوں۔ صدیقی صاحب نے غور سے کہا کہ وہ تھرڈ کلاس والے ویٹنگ روم کے چھڑا سیوں کو میرے بارے میں بتا دے کہ میں رات وہیں بسر کیا کروں کافی الحال۔ ویسے تو اس وقت گرمیوں کا موسم تھا اور رات پیٹ فارم پر بھی گزری جا سکتی تھی۔ غور نے سب سے پہلے میری دردی گودام سے نکلوا کر میرے حوالے کر دی۔ مجھے میری نئی شناخت کا پہلا نمبر بھی الٹ کر دیا گیا۔ میری پہلی شناخت، حمد۔۔۔۔۔ مزدور نمبر 137۔ بلکہ یہاں تو مزدوروں کو ان کے نام سے نہیں بلکہ ان کے نمبروں سے ہی پکارا جاتا تھا۔ میں بھی اب حماد نہ تھا۔ صرف ایک نمبر تھا۔ مزدور نمبر 137۔۔۔۔۔ بلکہ یہ تو اچھا ہی تھا۔ میرا نام بھی ان مزدوروں کے ناموں میں کسی بھی طرح نہیں جتنا تھا۔ اگر شناختی کارڈ کی نقل ریکارڈ میں جمع کرانے کی شرط نہ ہوتی تو شاید میں اپنا نام بھی بدل ہی لیتا۔

ہر ریلوے اسٹیشن کی اپنی، ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ الگ ہی صبح شام ہوتے ہیں۔ میں آج تک ہوائی جہاز سے ہی سفر کرنا چاہا آیا تھا۔ میرا ٹرین کے سفر کا تجربہ صرف لندن اور یورپ کی ٹریڈوں کا تھا۔ اپنے ملک میں تو میں نے کبھی ٹھیک سے کوئی ریلوے اسٹیشن بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور تھوڑا سا دیکھ بھیک تھا کہ میں آج اپنے ہی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر مزدور بنا کھڑا تھا۔

ڈرائی پورٹ کے فلیس کو عام فلیس کی طرح مسافر فریوے سے زیادہ واسطہ نہ تھا۔ انہیں زیادہ تر مال گاڑی سے مال اتارنا ہوتا تھا۔ اس دن بھی کچھ دیر پہلے ہی پلیٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی آ کر گلی تھی۔ غور سے نے تمام جزئیات طے ہو جانے کے بعد میری کمر چکی۔

”پل بھئی جون۔۔۔۔۔ لگ جا اپنی مزدوری پر۔ رب بھلی کرے گا۔ میں بھی دیگر مزدوروں کے ایک گروہ کے ساتھ سامان ڈھونے پر لگ گیا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بوجھ کسے کہتے ہیں، اور صحیح مستوں میں بوجھ اٹھانے والے کا جسم کس طرح پختہ ہے۔ میں دو پچھروں میں ہی ہلکان ہو گیا۔ غور اچھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے قریب بلا اور فیس کر کہنے لگا۔

”کیوں بھئی جوان۔۔۔۔۔ لگتا ہے زندگی میں پہلے کبھی بوجھ نہیں اٹھایا۔“

”نہیں مجھے عادت نہیں ہے۔ لیکن تم غلظت کرو۔۔۔۔۔ میں اپنے حصے کا کام پورا کروں گا۔“ غور سے نے میرے ہاتھ پکڑے اور میری احتیالیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”دیار غور سے کی نظر کبھی جموٹ نہیں بول سکتی۔ یہ تو قلم کا غد پکڑنے والے ہاتھ ہیں۔ یہ تو کہاں۔۔۔۔۔ گیا ہے اپنی جوانی جمانے کے لیے میری جان۔ جا چلا جا، یہاں سے۔ ورنہ ہماری طرح ایک دن تیری زندگی بھی یہ بوجھ ڈھونڈے ڈھونڈے گل مرزا جائے گی۔ اپنی اس خوبصورت جوانی پر رحم کھا۔“ میں نے مسکرا کر غور سے سے اپنے ہاتھ چمڑا لیے اور پھر سے کام پر لگ گیا۔ اس بے چارے کو کیا پتہ تھا کہ جوانی تو اس زہرہ جیس کی پہلی جھلک کی چنگاری سے ہی جل کر خاک ہو چکی تھی۔ اب تو صرف سینے سے اس آگ کی نشانی کے طور پر ہلکا سا دھواں اٹھتا باقی تھا۔ جس دن راکھ پوری طرح بجھ گئی اس دن سینے سے یہ اٹھتا دھواں بھی ختم ہو جائے گا۔

☆☆☆

## دو بوندیں ساون کی

دو بوندیں ساون کی ترجمہ ہے جھڑی آرچہ کے شہرہ آفاق ناول کہیں اینڈ سنیل کا جسے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے عظیم الحق حق نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا جھج لے کر پیدا ہوا اور دوسرا در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاد زمانہ تھا۔

یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی اصلاحی سول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔



## نیند

اس رات کلاس میں بلیک بورڈ پر نعرے لکھنے والے واقعے کے بعد میں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ جانے نیند کو آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی کیوں متعلّق کر دیا گیا ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے بھی تو ساری عمر جاگ سکتا ہے۔ میں تو ایسے کئی لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو کھلی آنکھوں سے تمام عمر نیند میں ہی ڈوبے رہے ہیں۔ شاید ہم جسے نیند سمجھتے ہیں وہ اصل میں نیند ہے ہی نہیں۔ نیند کا تعلق تو سکون سے ہوتا ہے۔ پلکیں بند کر لینے سے نہیں۔ نہیں بھی جانے کتنی صدیوں سے صرف پلکیں ہی بند کر پارہا تھا۔ نیند تو جانے کب سے مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔

اگلے دن صبح کامران نے مجھے یونیورسٹی ڈراپ کیا۔ اتفاق سے پارکنگ میں رکتے وقت سارہ بھی اپنی سفید ٹنڈل کار میں سے اترتی دکھائی دی۔ کامران کی ساری توجہ اسی کی طرف تھی۔ نیپے اسکرٹ میں اور اوپر بند گلے کی سفید سویٹر میں واقعی اس کا حسن قیمت ڈھارہ تھا۔ کامران کے منہ سے سینی سی نالی۔

”یار میڈی۔۔۔۔۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری یونیورسٹی میں ایسی ایسی حوریں بھی پڑھنے آتی ہیں۔ تمہارا گلہ سمیٹر کب سے شروع ہو رہا ہے یار مجھے آج اپنی جاہلیت کا حد درجے احساس ہو رہا ہے۔“

”زیادہ آہیں بھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بقول تمہارے یہ وہی بیہودن ہے جو میری جان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس پر ناپوٹے ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔“

کامران نے احدثی کی انتخاب کردہ اور سارہ کو ایک مشہور ہالی وڈ ایکٹریس سے ملے بیٹھا۔ یہ اس کی بڑی عادت تھی۔ وہ لوگوں کو ن کے چہرے کی مماثلت سے مشہور اداکاروں سے ملاتا اور پھر اسی نام سے انہیں پکارتا تھا، اس نے پھر غنڈی آہ بھری۔

”کوئی بات نہیں یار۔ یہودی بھی تو اہل کتاب ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے تو یہ بالکل سلی ہائیک لگتی ہے یار۔ جی خوبصورت لڑکی سے دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں اپنی پچھلی تجویز واپس لیتا ہوں۔ اور تمہیں فوراً اس سے دوستی کرنے کا نیا مشورہ دیتا ہوں۔“

میں نے بمشکل کامران کو زبردستی وہاں سے واپس بھیجا۔ سارہ بھی گاڑی سے اترتے ہی کسی طالب علم کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ کامران نے حتی الامکان گاڑی اس کے بہت قریب سے گزاری جس کا سارہ نے کچھ خاص نوٹس نہیں لیا۔ میں اپنا بیگ سنبھالے آگے بڑھ رہا تھا کہ سارہ نے مجھے آواز دی۔

”مسٹر حاد۔۔۔۔۔ ایک منٹ پلیز۔۔۔۔۔“

میرے بڑھتے قدم رک گئے۔ سارہ جلدی سے اپنے ہوا میں لہراتے کھلے بالوں کو سنبھالتی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ ”ربیکا نے مجھے

تمھارا پیغام دے دیا تھا۔ میں نے آج تک زندگی میں کبھی کسی کو کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن کبھی اپنے اوپر کسی دوسرے کے کیے ہوئے کا الزام بھی برداشت نہیں کیا۔ میں نے کلاس روم کے بلیک بورڈ پر وہ سب کچھ نہیں لکھا تھا۔ اور مجھے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتی ہوں اور اس کی جہت بھی رکھتی ہوں۔"

"تو پھر میں اس وضاحت کو کیا سمجھوں۔ کیا تم اپنے دوستوں کی طرف سے بھی وکالت پیش کر رہی ہو، ظاہر ہے یہ ان میں سے ہی کسی ایک کی حرکت ہے۔"

"نہیں میں ان میں سے بھی کسی کی وکالت پیش نہیں کر رہی ہوں، کیونکہ سچ کو وکالت کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"سچ کو دلیل کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔ اور جن کے پاس دلیل نہیں ہوتی وہی ایسی ہیجان زدہ حرکتیں کر کے اپنا نقص اپنی فرسٹریشن نکالتے ہیں۔"

سارہ نے ایک گہری نگاہ میرے اوپر ڈالی اور سرد سے لہجے میں بول۔ "دوسروں کا تو مجھے نہیں پتہ لیکن میرے پاس ہزاروں دلائل موجود ہیں۔ لیکن میں نے کہا نا، سچ کو ثابت کرنے کے لیے میں ان دلائل کو بیان کرنے میں اپنا اور تمھارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

میں نے اُسے فیصلہ سنا دیا۔

"تو پھر ملے رہا، ہم دونوں میں سے جس نے بھی دوسرے کو اپنے سچ سے قائل کر دیا، دوسرا اسی کا راستہ اپنالے گا۔ یوں منظور ہے۔"

سارہ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور شاید اُسے میری آنکھوں میں نجما چیلنج بھی صاف نظر آ گیا۔

"منظور ہے، تمہیں ہر کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوگی۔"

"اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ بیسٹ آف لک "Best of Luck" میں اور سارہ مخالف سمتوں میں مڑے اور اپنے اپنے راستوں پر چل دیے۔ دور سے کوئی ایس دیکھتا تو اسے یوں لگتا کہ ہم ایک ہی کمان سے چھوٹے دو مختلف تیر ہیں جنہیں دو مختلف سمتوں میں ایک ساتھ چھوڑ دیا گیا ہو۔

اس دن کلاس میں سارہ کے گینگ نے مجھ پر دفا فو قتا خیرے بازی کرنے کی کوشش کی لیکن میں پُپ رہا۔ بیکا سارہ کی بہت اچھی دوست تھی لیکن کیوں اس دن کے بعد سے اس نے میرے ساتھ ہی ڈیک پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ کلاس میں پڑے ہر ڈیک پر دو طالب علموں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور جس دن سے میں کلاس لے رہا تھا تب سے اب تک میں اکیلا ہی بیٹھتا تھا۔ بیکا بظاہر ہر لمحہ ہلکے کرنے والی، ہمیشہ جھجکتی میں ملبوس رہنے اور چٹوٹم چبانے والی ایک شوخ و شک تھلی جیسی لڑکی تھی، جو چلتے وقت اپنے پوائے کٹ بالوں کو ایک خاص ادا سے جھکتی تو آس پاس کے فوجوانوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک آدھ دن جب وہ میرے ساتھ ڈیک پر بیٹھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پڑھائی میں بھی تھی ہی دلچسپی رکھتی ہے جتنی دوسری شاہیوں اور اناہالی پن میں۔

سارہ کا گینگ لیڈر بظاہر ایک یہودی لڑکا تھا، اُس کے علاوہ بیٹھا بھی ان کے گروپ کی سرگرم رکن تھی۔ یوں سارہ بیٹھا، جم دروڈیو پر مشتمل یہ چار کاٹوا تھا جو در پردہ سارہ ہی کی وی ہوئی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ پھر ایک دن بیک کے دوران جب جم نے اسٹوڈنٹس کو بھانسنے کے لیے



وہ اپنے جذبات کو چھپانے میں کس رکھتی تھی۔ تقریب ختم ہونے کے بعد ہال سے نکل کر مین راجداری سے گزر رہا تھا کہ دیکھا کہ وہاں سے مجھے آوازیں دیتی بھاگتی ہوئی چلی آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے زور سے ہاتھ ملایا۔ اور خوشی سے بولی۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ گریٹ یار۔۔۔۔۔ میں نے تو یونہی سستی میں تمہارا ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنا بہترین بول لیتے ہو۔ ویسے تو بڑے چپ چاپ رہتے ہو ہاں۔ بہر حال۔۔۔۔۔ تم، نو، نو، نو۔۔۔۔۔ تمہاری تقریر نے پورے ہاں پر سکھ حاری کر دیا تھا۔۔۔۔۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری باتیں سننے، دوران پر یقین کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ تمہارے پاس ہر بات کی دلیل موجود تھی۔“

میں نے مسکرا کر اس زندگی بھری لڑائی کی خوشی کو سراہا۔

”میں نہیں جانتا یہ تمام لوجک (Logic) یہ تمام دلائل میرے پاس کہاں سے ایک دم ہی آ گئے تھے۔ کیونکہ میں کبھی کوئی خاص مذہبی انسان نہیں رہا۔ اور میں نے پہلے سے اس تقریر کے لیے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔“

”میں جانتی ہوں۔ سب مقررین کو موقع پر ہی تقریر کے عنوان دیے گئے تھے۔ بہر حال، تم نے میدان مار لیا۔ چلو اسی بات پر تمہیں کہنے میرا سے بہترین کافی پلواتی ہوں۔“

ریپا کی عادت تھی کہ وہ بات کہہ کر جواب سے بغیر آگے چل دیتی تھی۔ سو میں بھی ایک لمبی سی سانس بھر کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ کیونکہ اس سے بحث کرنے یا منع کرنے میں اس سے کہیں زیادہ وقت لگ جاتا تھا۔ کافی کا ایک گھلٹ سے بچنے اتارنے میں لگتا ہے۔

بظاہر یونیورسٹی کا ماحول بے سکون تھا، لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میری اس دن کی، کی ہوئی تقریر کے چل کر چند ہفتوں میں کن کن نت نئے اور بڑے طوفانوں کو جنم دینے والی ہے۔ بقول کامران ”میں یہودی نظروں میں آچکا تھا لیکن بے خبر تھا۔“

☆☆☆

## تساؤ کے آدم خور

**تساؤ کے آدم خور** شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے۔ ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے **تساؤ کے آدم خور** جنہوں نے یوگنڈا میں پھنسنے والی ریلوے لائن کا کام کھائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چٹا وہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم ”Ghost & The Darkness“ بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹرک (فوجی اور ریلوے لائن کام کا انچارج) کی کتاب **تساؤ کے آدم خور** (The Man-Eaters of Tsavo) کا اردو ترجمہ **کتاب گھر** پر **شکاریات** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## خدا اور محبت

مجھے ریلوے اسٹیشن پر مزدوری کرتے تقریباً ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ میرے ہاتھوں کو چونکدہ ایسی مشقت کی حادث نہیں تھی اس لیے پہلی رات ہی ان پر چھائے پڑ گئے تھے۔ جواب رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غوراً میرا جس حد تک خیال رکھ سکتا تھا وہ رکھ رہا تھا۔ ویسے بھی میں دوسرے مزدوروں سے کچھ الگ تھلک ہی رہتا تھا۔ ان کے اپنے چھوٹے چھوٹے غم تھے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ ان سب میں ان کی دست میں زیادہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے غلوڑے نے میرا نام ”بابو“ رکھ چھوڑا تھا۔

میری راتیں پیٹ فارم یا وینٹک روم کے کسی شیخ پر گزرتی تھیں۔ اور دن سارا مزدوری کرتے ہوئے۔ مجھے ان دنوں میں اس بات کا احساس شدت سے ہوا کہ ہم انسانوں نے اس زندگی کو ایک خواہ خواہ کا نکمیزا بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ انسان چاہے تو اس کا گزارہ دو جوڑے کپڑے میں بھی بہت خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہے۔

میں حماد اور امجد رضا، جس کے کپڑے لندن کے بڑے بڑے بوتیک سے تیار ہو کر آتے تھے۔ جو کف لکس اور ٹائی کی پن پیچنگ نہ ہونے کی وجہ سے پورے کا پورا سوٹ اٹھا کر باہر بیٹک دیتا تھا اور جس نے کبھی کسی تقریب میں ایک دفعہ کا پینا ہو اب اس دو بارہ نہیں پہناتا تھا۔ وہ حماد اب بڑے آرام سے اپنے ایک جوڑا پینٹ شرٹ اور ایک وردی میں گزار کر رہا تھا۔ ریلوے کے دھولے گھاٹ سے پانچ روپے میں جوڑا حاصل کر آ جاتا تھا اور وردی تو ویسے بھی سرکاری طور پر ہر دوسرے روز دھل کر آ جاتی تھی۔

کبھی میری گھسیں کانٹی نینٹل، انگلش یا عربی ناشتے کے لوازمات کے بغیر مکمل بھی نہ ہوتی تھیں۔ فرانس کا بنا ہوا کارن لٹیکس اور مصر کا درآء شہد نہ ہوتا تو میں ناشتہ ہی اُدھورا چھوڑ کر اٹھ جاتا تھا۔ اب پیٹ فارم کے کیکبن کی تیزی پی کی چائے اور بند کھن کے ساتھ بڑے مزے کا ناشتہ ہو جاتا تھا۔

فریش اسٹرابری ٹیکہ کی جگہ گھنے کے رس نے لے لی تھی۔ قافیہ انار ہوٹلوں کے لٹچ اور ڈنر کی جگہ پیٹ فارم کے ہوٹل کے خورد کی سادہ روٹی اور شوربے لے لے لی تھی، اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شروع کے دو تین دن کے علاوہ بعد میں مجھے کوئی خاص فرق بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اُن دنوں مجھے لذت سے یہ احساس ہوا کہ واقعی ہم انسانوں نے خود اپنی زندگیوں کو مفت کے جمیوں میں الجھایا ہوا تھا۔ خاص طور پر ہم امیر لوگ، ہماری خود پرستی اور خود پسندی ایک عذاب ہی تو ہے۔

مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آتی تھی کہ انسان کی زندگی میں دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو اگر زندگی بتانے کا ایک پیمانہ سمجھا جائے تو ان چوبیس گھنٹوں میں سے زیادہ تر لوگ دوبارہ گھنٹے دن اور رات کی نیند میں ہی بتا دیتے ہیں۔ باقی بچے بارہ گھنٹے تو اس میں سے بھی چھ گھنٹے تو دنیا داری کی



گھر، دفتر اور نوکریوں یا کاروبار وغیرہ کے جھیلے میں گزر جاتے ہیں۔ باقی چھ گھنٹوں میں بھی آپ کھانے پینے اور کہیں آنے جانے کا دورانیہ شامل کر لیں تو زندگی کے بمشکل دو یا تین گھنٹے ہی گزرتے ہیں جو ہم یا کوئی بھی انسان اپنے لیے بتاتا ہے۔ اب ان دو تین گھنٹوں کی زندگی کے لیے اس قدر جدوجہد، اس قدر بے ایمانی، اس قدر رکھینچا تانی کی کیا ضرورت ہے۔ انسان اگر معیار کے مقابلے میں پڑنا چاہے تو پھر معیار اور اعلیٰ زندگی کی بھدائی حد ہو سکتی ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیض بھری زندگی کی مثالیں ہمارے سامنے آجائیں گی۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب کے پاس ہوتے بس چوبیس گھنٹے ہی ہیں۔ سارا عہد انہی چوبیس گھنٹوں کو ٹالنے کا ہے۔ چاہے بہترین سے بہترین ملنے کی بے چینی میں کاٹ لیں، یا پھر جو کچھ میسر ہے اسی پر مبر اور شکر کر کے بتادیں دن بھر شکوہ کرتے رہیں یا پھر جبر و شکر میں بسر کر دیں۔ یہ چوبیس گھنٹے تو بہر حال گزری جاتے ہیں۔

زندگی روز مجھے نئے نئے سبق سکھ رہی تھی۔ یا شاید میں زندگی کی حقیقت کو سمجھنے لگا تھا۔ شاید مجھے اس لیے بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں اکیلا تھا۔ شاید رشتے ہی انسان کی سب سے بڑی مجبوری بن جاتے ہیں۔ رشتوں کے تقاضے انسان کو ناشکری اور خوب سے خوب تر کی ریس میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاید دنیا میں اگر ہر آدمی اکیلا ہی ہوتا تو اسے زندگی اتنی تسکین اور مشکل کبھی نہ لگتی۔ میاں، بیوی، بچے، بچوں کے بچے۔۔۔۔۔ یہ سب رشتے ہیں۔ انسان کو اس دلدل میں دھکیل دیتے ہوں شاید؟

ایک ہفتہ پورا ہو گیا تھا اور آج جمعرات کا دن تھا۔ آج میری شام کو چھٹی تھی۔ میں غور سے کوٹا کرائسٹین کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ یہ پورا ہفتہ میں نے باہر کی دنیا کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں اس شہر میں بالکل نیا ہوں۔ اسٹیشن سے ایک تانگے والے کو نہیں نے مولوی عظیم کے پڑانے محلے چلنے کو کہا۔ ہم زندگی میں روزانہ کئی فیصلے کرتے ہیں کہ کل یہ کرنا ہے، اگلے ہفتے وہاں جانا ہے۔ فدائی تاریخ کو فلاں کام کرنا ہے لیکن ان میں سے بہت کم فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تکمیل کا وقت قریب آتے ہی آپ کا دس ڈوبنا شروع کر دے۔

بس یہی حالت اس وقت میری بھی مولوی صاحب کے گھر کی طرف جاتے ہوئے ہو رہی تھی۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ شاید اب میں ان سے کئی زیادتی کی معافی، گلے کے قابل نہ رہی۔۔۔۔۔ پر طلب گار تو ہو سکتا تھا۔

تانگے نے مجھے پڑانے محلے کے گیٹ پر اتار دیا۔ یہ عصر کا وقت تھا، یہی کوئی شام پانچ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ میں دھڑکتے دس اور بھاری قدموں سے مولوی صاحب کی گلی کے نکلز تک آ پہنچا۔ لیکن اب آگے بڑھنے کی ہمت جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ مولوی صاحب کا دو بارہ سامنا کرنے کی وجہ سے اور کچھ اس نازنین کے گھر کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے خیال سے ہی جیسے میرے پسینے سے جھوٹ رہے تھے۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔ مولوی صاحب کی گلی میں تین چار ہی گھر تھے اور اس وقت گلی تقریباً سنسان ہی پڑی تھی۔ بہت دیر تک میں مولوی صاحب کے مکان کے نکلز کے دروازے کے قریب کھڑا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ اندر سے دُور کسی کے بونے کی مدہم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرا دل پھر سے اُچھلا۔ شاید یہ ایمان کی ہی آواز ہو۔ میں نے ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر کسی نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

”جی کون ہے۔۔۔؟“

یہ ایمان ہی کی آواز تھی۔ اس کی آواز کا جلت رنگ میں بھلا کیسے بھروسہ سکتا تھا۔ میرے لیے اس لمحے زمین اور آسمان کی گردش جیسے قسم کی گئی تھی۔ جواب میں میں نے جانے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے میرے منہ سے غصوں غاں کی کیسی عجیب سی آواز نکلی کہ اسے دوبارہ میرا نام پوچھنا پڑا۔ اتنی دیر میں ایمان دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئی تھی مولوی صاحب کے تمام ملے والوں کو شاید کسی کے گھر کے باہر دستک دینے کے تمام آداب کا سخت غلط ہوتا ہوگا اور ایمان شاید مجھے بھی انہی مہذب لوگوں میں سے کوئی ایک سمجھ رہی تھی جو دستک دے کر دس قدم دور جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اندر سے گر کوئی نسوانی آواز سنائی دے تو باقاعدہ منہ ہی پھیر لیتے ہیں تاکہ بے پردگی نہ ہو۔ لیکن بھلا مجھ جیسے جاہل کون روایتی آداب کا کیا پتہ تھا۔ میں نے تو اس طرح سے کسی کے دروازے پر دستک بھی زندگی میں پہلی بار دی تھی۔ میرے تو تمام دوستوں، رشتہ داروں اور جاننے والوں کے اونچے اونچے محل نہ مکانات تھے۔ جن کے کھسک پر بیٹھے دربان ہارن بجنے سے پہلے ہی گیت کھول دیتے تھے۔ اور میری اسپورٹس کار زن سے اندر داخل ہو جاتی تھی۔

شاید ایمان یہی سمجھی کہ میں مولوی صاحب کا کوئی ایسا ہی تہذیب یافتہ مہمان ہوں جو دروازہ ٹکٹکٹانے کے بعد نسوانی آواز سن کر دروازے سے اتنی دور جا کھڑا ہوا ہے کہ اس کی آواز بھی اندر اس تک ٹھیک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اور شاید اسی لیے اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر دروازے کو کھوڑا کھول کر پوچھنے کے لیے ایک جھری سی بتائی۔ میں گم سم سا ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس کی نازک اور غمزہ ملی انگلیاں دروازے کے سرے پر نظر آئیں اور پھر ایمان نے دوپٹے کا نقاب اوڑھے ہلکا سا دروازہ کھولا۔ اس کے دہم و گمن میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی دروازے کے، جسے پاس ہی کھڑا ہوگا۔ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی اور میری اور اس کی نظر ایک جگہ کے پے کر گئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی ہرئی جیسی آنکھوں میں وہی شدید حیرت لہرائی جو بس اس کی آنکھوں کا خاصہ تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہٹا، کچھ کہے تیزی سے وہاں پٹ گئی۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اس نے دروازہ بھی ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا۔ میں بھی ابھی تک اس کی نظر کی بجلی سے جیسے آنکھیں چندھیا جانے کے بعد ٹھیک ہونے کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ کچھ دیر میں حیا دروازے پر نمودار ہوئی۔ پہلے اس نے کھلا دروازہ ٹھیک طرح سے بند کیا اور پھر دروازے کی تھوڑی سی مکلی جھری سے ہی اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کے جواب کے بعد اس سے کہا کہ میں مولوی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ حیا نے مجھے بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے اس لیے آج ان سے ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔

”دیکھیں۔۔۔۔۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ میں ان کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس چند لمحوں کے لیے۔۔۔۔۔“

جواب میں حیا تو پچھ ہی رہی لیکن ایمان جو نہ جانے کب دروازے پر حیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی، اس کی آواز ابھری۔

”دیکھیں آپ خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔۔۔۔۔ اباجان کی حالت بڑی مشکل سے کچھ سنبھل رہی ہے۔ وہ آپ کو یہاں دیکھیں گے تو۔۔۔۔۔ یہ میری آپ سے التجا ہے۔۔۔۔۔ آپ یہاں دوبارہ نہ آئیے گا۔“

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دس کے سین چچ میں کوئی بڑا سا ٹھنڈا گھونپ دیا ہو۔ کسی نے بھاری پتھر سے اُسے کھل دیا ہو۔ لیکن اس

میں ان بے چاریوں کا بھی بھرا کیا قصور تھا؟۔۔۔ اپنے شریف باپ کی صحت کے لیے کوئی بھی بیٹی کچھ ایسی ہی ترکیب تجویز کرتی۔ چند لمبے تو مجھ سے جیسے کچھ بوائے نہیں گیا۔ پھر صبح نے دوبارہ اپنی ہمت مجتمع کی۔

”دیکھیں۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ لیکن میرا یقین کیجئے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، ورنہ میں کبھی اپنے گھر والوں کے سامنے اس بات کا ذکر بھی نہ کرتا۔ جو کچھ بھی ہوا میری وجہ سے ہوا۔ تو آزاد بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔ مجھ سے ان سے معافی مانگنے کا موقع مت چھینئے۔۔۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں۔“

ایمان کی آواز فضا میں پھر سے گونجتی۔

”اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وقت خود ہی اپنے آپ ان کے زخم بھر دے گا۔ لیکن آپ یوں بار بار گمان کے سامنے آتے رہیں گے تو شاید وہ اس بات کو کبھی بھل نہ پائیں۔ انہیں آپ سے اب کوئی لگہ نہیں ہے۔ آپ بھی اس بات کو قبول جائیں، جو ہوا سو ہوا، اب لکیر پٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

ایمان کی دلیل اپنی جگہ درست تھی، لیکن میرے لیے یہ جب درست ہوتی کہ اگر میرا مقصد آخری ہار مولوی صاحب سے معافی، نگ کر واپس چلے جانے کا ہی ہوتا۔ اس صورت میں میں تو سالوں انتظار کر سکتا تھا کہ جب مولوی صاحب کے دس کے داغ ہلکے پڑ جائیں گے تو سامنے آ کر معافی، نگ لوں گا۔

پر میرا مقصد تو اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مجھے ان سے پہلے ان کا اعتماد اور پھر ان کے گھر میں چھپو و گدڑی کا لعل جیتنا تھا جس کی ایک نظر نے میری دنیا ہی پلٹ کر رکھ دی تھی۔ وہ دونوں دروازے کی اس طرف پہنکی کھڑی میرے جانے کا انتظار کر رہی تھیں اور میں اس طرف کھڑا اپنے ذہن میں کوئی نئی تاویل گھڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اگر میں آج اس در سے پلٹ گیا تو شاید دوبارہ کبھی یہاں تک نہ پہنچ پادوں۔ میں نے آخری بار ہمت جمع کر کے جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ اندر برآمدے کی طرف سے مولوی صاحب کی آواز بھری۔

”کون ہے بھی دروازے پر وہاں۔۔۔؟“

اندرا ایک طویل سی خاموشی جاری ہو گئی۔ اسنے میں ایک اور بات عمل پندیر ہوئی۔ عبداللہ کی کے کمرے سے تھکے تھکے ہاتھ لگی میں داخل ہوا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ کچھ ٹھنک سا گیا۔ پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

”آپ۔۔۔۔۔ یہاں۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں مولوی صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا۔“

عبداللہ نے کچھ تامل کیا۔

”شاید ان سے آپ کا ملنا اس وقت کچھ بہتر نہ ہو۔“

”آپ ان سے اندر جا کر میرا تذکرہ تو کریں۔ اگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔“

عبداللہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ یہ چند لمحے مجھ پر کیا قیامت کی صورت گز رہے۔۔۔ یہ بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں پھنسی کا کوئی قیدی ہوں اور تختے پر کھڑا دوسری طرف کے مقتول کے درخشاں کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں کہ آیا مجھے معاف کر دیا جائے گا یا پھر لیو رکھنا چاہیے۔

صدیوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور عبداللہ برآمد ہوا۔ میں نے اُمید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ کر بولا۔

”آپے۔۔۔ اندر آ جائیے۔“

میری زک ہوئی سانس پھر سے جیسے بحال ہو گئی۔ میری جان میں جان ہی آ گئی اور میں عبداللہ کے پیچھے سر جھکائے پھر سے اس گھر میں داخل ہو گیا جہاں وہ رہتی تھی۔ ہم صحن سے ہوتے ہوئے اسی بیٹھک کی طرف بڑھ گئے جو کھڑکی کی جالیوں سے پار برآمدے سے ملتی تھی۔ عبداللہ مجھے بندہ کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں کے لیے ایک سناٹا سا طاری رہا۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ نہ تھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سب کچھ ویسے ہی پڑا تھا۔ ہر ترتیب ویسے ہی تھی جیسی میرے یہاں پہلی آمد کے وقت تھی۔ لیکن تب کے اور اس وقت کے میرے استقبالیوں میں کس قدر فرق تھا۔ وقت کی بازی اچھے، چھوٹے کو پٹ کر رکھ دیتی ہے۔ کچھ دیر میں دروازے پر مولوی صاحب کے کھانسنے کی ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب چھتری کے سہارے ٹپکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہ شکل سے برسوں کے بیمار معصوم ہو رہے تھے۔ میں ان کے استقبال کے لیے احراما کھڑ ہو گیا۔ وہ آ کر بچپ چاپ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میرے سلام کا انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔ کچھ دیر، حوال پر گھمبیر سے خاموشی طاری رہی۔ میرے تو سارے نظریں جیسے پہلے ہی کھو گئے تھے، خود مولوی صاحب بھی گم سم سے تھے، پھر میں نے ہی خاموشی توڑی۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔“

”بھلا ہوں اب۔۔۔۔۔ شکر ہے، لگ کا۔“

”کیا آج میں آپ سے معافی کی اُمید کر سکتا ہوں۔“

”جو بیت چکا اس کا بار بار ذکر کیوں کرتے ہو؟“ معاف کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ معافی دینے والی صرف اس کی ذات ہے۔ میں سب کچھ بھل چکا ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ۔ یہ بڑے لوگوں کے یاد رکھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ ہم چھوٹے لوگوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔“

ان کا لہجہ آخر میں خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ یہ بھی انہی کا ظرف تھا کہ وہ میرے وجود کو اس وقت خاموشی سے اپنے ہی گھر میں برداشت کر رہے تھے، کوئی اور ہوتا تو شاید مجھے دھکے دے کر دروازے سے ہی واپس لوٹا دیتا۔

”جو کچھ میرے گھر والوں نے آپ سے کیا وہ ان کی کم ظرفی اور ناقابلِ تلافی گناہ ہے۔ لیکن آپ سب لوگوں سے خفا کیوں ہیں؟“

مولوی صاحب کے لہجے میں حریدگی آتی تھی۔

”جائے دو میاں۔۔۔۔۔ یہ سب کھیل تماشا ہے بڑے لوگوں کا۔۔۔۔۔ اور تم جیسے امیر زادوں کے لیے روز کا کھیل، پر ہم سفید پوشوں کی عمر بھر کی کمی چند بھرم ہی تو ہوتے ہیں۔ تم لوگ ہم جیسوں کے پاس ان کا وہ بھرم بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہتے۔“

”کیا میرا سب سے بڑا قصور آپ کی نظروں میں بس یہی ہے کہ میں ایک امیر زادہ ہوں۔۔۔۔۔ امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ کیا کسی کا امیر ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی نیت پر کوئی ہمیشہ کے لیے اپنا اعتبار ہی کھو دے۔ تو پھر مجھے بتائیے کہ اپنی چائی حایت کرنے کے لیے مجھے کس امتحان کس آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ میں آپ کا اعتبار پانے کے لیے آگ کے کسی بھی دریا سے گزرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔۔۔۔۔ اور پھر آپ میری جس امارت سے خفا ہیں وہ تو خود میری اپنی بھی نہیں ہے۔ دوسروں کی عطا کردہ ہے۔ آپ نے تو خود کہا تھا اُس دن کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ پھر دوسروں کی دی ہوئی اس شناخت کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔“

میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا اور اپنی رو میں جانے کیا کچھ بول گیا۔ مولوی صاحب کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جیسے میری باتوں پر غور کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

”تم گرو واقعی معافی کے طلب گار ہو اور چاہتے ہو کہ میرے دل سے تمہارے گھر والوں کی کمی ہوئی باتوں کا بوجھ ہٹ جائے تو تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ آج کے بعد تمہیں مجھے اس گھر کے راستے کو، اس گھر کو اور اس میں بسنے والے کسی لوگوں کو ان کی عزت اور وقار کی خاطر ہمیشہ کے لیے بھانا ہوگا۔ میں نے تمہاری بات ٹھنڈے دل سے سن لی ہے اور تمہاری معذرت کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اب تمہیں بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم واقعی اپنے اور اپنے گھر والوں کے طرز عمل پر شرمندہ ہو۔ بولو دے سکتے ہو مجھے یہ وعدہ۔۔۔۔۔؟ پانا چاہتے ہو اپنا بڑا بھرم و پس؟“

مجھے لگا کہ میں راجواب سا ہو گیا ہوں۔ ضرور شا کرنے اس ایک ہفتے میں مولوی صاحب سے دبے لفظوں میں میری مرضی کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور کیا ہوگا۔ سچی انہیں اپنی جیش بندی کے لیے اتنی لمبی تنہید باندھنے کی ضرورت جیش آئی تھی۔ گویا وہ جانتے تھے کہ وہ میرا مقصد اس معافی سے سوا بھی کچھ مزید ہے۔۔۔۔۔ کچھ اور ہے۔

میں نے اپنی ہمت پھر سے جمع کی۔

”دیکھیں۔۔۔۔۔ اُس دن آپ نے کہا تھا کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ میں جو بھی ہوں دوسروں کے بل بوتے پر اور اس گھر کی شان و شوکت کی وجہ سے ہوں۔ میں نے اگلے دن ہی دو گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب میں یہاں اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ آیا ہوں۔ میرا اس گھر کی دولت اور شان و شوکت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس وقت ایک معمولی مزدور ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ خود دو وقت کی روٹی کما سکتا ہوں۔ ہر قسم کی ضمانت دے سکتا ہوں، دلوا سکتا ہوں۔ جو صرف اور صرف میری ذات کے بل بوتے پر ہوگی۔ اس میں میری ماضی کی شناخت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اور اپنی اسی نئی شناخت کے بل پر میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

مولوی صاحب کی تجویری پر غصے کے غل نمودار ہوئے لیکن انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو قابو میں رکھا۔

”کوئی بھی بات ڈبرانے سے پہلے اس بات کا خیال ضرور رکھنا کہ میرے کچھ بھرم ابھی باقی ہیں۔ کہیں تمہاری درخواست ان آگینیوں کو



بھی پارہ پارہ نہ کر دے۔ جو تم سوچ رہے ہو۔ وہ ناممکن ہے۔“

میں جب مولوی صاحب کے گھر کے لیے اسٹیشن سے چلا تھا تو میں نے ایسا بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے آج ہی اس سلسلے میں حتی بات کرنی پڑے گی۔ لیکن مولوی صاحب کے حتی اندازے خود بخود بات کو اس کا حتی رخ دے دیا تھا۔

کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔ پھر میں نے ہی یہ کھڑ توڑا۔

”میں نے سوچا تھا کہ کسی حتی بات کے لیے کسی بزرگ کو آپ کی طرف بھیجوں گا۔ میرے گھرانے کے علاوہ بھی کچھ لوگ، اور ہیں جو میری انتہا آپ تک پہنچا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے شاید پیسے ہی آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ صرف مجھے اتنا بتا دیں کہ مجھ میں کیا کمی ہے۔ اپنی دولت اور امیری کی بدنامی کا طوق تو میں پیسے ہی اپنے گلے سے اتار چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی کمی کوئی خالی ہے تو میں اسے بھی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے دھتکارنے کی کوئی وجہ تو بتا دیں۔“

مولوی صاحب کا ضبط اب جواب دے چکا تھا۔ دوزخ سے غصے میں چلائے اور کھڑے ہو گئے۔

”بس۔۔۔۔۔ بہت ہو گیا۔ کیوں ہم لوگوں کو بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ مولوی عظیم جس گھرانے میں بچے کو درس دینے جاتے تھے۔ اُسی گھرانے میں، اپنی بیٹی یا ہادی۔ تم چاہتے ہو کہ سارا زمانہ ہم پر انگلیاں اٹھائے۔ جو الزام تمہارے گھروالوں نے مجھ پر اور میری بیٹیوں پر لگایا ہے، اُسے ہم اپنے ہاتھوں سے بچ کر دکھائیں۔ نہ میاں نہ۔۔۔۔۔ ہمارے حال پر کچھ تو رحم کرو۔“

”تو گویا آپ کو صرف لوگوں کی باتوں کا ذرہ ہے۔ اگر میرے گھروالے اگر آپ سے بدتمیزی نہ کرتے اور میری خوشی کے لیے یہ دشتے لے کر آ بھی جاتے تو آپ اُسے قبول نہ کرتے۔“

”کبھی نہیں۔۔۔۔۔ ہمارا اور تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔ تمہاری تربیت کچھ اور ہے۔ تم جن اغویات کو پیارا اور محبت کا نام دیتے ہو ہمارے

دہ اُسے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ صرف گناہ، میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں مجھے مزید گناہ گار مت کرو۔ ہماری بیٹیاں، یہ لہ دین گھروالوں میں نہیں

بیہی جاتیں جہاں سالوں سال کسی نے نماز تک نہ پڑھی ہو۔ جس گھر کے نوجوانوں کو پہلے یا بمشکل دوسرے کلمے کے بعد کے کلموں کا علم تک نہ ہو۔

جہاں قرآن کو صرف سجا کر حلق میں رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا ہو۔ جہاں عورت مرد بے حجابانہ ملتے ہوں۔ تمہاری تربیت بھی تو ایک ایسے ہی گھر

کی ہے۔ صرف گھر چھوڑ دینے سے نرسن کا ضمیر نہیں بدل جاتا۔ میں اپنے آنے والی نسلوں کو تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے

اب اجازت دو۔“

مولوی صاحب غصے میں میری کوئی بات سننے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی عبد اللہ اندر آ گیا اس کے ہاتھ میں

چائے کی ٹرے تھی۔ میں نے جانے کا عذر کیا لیکن اس نے پھر بھی جلدی سے چائے کپ میں انڈیل دی تھی۔ میں نے دو گھونٹ زہر مار کیے۔ عبد اللہ

مجھے چھوڑنے سے باہر لگی تک آیا اور جاتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کر کے بولا۔

”بچا جان کی باتوں کا بُرا امت متائیے گا۔ اس وقت وہ اپنے آپ میں نہیں تھے۔ میں نے اسی لیے آپ کو منع کیا تھا کہ آپ اب ان سے

دوبارہ نہ ہی میں تو بہتر ہوگا۔ بہر حال جو ہوا اُسے بھول جائے۔ شا کر چکانے اس دن بتایا تھا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ ماں باپ کا بڑا مقام ہوتا ہے، ان سے اتنی ناراضگی اچھی نہیں مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ عہد اللہ مجھے محلے سے باہر چھوڑ کر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چلی رہی تھیں۔ میں تو ٹھیک طرح سے عہد اللہ کو خدا حافظ بھی نہیں کہہ سکا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں پیدل ہی کس جانب روانہ ہوں۔ مولوی صاحب کے جنے میرے کانوں میں پھلے ہوئے سیسے کی طرح بہہ بہہ کر داخل ہو رہے تھے۔ کیا واقعی محبت بھی ایک گناہ ہے۔۔۔؟ اگر محبت کرنا گناہ ہے تو پھر یہ کیسا گناہ ہے جو مجھے بے چینی کے بجائے خوشی اور سکون دے رہا تھا؟

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مولوی صاحب کے انکار کی وجہ صرف طبقاتی فرق ہوگا، میری غریبی کا فرق۔۔۔ لیکن یہاں تو جنگ مذہب اور محبت کے درمیان تھی۔ مذہب محبت کو دھتکار رہا تھا۔ میں اس وقت کچھ نہیں پار تھا کہ اگر میں پورے چھ کپے یاد کر لیتا اور میں بھی مولوی صاحب جیسا شری لباس پہن کر اگر کسی مسجد کے متولی کی حیثیت سے ان کی بنی کار شدہ لینے جاتا تو میں کیوں ان کے لیے قابل قبول ہو جاتا۔۔۔؟

اگر میں مذہب سے ڈرتا تو اس میں میرا کیا تصور تھا، ایمان کے لیے میری محبت تو ہی طرح اپنی جگہ قائم تھی۔ اتنی ہی پاک تھی جتنی کسی مذہب کی شمولیت کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ ٹھیک ہے میں اپنی تربیت کی وجہ سے کچھ خاص اچھا مسلمان نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا میری محبت سے کیا تعلق تھا۔

مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کب ریڈیو سائنسین آ پہنچا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور آخری سیل بھی نکل چکی تھی۔ پلیٹ فارم میرے دس کی طرح دیران پڑا تھا۔ انکا ڈکاکہین ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ میں گم سم سا آ کر ایک خالی بیچ پر بیٹھ گیا میں نہیں جانتا تھا کہ میری مذہب سے ان جانی ذوری آج مجھے اور میری محبت کو اس قدر حقیر بنا دے گی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ مولوی عظیم کی باتوں نے مجھ سے پہلے میں مجھ سے میری ذات کا۔۔۔ میری محبت کا غور و چین کیا تھا۔ آج مجھ سے زیادہ تنہا شخص اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔۔۔ کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

## تضہ نصف صدی کا

لاکھوں دلوں کی دھڑکن **محی الدین نواب** کے جاذبِ قلم سے ایک خوبصورت ناول تقسیم ہند (قیوم پاکستان) اور پاکستان کے حالات و واقعات کے تناظر میں لکھی گئی ایک پراثر تحریر آزادی پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کا سفر طے کرتی ہوئی داستان جہاں حالات اور مسائل ویسے ہی ہیں جیسے نصف صدی پہلے تھے۔ **کتاب گھر** کے ناؤں نیکشن میں دستیاب ہے۔

## محبت کے تین پہر

میری اس دن کی یونہی رشتی ہال میں کی گئی تقریر نے مجھے خاصا مقبول کر دیا تھا، کہتے ہیں متاثرہ ہونا بھی مقبول ہونے کی ایک بہت بڑی نشانی ہوتا ہے۔ اب میں مقبول زیادہ تھا یا متاثرہ۔۔۔؟ اس کا فیصلہ ہونا بھی باقی تھا۔

اگلے دن یونیورسٹی کے کلاس میں سر آؤنگ نے ہم سب کو محبت پر بحث کرنے کی دعوت دی۔ ریکارڈ نے کہا محبت فائن کی بوجھ کی طرح ہوتی ہے، جب تک ختم نہ ہو جائے، پتہ چلنا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ محبت جسم ہے جسے پائے پناہ پاس نہیں مٹ سکتی۔ ٹیٹا نے کہا محبت دارو روپ میں لٹکے کپڑوں کی طرح ہے۔ روز بدل کر پہننے کو دل کرتا ہے۔ سارہ نے کہا محبت اور کچھ نہیں، بس جسم میں ہارمونز کی تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔ اور تبدیلی بھی وہ جو غیر مستقل ہوتی ہے۔ ہارمونز جیسے ہی واپس اپنی مستقل جگہ پر واپس آئے نہیں کہ محبت ختم۔

کسی من چہ نے پیچھے سے گرو لگا لی کہ لیکن جب تک محبت کے ہارمونز واپس اپنی جگہ لینے کے لیے آتے ہیں، تب تک ان دو پریموں کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ اس بات پر ساری کلاس ہی کھٹکھٹا کر ہنس دی۔ پھر سر آؤنگ میری طرف متوجہ ہوئے۔

”اور محاذ تم۔۔۔۔۔ تمہارا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”سر۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبت بھی انسان پر کسی دن کے پہروں کی طرح وارد ہوتی ہے۔“

”او رینگی۔۔۔۔۔ کیا آپ کلاس کے سامنے محبت کے ان پہروں کو بیان کرنا پسند کریں گے؟“

”محبت کا پہلا پہر ہمیشہ تجھیں، تنگی اور شدید پیاس لے کر آتا ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب آپ کا محبوب آپ سے دور ہوتا ہے۔ آپ کے جذبے آپ ہی تک محدود ہوتے ہیں اور ایک طرف محبت کی یہ تڑپ آپ کو ہر لمحہ کانٹوں پر چلنے کا احساس دلاتی ہے۔۔۔۔۔“

پھر اظہار ہو جاتا ہے اور خوش قسمتی سے اگر اظہار قبولیت کا شرف بھی پالے تو محبت کا دوسرا پہر شروع ہوتا ہے۔ تب محبت کی اصل ٹھنڈی چھاؤں کا اور ابدی سکون کا احساس ہوتا ہے، تب حقیقی دھوپ میں بھی ٹھنڈک ملتی ہے اور جتنا صحرا بھی ٹھلسا بن جاتا ہے۔ ایسا ٹھلسا جس کا ساکت رکا ہوا پانی بھی کسی ٹپٹپے اور صاف بہتے جھرنے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔“

مجھے ریکارڈ کی آواز کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ حالانکہ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

”اور محبت کا تیسرا پہر۔۔۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟“

”بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو محبت کے ان دو پہروں کو جمیل کر محبت کے تیسرے اور آخری پہر تک پہنچ جاتے ہیں۔ محبت کے تیسرے پہر میں پہلے پہر سے بھی زیادہ شدید تنگی، شدید تیز پیاس اور بے چینی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تنگی، یہ پیاس پانی کی پیاس ہوتی ہے۔“

سارہ کے منہ سے حیرت میں نکلا، وہ پوچھ کر ضرور پچھتائی ہوگی۔

”پاینے کی پیاس۔۔۔۔۔؟ یہ کیسی پیاس ہوتی ہے؟“

ہاں۔۔۔۔۔ پاینے کی پیاس۔۔۔۔۔ جب آب حیات کا دریا سامنے بہہ رہا ہو تو کون ہوگا جو صرف ایک آدھ گھونٹ پر اکتفا کرے گا

؟۔۔۔۔۔ پاینے کی پیاس، جدائی کی پیاس سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اور اگر یہ پیاس لگ جائے تو من جدائی سے زیادہ اذیت ناک بن جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے ہاری محدود زندگی کبھی ہمیں اس دریا سے پوری طرح سیراب نہیں ہونے دیتی۔ ہم ابھی چند گھونٹ ہی حلق سے اتار پاتے ہیں کہ جانے کا وقت آ جاتا ہے۔“

ساری کلاس پر اک سنا سنا سا چہ یا ہوا تھا۔ جم کو شاید کلاس کی وہ محنت پسند نہیں آئی۔ وہ میری باتوں کا اثر زائل کرنے کی نیت سے طنزیہ لہجے میں بولا۔

”بہت خوب۔۔۔۔۔ اب یہ بھی بتاتے جاؤ کہ محبت کے تیسرے پہرے گزرنے کے بعد انجام کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“

میں نے مسکرا کر جہی طرف دیکھا۔

”انجام وہی ہوتا ہے جو کسی بھی بھرپور دن کا تینوں پہرے گزرنے کے بعد ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ یعنی شام۔۔۔۔۔ تین پہروں کے بعد محبت کی

بھی شام ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ خاموش۔۔۔۔۔ ٹھہری ہوئی اور ساکت سی اک خوبصورت شام۔۔۔۔۔ محبت کی شام۔“ میں خاموش ہو گیا۔ کلاس نے تائیاں بجا بجا کر اور ڈایک فٹ کر آسمان سر پر اٹھایا اور ان میں سب سے سرفہرست رہی تھی۔ سارہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس دن کے بعد سے میں نے محسوس کیا کہ میرے اور کلاس کے باقی طلباء کے درمیان جو ایک عجیب سی جھجک تھی وہ ایک دم ہی ختم ہو گئی

تھی۔ اب آتے جاتے لڑکے لڑکیاں مجھے بھی اسی طرح چچ چلا کر پوری گرجوٹی سے خوش آمدید اور الوداع کہتے تھے جیسے باقی سب۔ پس میں وٹش (wish) کرتے تھے۔

کامران میری اس کامیابی پر بہت خوش تھا، اُس نے تو باقاعدہ پوری ایک شام اس خوشی میں ہی منائی، اور مجھے زبردستی سنسنر لندن کے

ایک بہت بڑے سینما بھی لے کر گیا جس میں ایک ہی عمارت میں کئی ہال تھے۔ اور ہر حال میں ایک فلم لگی ہوئی تھی۔ کوئی عجیب سی کاڈ بوائے فلم تھی اور

پھر اس پر دوسری مصیبت کامران کی پوری فلم میں مسلسل روتاں کنشری۔ وہ شاید پہلے بھی یہ فلم دس مرتبہ دیکھ چکا تھا لہذا اُسے مکالمے تک زبانی یاد تھے۔

وہ ہر منظر سے پہلے ہی مجھے اس کا پورا خلاصہ بتا دیتا تھا۔ تنگ آ کر جب میں نے اُسے سینما ہال سے نکل جانے کی دھمکی دی۔ تب جا کر وہ بمشکل چپ

ہوا لیکن تب تک فلم ہی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ جب اسکول کے دور میں ہم کلاس سے ہٹا کر کوئٹہ کے مشہور ریگل سینما میں صبح کا

شو دیکھنے جاتے تھے تب بھی ہال میں گھس کر بیٹھ جاتا کہ کامران صاحب پہلے بھی کسی نہ کسی طرح انتقام کر کے یہ ٹارزن یا سندھ دے کے کارناموں سے

بھر پور فلم دیکھ چکے ہیں اور آج مجھے اور ہمارے ساتھ بھگنے والے دوسرے گینگ کو صرف بور کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ تب ہم نے اس مسئلے

کا حل یہ نکالا کہ ہم اپنے ساتھ سفید رنگ کی بڑی کپڑے کی سر جیکل نیپ کی ریل لے کر جاتے اور جہاں کامران کی ٹیمیں شروع ہوتی ہیں ہم سب مل کر

اُس کے منہ پر یہ چوڑی نیپ کا پورا رول لپیٹ دیتے۔۔۔۔۔

اُس رات بھی ہال سے نکل کر گھر جاتے ہوئے میں اور کامران بچپن کی ان حسین یادوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ سڑکوں پر سے برف بنانے والی مشین نے سڑکوں کے کناروں پر برف کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر جمع کر دیے تھے، جن میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہنگلی چٹکی سڑک پر رات کی وجہ سے اکا دکا گاڑیاں بھاپ اڑاتی گزری تھیں اور فٹ پاتھ پر لیٹ ٹائٹ شو سے نکلنے والے جوڑے ایک دوسرے کی ہانپوں میں ہانپیں ڈالے، ایک دوسرے سے چپکے، سرگوشیاں کرتے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔

اتنے میں ایک گاڑی نے ہمیں کراس کیا اور پھر آگے جا کر رک گئی۔۔۔ پھر فوراً ہی ریورس میں ہماری طرف بڑھی اور قریب آ کر رک گئی۔۔۔ اندر سے ربیکا نے سر نکالا اور زور سے ہاتھ ہلکا کر چلائی۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ کتنا حسین اتفاق ہے، آؤ ہمیں جوائن کرو۔“

ربیکا کے ساتھ گاڑی میں میرے دو اور کلاس فیلو بھی تھے جن میں سے ایک ربیکا کا کزن بھی تھا۔ یہ انکشاف بھی مجھ پر اسی رات ہوا تھا۔ میں نے ربیکا کا شکریہ ادا کیا کہ ہم آج پیدل ملاقات کے موڈ میں ہیں۔ کامران نے جلدی سے گھور کر مجھے کہنی ماری۔ اس کی لٹف میں کسی بھی خوبصورت لڑکی کی کوئی بھی پیش کش ٹھکرانے کا سوال ہی کب تھا۔ اوپر سے ربیکا کی خند، ہم دونوں کو ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا۔ ربیکا کے کزن نے تھوڑی دور جا کر سڑک کے کنارے بنے ایک اوپن انڈر پاس روڈ کے پاس گاڑی روک دی۔ اس ریسنورنٹ کی پچھلی جانب سے کچھ دور بہتے دریاے نیلز کے جھگڑے پانچوں کا عکس اور سرسراہٹیں صاف سُنی جاسکتی تھیں۔ انہوں نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ کامران ربیکا کے کزن اور میرے دوسرے ہم جماعت کو ربیکا سمیت ہاتھ دیکھنے کے کڑ اور ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ دو لڑکوں کا ہاتھ وہ اس اُمید پر دیکھ رہا ہے کہ اس کے بعد آخر کار اسے ربیکا کا ہاتھ تھامنے کا موقع بھی ملے گا۔ یہ اس کا بہت بڑا ناظرینہ روات تھا، اور سچ ہے کہ وہ اس طریقے سے بہت مرتبہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ وہ تینوں نہایت انہماک سے کامران کو اپنے اپنے ہاتھ دکھا رہے تھے۔ میں اُنھ کریسنٹ کے فرش کے آخری حصے میں نصب لوہے کے اس ڈنگے کی طرف چلا آیا جس کے پار ڈور تک گہرائی تھی اور یہیں سے دریاے نیلز پر بنا وہ ٹیل اور اس کے نیچے سے گزرتے اسٹیر اور چھوٹے بجری جہاز اندھیرے میں چمکتے جگنوؤں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں دیر تک ڈور بہتے پانی میں ان جھملائی روشنیوں کا عکس دیکھتا رہا۔ پھر آہٹ محسوس ہونے پر مڑا تو ربیکا خوبیت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”نہیں جب بھی تم سے ملتی ہوں، مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جسے میں پھر سے ایک نئے انسان سے مل رہی ہوں۔“

”ہر انسان کی بہت سی جہتیں ہوتی ہیں۔ پیاز کی طرح، اُسے جتنا چیلو، اتنی ہی مرتبہ ایک نئی تہا بھرتی ہے۔ اب یہ پھیلنے والے پر منحصر ہے کہ وہ دوسرے کی کتنی کھوج کر سکتا ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری کھوج اس عام کھوج سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس دن جب تم کلاس میں محبت کے مختلف پہر بیان کر رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کو جانا ہے اور ایک مجھ پر ہی کیا منحصر ہے، اس دن کے بعد ساری کلاس ہی محبت کے ان نئے



پہلوؤں کو کھوجنے میں لگی ہوئی ہے۔ تم نے ہم سب کو محبت کا ایک نیا چہرہ دکھا دیا ہے۔“

”چہرہ نیا نہیں ہے، بس اس سے پہلے ذرا اوچھل تھا، محبت ایک نظریہ ہی تو ہے اور ہم سب اس نظریے کو اپنی اپنی عینک سے دیکھتے ہیں۔“ وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”سنو۔۔۔ کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“

پھر خود ہی اُس نے فوراً اپنے ہی سوال کو جھٹکا دیا۔

”نہیں نہیں۔۔۔ یہ سوال تو تم سے پوچھنا ہی فضول ہے۔ جو انسان محبت کو اتنا زیادہ پہچانتا ہو، وہ خود ضرور اس تجربے سے گزرا ہوگا۔ تم

مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے محبت کو کیسا پایا؟“

”محبت میرے لیے اُس رنگ زدہ گلوٹین کی طرح ثابت ہوئی جس کے نیچے رکھا سرکٹ تو جاتا ہے لیکن پوری طرح دھڑ سے میسر نہیں ہو

پاتا۔ جسم تڑپا رہتا ہے۔ جان دھیرے دھیرے اور نکلنے نکلنے نکلتی ہے۔ خون کے چھینٹے مرتے مرتے بھی اُس پاس کی دیواروں کو محبت کی نشانی کے

طور پر رنگ جاتے ہیں۔“

ربیکا نے افسانے سے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

”اف۔۔۔ اتنی اذیت ناک محبت۔۔۔ میڈی۔۔۔ پھر تم اب تک زندہ کیسے ہو۔“

”محبت کی تو پھر اذیت کا ذکر کیسا مس رہی۔“

میں نے مسکرا کر ربیکا کو اس نام سے پکارا جس سے تمام کلاس اسے پکارتی تھی۔ دھڑکا کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتی رہی۔

”میں نے کہا تھا۔۔۔ تمہارا ہر روپ نیا ہے، جانتے ہو میں اپنے سارے نہانے دوستوں اور سارہ کو ناراض کر کے تمہارے ساتھ

ڈیٹک پر کیوں آ بیٹھی تھی۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس لیے کہ جس دن بلیک بورڈ پر وہ بے ہودہ غرے لکھے دیکھے تھے۔ جب میں بہت دیر پہلے سے قصیں دیکھ رہی تھی۔ تم نے جس اطمینان

سے ان کے چیلنج کو قبول کیا اور تمہاری آنکھوں میں جو ایک عزم تھا ایسا عزم صرف ان لوگوں کے چہرے پر دکھتا ہے جو دنیا سے ٹکرا جانے کی ہمت

رکھتے ہوں اور مجھے بچپن سے ہی بہادر اور نہ عزم لوگ اچھے لگتے ہیں۔ تم مجھے پوری کلاس میں سب سے مختلف دکھائی دیے۔ اس لیے میں نے

تمہارے ساتھ ہی بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہر گز رتا دن میرے اس فیصلے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔“

اسنے میں کا حراں جو بہت دیر سے ربیکا کو میرے پاس کھڑے دیکھ کر ڈر سے نہانے سے منہ ہٹا رہا تھا، اس کا صبر جواب دے گیا اور

اُس نے باقاعدہ آوازیں دے کر ہمیں بلانا شروع کر دیا۔ لگتا تھا ربیکا مزید بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہمیں اپنی باتوں کا سلسلہ یہیں ختم کرنا پڑا اور ہم

دونوں میز پر پڑی اپنی کافی کو مزید شہنشاہ ہونے سے بچانے کے لیے اس کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

## محبت اور خدا

اس دن مولوی صاحب کی باتوں نے میرا اندر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اپنی محبت کو پانے کے لیے مجھے جس شناخت کی ضرورت تھی وہ نہیں حاصل کرنی ہے لیکن اس دن پتہ چلا کہ مجھ سے تو میری کچھلی شناخت بھی چھن گئی ہے۔

بچ میں ایک آدمہ بارشا کر سے پانی حلی جا کر مل آتا تھا۔ اسی سے پتہ چلتا رہتا تھا کہ گھر میں کیا ہوتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے شاید میری غیر موجودگی سے سمجھو نہ کر لیا تھا۔ باغیوں کو جتنی جلدی لوگوں کے دل و دماغ سے پھینک نکالا جائے۔ اتنا ہی بہتر ہوتا ہے ورنہ ان کی عبادت کے جرائم دوسروں کے ذہنوں کو بھی متاثر کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ بات بھلا کشنر صاحب سے بہتر اور کون جان جاسکتا تھا۔ سوانہوں نے گھر میں میرا نام مینے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ کشنر صاحب کا خیال تھا کہ میں کامران کے پاس لندن جا چکا ہوں۔ کیونکہ ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا اور میرا کچھ تہہ پتہ نہیں تھا گھر والوں کو۔ کوئی نہ کوئی اتنا بڑا شہر بھی نہیں تھا جہاں میں اتنا عرصہ کسی دوست کے گھر ان سے چھپ کر ٹھہر سکتا۔۔۔۔۔ شاید وہ کو بھی یہی سوچ کر سکون مل گیا ہو ورنہ وہ مجھے ہر جگہ تلاش تو کر ہی چکا تھا۔ ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں بھی یہیں اسی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پچھلے چار ہفتوں سے محرومی کر رہا تھا۔

گھٹ سے بھی شا کر کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن میں اس سے کچھ پوچھ ہی نہیں پایا۔ جب میں شا کر سے رخصت ہو کر جانے لگا تب اس نے اکیلے جاتے دیکھ کر مجھے پیچھے سے آواز دی تھی۔ میں غصہ کیا۔ گھٹ چپ چاپ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر چاکل ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”یہ آپ نے کیا حالت بنائی ہے اپنی بھئی، اس محبت نے تو آپ کو برا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ سب میری غلطی ہے بھئی۔ نہیں آپ کو اس سے ملتی نہ۔۔۔“ اس سوڈ سے گلی کی آواز نہ دے گئی۔ میری آنکھیں بھی بھرا آئیں۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں اس وقت اس کے سامنے رو پڑتا تو وہ دھماکے میں مار کر روئے لگتی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے چھپتے پایا۔

”گلی ایک بات بتاؤں؟“

گلی چپ ہو کر مجھ کو دیکھنے لگی۔ ”جی“

”تم آج بھی چھپن کی طرح روتے ہوئے بہت بُری لگتی ہو۔“

چند لمحوں تو وہ حیرت سے مجھ کو دیکھتی رہی اور پھر جب اسے میری اس کو خُپ کروانے کی چال سمجھ میں آئی تو روتے روتے ہنس دی۔ گلی نے مجھے بتایا کہ وہ میرے مولوی صاحب سے ملنے کے بعد دو مرتبہ ایمان کے گھر جا چکی ہے۔ مولوی صاحب اب کافی بہتر ہیں۔

گھٹ سنے اُسے میرے گھر چھوڑنے، دویوں در بدر بھٹکنے کی تمام داستان سنائی تھی۔ گھٹ کی باتیں سن کر ایمان تو چپ بیٹھی حسب معمول اپنے پاؤں کے ناخن سے زمین پر بچھ قالین کریدتی رہی ابستہ حیا سے صبر نہیں ہوا اور وہ رو پڑی تھی۔ ایمان نے گھٹ سے صرف اتنا کہا کہ اگر میں کبھی گھٹ سے ملوں تو وہ مجھ سے کہے کہ میں اپنی یہ ضد چھوڑ کر واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔

یہ تھا حتی صدیوں کے بعد اس دلربا کا میرے لیے ایک پیغام صرف یہی چند لفظ۔۔۔۔۔ کون جیتا ہے تیری ڈلف کے سر ہونے تک۔۔۔۔۔

لیکن یہ لفظ بھی میرے لیے بہت تھے، چلو کسی بہانے ہی سہی۔۔۔۔۔ میرا ذکر تو اس کے لبوں پر آیا، یہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ گھٹ میرے ہاتھوں کے چمالے ٹھونچو کر دیکھتی رہی اور اس کی آنکھیں بھیکتی رہیں۔ مجھے گھٹ کو بتانا پڑا کہ میں ریلوے اسٹیشن پر فلی گیری کا دھندہ کرتا ہوں۔ لیکن اس سے یہ وعدہ بھی یہ کہ وہ اس بات کے بارے میں اپنے یا میرے گھر والوں کو نہیں بتائے گی۔ شاکر نے کبھی میرا بچہ کر کے میرا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب میں مناسب سمجھوں گا خود اسے بتا دوں گا۔

میں نے اپنی جیب سے وہ دوسو نوٹ لٹالے جواب تک ایمان کی غیر موجودگی میں مجھے اس کے ہونے کا احساس دلانے رہے تھے۔ وہی دونوں موتی جو حویلی کی سٹڈی میں ایمان سے ملاقات والے دن اس کے جانے کے بعد ملے تھے۔ اب تک مجھے جب کبھی اپنی تنہائی میں سخت تنہاؤ میں، دن بھر کی مشقت کے بعد نونے بدن کے ساتھ دیننگ روم کی کسی سخت آرام کرسی پر گر کر پڑے ہوئے، جب کبھی بھی میرا دل بہت اُداس ہوتا یا ایمان کی بہت یاد آتی تو میں ان دوسو نوٹوں کو اپنی چمکیں بند کر کے اپنی آنکھوں پر رکھ لیتا تھا، پل بھر میں ان کی ٹھنڈک میرے بند پونوں سے ہوتی ہوئی میری رُوح کی گہرائیوں تک کو چھو لیتی۔ میرے تصور میں ایمان اُتر آئی، انہی جگہ جگہ، گہرائی ہوئی نظروں کے ساتھ، پھر وہ پونہ میرے سامنے بیٹھی رہتی اور میں گھٹوں اس سے اپنے من کی باتیں کرتا رہتا۔ اور میری ساری رات انہی سچوں میں گزر جاتی۔

یہ تصور اور خواب بھی کیسی نعمت ہوتے ہیں۔ انسان سے اگر شاید تصورات اور خواب دیکھنے کی صلاحیت چھین لی جائے تو وہ زیادہ عرصہ جی نہیں پائے گا۔ خواہشوں کی ٹکٹن اس کا گھاد دبا کر اسے مار ڈالے گی۔ ہم اپنی نوے فیصد خواہشات اور آرزوؤں کو اپنے تصورات اور اپنے خوابوں کے ذریعے ہی تو پاتے ہیں۔

گھٹ نے حیرت سے ان دوسو نوٹوں کو دیکھا، میں نے اُسے ان ہسول گولہ کی پوری کہانی سنائی اور وہ دونوں موتی گھٹ کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ ”یہ موتی اُسے واپس دے دینا۔ اور اُس سے کہنا کہ اگر میری تقدیر میں ہو تو ایک دن وہ خود مجھے یہ موتی واپس لا کر دے گی۔ اب جنگ میری اور نہ نے کی نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب لڑائی تقدیر سے ہے۔۔۔۔۔ دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔“

میں گھٹ کو بھیجی آنکھوں کے ساتھ وہیں کھڑی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ زندگی میں ہم سب پر کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے کہ جب ہم کسی سے ملنا، کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ حتی کہ اس وقت ہمیں اپنی اس خاموش تنہائی کی اپنے آپ باتیں کرنا بھی نہیں بھاتا۔ بس ہمیں اک سکوت کی تلاش ہوتی ہے، جی چاہتا ہے ہم کچھ دیر کے لیے زمانے بھر کے سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں کوئی ہم سے

کچھ نہ پوچھے، کوئی بات نہ کرے۔

اس دن گھٹ سے مل کر آنے کے بعد بھی مجھ پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی شاید مجھے کا دن تھا۔ ابھی ابھی کوئٹہ ایکسپریس چھوٹی تھی اور اسٹیشن سے بجڑ رفته رفته چھٹ رہی تھی۔ میں چپ چاپ پلیٹ فام کے ایک سرے سے شہوت کے گھٹے سے درخت کے نیچے بچے لکڑی کے بیچ پر بیٹھا ہوا اس کے ہڈانے تختے پر ویلنٹین ریموے کے کھڑے ہوئے الفاظ کو غور سے دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ ہماری ارد گرد کی نصب ہوئی کئی چیزوں نے جانے کتنے دردساں دیکھ رکھے ہوتے ہیں، جانے کیسے کیسے زمانے ان پر سے وارد ہو کر گزر چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً اب اسی لکڑی کے بیچ کو سی ڈی لے میں۔ تقریباً سو سال سے انگریز کے دور سے یہ اب تک یہی نصب تھا، جانے کتنی دھوئیں، جانے کتنے سائے، جانے کتنی بارشیں اور برف ہاریاں اور جانے کتنی آمدنیوں کی ہوں گی اس تنہا بیچ نے۔۔۔ اور جب مجھ جیسے کئی اور کم طرف انسان اس پر بیٹھ کر بڑی بڑی شیخیں بھارتے ہوں گے تو یہ سب چیزیں آپس میں اشارے کر کر کے ہم کو رو اور کافی انسانوں کا کشادہ مذاق اڑاتی ہوں گی۔ سچ ہے انسان کی حیثیت ہی کیا ہے ہلکی بھی تو خبر نہیں اُسے اپنی۔۔۔ پھر یہ گھمنڈ کس بات کا۔۔۔

میں انہی خیالات کی پیٹھ پر بیٹھا جانے کیا کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک کسی کے کھانکے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک نورانی سے چہرے والے بزرگ جو شاید سامنے لگے لگے سے وضو کر کے آئے تھے، کھڑے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے، میرے متوجہ ہونے پر مسکرائے۔

”معاف کرنا مہاشا۔۔۔ تم شاید کسی گہری سوچ میں گم تھے، میں نے تمہیں چونکا دیا۔“

سچ تو یہی ہے کہ اس وقت مجھے ان کی یہ مداخلت بے حد ناگوار گزری تھی لیکن بہر حال ان کی عمر کا تقاضا یہی تھا کہ اپنی کئی طہر نہ کی جائے۔ ہم انسان بھی کیسی کیسی روایت کی زنجیروں سے بندھے رہتے ہیں، کچھ سانس بھی اپنی مرضی کی مل نہیں پاتیں۔

”جی فرمائیے۔۔۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔“

بزرگ مسکرائے۔ ”ارے خدمت و دمت کچھ نہیں میں۔ مجھے کا وقت ہے، سوچا آپ کو یاد دل دوں کہ نہ کا وقت ہونے ہی والا ہے، ہو سکتا ہے آپ نے کچھ تیاری کرنی ہو۔“

”جی شکریہ۔ آپ چلے۔۔۔ میں بھی کچھ دیر میں حاضر ہو جاؤں گا، مسجد اس طرف ہے۔“

میں نے جان چھڑانی چاہی، لیکن وہ بزرگ بھی سخت کانیاں ہی نکلتے۔۔۔۔

”میں مسجد کا راستہ یوں نہیں دکھاتے، مسافر کو مسجد کے دروازے تک چھوڑ کر آنا چاہیے۔“

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں پھر ضبط کر گیا۔

”انٹوس۔۔۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلتا لیکن اس وقت میں اپنی کچھ الجھنوں میں پھنسا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہوں۔ آپ کو خدمت تو ہوگی لیکن آپ کسی اور کے ساتھ چلے جائیے، میں معذرت خواہ ہوں۔“

بزرگ نے ختمہ پیشانی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں بھی کچھ دیر اس بیچ پرستاؤں۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہے خطبہ شروع ہونے میں۔“

ایک بار تو جی میں ”یا کہہ دوں کہ یہ پورا پیٹ فارم خالی پڑا ہے۔ کہیں بھی جا کر ستانے کا شوق پورا کر لیجئے۔۔۔۔۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید یہ بھی میری طرح تنہائی کا، راکوئی انسان ہوگا۔ دو گھنٹی بیٹھ جائے گا تو میرا کیا جائے گا۔ میں اور میری تنہائی تو صدیوں کے ساتھی ہیں، اور ہمارا ساتھ تو ابد تک کا ہے، ہم دونوں پھر کبھی مل لیں گے۔

میں نے ایک طرف ہو کر تختے پر اس بزرگ کی بیٹھنے کی جگہ بتائی۔ وہ اپنے کاندھے پر پڑی چادر سے اپنا ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے آ کر بیٹھ گئے۔ ”میرا نام رحمت اللہ ہے، لاہور جا رہا ہوں۔ وہیں کار بنے والا ہوں یہاں پر کچھ پریس اور کچھ پیشنگ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اس لیے دو تین ماہ میں ہفتہ دس دن کے لیے آنا پڑتا ہے۔“

جواب میں انہوں نے میری طرف اس امید سے دیکھا کہ اب میں اپنا شجرہ نسب ان کے سامنے بیان کروں، میں نے مختصر اُتار دیا۔

”میرا نام حماد ہے۔ یہاں پر لگی ہوں۔“

”ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ محنت میں ہی عظمت ہے، تمہاری تنہائی میں قفل ہونے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل بہت دیر سے تمہیں یہاں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ تمہاری پیشانی کی اس خاص چمک نے تم سے مخاطب ہونے پر مجبور کر دیا۔“

”جیسے آپ میری پیشانی کی خاص چمک سمجھ رہے ہیں، وہ میرے بخنوں کی سیاسی ہے۔ اور کالک اور سیاسی جب حد سے زیادہ ہو جائے تو اس میں بھی ایک خاص چمک پیدا ہو جاتی ہے۔“

بزرگ حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

”سبحان اللہ۔۔۔۔۔ کیا خوب بات کہی شتم نے۔۔۔۔۔ سیاسی کی چمک۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ پڑھے لکھے لگتے ہو۔“

جی کچھ سٹے سیاہ کیے ہیں۔ لیکن سب رائیگاں چلا گیا۔

”علم کبھی رائیگاں نہیں جاتا، نماز و غیرہ سے کچھ خاص شغف نہیں رکھتے شاید۔“

”میں اسے دل کا معاملہ سمجھتا ہوں، دل چاہے تو پڑھ لیتا ہوں کبھی کبھی۔۔۔۔۔ ورنہ نہیں۔“

”بیچ تو یہ ہے میاں کہ میں بھی بس حاضری لگانے کے لیے ہی پڑھتا ہوں۔ دل تو کہیں اور ہی انکا ہوتا ہے۔ کسی اور جوڑ توڑ میں، دھندے کی کسی مٹھی کو سلجھانے میں۔“

”تو پھر ایسی حاضری کا فائدہ کیا۔۔۔۔۔ اس سے تو میری غیر حاضری ہی بھلی۔“

”میں حاضری تو لگانے ہی پڑتی ہے نا۔ ورنہ اگلے امتحان میں بیٹھنے ہی نہیں دیا جائے گا۔ جانتے ہو نا، حاضری کی بنیاد پر ہی امتحانی داخلہ ملتا ہے۔ ہنگی ہنگی حاضری پوری ہوگی تو محنت امتحان کے لیے بلائے گا۔ ورنہ بنا امتحان لیے ہی لیل کر دیا جائے گا۔ ایک دفعہ اس ٹوٹی پھوٹی حاضری کی بنیاد پر اگلے جہاں کے امتحان تک تو پہنچ جاؤں۔ پھر وہاں محنت کے آگے رو دھو کر کسی نہ کسی طرح صرف پاس ہونے تک کے 33 نمبر پینے کی کوشش



کروں گا۔ ایک آدھ مضمون میں پہلی یا کپارٹ آ بھی گئی تو کیا ہے۔ گھس گھس کر نکل ہی جائیں گے آخر۔ اس لیے حاضری ضروری ہے۔ بنیادی شرط ہے، کچھ حاضری ہو یا کچھ، دس کی گہرائی اور غلوں دل سے ہو یا دکھاوے اور منافقت بھری۔ لیکن یہی حاضری آگے پیش ہونے کا کام دے گی۔ حاضری پوری ہی نہ ہوئی تو پیشی کا موقع ہی نہیں ملے گا اور پیشی اور سنوائی کا موقع ہی نہ ملتا تو ہم تو گئے کام سے نا۔“

میں حیرت سے رحمت اللہ صاحب کی تقریر سن رہا تھا۔ بہت بڑی بات انہوں نے بہت اہل زبان میں کہہ دی تھی۔ واقعی نالائق سے نالائق تر، کوڑھ مغز سے کوڑھ مغز ترین اور شریر سے شریر تر طالب علم کو بھی امتحان میں بیٹھنے کا موقع مل ہی جاتا تھا، بشرطیکہ اس کی حاضری اس امتحانی معیار کے مطابق پوری ہوں۔ بپاس لیں ہونا اس کی قسمت اور اعمال پر تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پر پے چپک کرنے والا رحم کھا کر 33 نمبر دے ہی دے۔ لیکن جس طالب علم کی حاضری ہی پوری نہ ہوئے تو امتحان لیے بنائی فیل تصور کیا جاتا ہے۔

”ٹھیک کہا آپ نے۔ اس حساب سے تو حاضری بڑی ضروری ہوئی۔“ رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

”نماز کی حاضری کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بڑا کٹھن ہوتا ہے پانچ وقت کی یہ روزانہ حاضری کاٹنا۔ شروع شروع میں تو نہیں بڑا، تنگ ہوتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو جائے نماز پر کھڑا تو کر لیتا لیکن یہاں تہہ، باندھی اور دوپٹے ایک تیزی اور دنیا بھر کی جلدی کی ایک ایسی بے چینی سر پر سور ہو جاتی تھی کہ جسے اگر وہ نماز پڑھنے میں نہیں نے ذرا بھر مزید دیر لگادی تو جانے کتنے ناکہ کا کھانا ہو جائے گا۔ اسی تیزی میں جلد از جلد انٹی سیدی می رکھتیں پڑھ کر بس سلام پھیرنے کی کرتا تھا۔ جانے پوری پڑھتا بھی تھا یا آدمی نامکمل پڑھ کر ہی ختم کر دیتا تھا۔ اور ادھر سلام پھیرا اور دھرد تیزی دو بے چینی ختم۔ لگتا تھا جیسے خوش میں جو اہل آ رہا تھا وہ بس اس نماز کی وجہ سے ہی تھا۔ پھر چاہے گھنٹوں دوپٹے بیٹھا ہوں، کچھ نہ کر دس تب بھی وہی جلدی اور بے چینی پیدا نہ ہوتی، ہاں البتہ جیسے ہی دوسری نماز کے لیے کھڑا ہوا، وہیں وہ بھانگ بھاگ شروع۔

اور اس چند لمحے کی غفلت اور بے چینی بھری نماز کے درمیان بھی ہر لمحہ کسی عورت، کسی دھندے کسی کمائی کا سودی ذہن میں ساہو رہتا۔ کبھی کبھی تو دل اس زور سے دھڑکتا تھا جیسے اگر میں نے فوراً اپنی میں نماز پڑھ کر سلام نہ پھیرا تو یہ کم بخت دل سینے سے ہی ہر نکل آ کرے گا۔“

”تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔۔۔ جس مسجد میں میں نماز پڑھنے جاتا تھا اس کے سامنے کی کھڑکی باہر بازار کی طرف کھلتی تھی۔ نہیں اگر خوش قسمتی سے کبھی پہلی صف تک پہنچ بھی جاتا تو پوری نماز کے دوران میری نظریں باہر بازار کی گلی میں پھٹکتی رہتی تھیں۔ دراصل شروع شروع میں نماز میرے لیے بڑا اکتا دینے والا کام تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے ”بورنگ (Boring)“ ہاں۔۔۔۔۔ بڑا بورنگ کام تھا۔ اس لیے میری نظر خود بخود کھڑکی سے باہر اٹھ جاتی تھیں۔ اور سچ بتاؤں رمضان میں کبھی دوست کھینچ کھینچ کر ترویج کے لیے لے جاتے تو تب یہ کھڑکیاں میرے بڑے کام آتی تھیں۔ ترویج کی بجائی رکھتیں بڑے مزے سے گزر جاتیں۔“

رحمت اللہ صاحب یہ بتاتے ہوئے فیس پڑے۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی تھیں نے دلچسپی سے ان کی طرف دیکھا۔

”اور ب۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ اب کیا محسوس ہوتا ہے۔“

”اب لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ کچھ ٹھہراؤ آتا جا رہا ہے۔ لیکن ہم کیا اور کیا ہماری نمازیں میاں۔۔۔۔۔ سب دکھا دیا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ”آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک۔۔۔۔۔“

”مذہب میں کاسیتہ کروڑوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم جیسے تو یونہی زل زلہ کر رہے ہیں اپنی نیت کے طفیل ہی یہ دریا پار کر لیتے ہیں۔ یا پھر کسی کی دی ہوئی کوئی دُعا کام آ جاتی ہے۔ منزل نہ سبکی، کوئی سنگ میل ہی سبکی۔۔۔۔۔ منزل سب کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے، ہم تو ذہن میں پہاڑ چڑھاؤ پہلا سنگ میل رکھ کر ہی چلتے ہیں۔ جانے اُس تک بھی اس مختصر زندگی میں پہنچ پائیں گے یا نہیں۔ اپنا فرض تو بس قدم بڑھا دینا ہے۔“

”نہیں رحمت اللہ صاحب کی باتیں بڑے غور لیکن دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا۔ میں آج تک مذہب کو بہت مشکل اور بڑا دشمن کام سمجھتا تھا۔ لیکن رحمت اللہ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ یہ تو بہت سہل ہے۔ بس نیت کا کھیل ہے۔

اسنے میں جسے کی اڑاں شروع ہو گئی۔ ”نہیں بے اعتدالی میں ہی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ باتیں کرتا ہوا مسجد تک جا پہنچا۔ سب یوں گھٹ سے پلٹنا مجھے کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ رحمت اللہ نے دوبارہ حالانکہ مجھ سے نماز پڑھنے کا ذکر تک بھی نہیں کیا تھا۔ میں بھی دوسرے نمازیوں کے ساتھ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

شاید اس دن وہ میری زندگی کا پہلا مسجد تھا جو میں نے بنا کسی خوف اور کسی جلدی، بنا کسی بے زاری اور بنا کسی مطلب اور دلچسپی کے ادا کیا تھا۔ اس دن مجھے پہلی بار مذہب سے ڈر نہیں لگا۔ کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اس لیے میرے اس پہلے سجدے میں بڑا اطمینان تھا طمانیت تھی اور سکون تھا۔

میں نماز پڑھ کر اسٹیشن سے بحق مسجد کے باہری کھڑا رحمت اللہ صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ جلدی وہ بھی نکل آئے۔ اور ہم دونوں واپس پلیٹ فارم پر آ گئے۔ وہاں پسینہ پڑا ناؤ نہٹھٹ ہو رہی تھی کہ لاہور جانے والی گاڑی کسی فنی خرابی کی وجہ سے تین گھنٹے دیر سے جائے گی۔ رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

”لو بھئی۔۔۔۔۔ شاید قدرت کو میرا تمہارا ساتھ کچھ دیر کے لیے طرے منظور تھا۔ تم اگر گردانہ مالو تو میں یہیں تمہارے پسندیدہ بیٹے پر اپنی گاڑی کا انتظار کروں۔“

میں شرمندہ سا ہو گیا شاید انہیں نماز سے پہلے والا میرا الجھا اور رویہ یاد تھا۔ میں نے ان سے اپنے بچھنے سلوک کی معذرت چاہی۔ وہ مسکرا دیے۔

”ارے میاں معذرت کیسی۔۔۔۔۔ ہر بندے کا اپنی تنہائی پر مکمل اختیار اور مکمل حق ہوتا ہے۔ معذرت تو مجھے پیش کرنی چاہیے۔۔۔۔۔ بہر حال بھی تمہیں لگی ہو یا نہ لگی ہو۔ پر مجھے تو شدید بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ پیٹ پوجا ہونی چاہیے۔“

انہوں نے اپنے سامان میں سے ایک ٹوہڑے کا خوبصورت سا چھوٹا نقش کیر تیر نکالا اور میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے بھی کھانے میں شریک رکھا۔ سادہ سی آسوساگ کی ہنری، تھوڑا سا چار اور چند پراٹھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے کھانا کھایا، پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مجھے بے رہنمائی سے ٹوہڑے دیکھ کر انہوں نے مجھے نصیحت کی۔

”دیکھو دیکھاں۔۔۔۔۔ چاہے جتنے بھی مصروف کیوں نہ ہو، کھانا کھانے کے لیے وقت ضرور نکالا کرو۔ ہم اپنی زندگی کی ساری جدوجہد کس لیے کرتے ہیں۔ اسی دو وقت کی روٹی کے لیے ہی نا۔ یہ روٹی کا چکر ہی نہ ہوتا تو کبھی ہمہ وقت مسجدوں میں سجدے میں ہی نہ پڑے رہتے۔ لیکن

ہمیں رزق تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چاہے چند فوٹالے ہی کھاؤ لیکن عبادت کی طرح خلوص سے کھاؤ اور اس نیت سے کھاؤ کہ اس کے بعد تم خدا کا شکر ادا کر سکو گے۔ بلکہ صرف کھانے پر ہی کیا منحصر ہے۔ زندگی میں اس کی دی ہوئی ہر نعمت کو اس طرح برد تو کہ یہ اس، لگ کا حسان ہے اور اس نیت سے اس نعمت کا فائدہ اٹھاؤ کہ یہ اس مالک کے شکر ادا کرنے کا ایک اور بہانہ ہے جو اس نے تمہیں فراہم کیا ہے۔"

مجھے اس نورانی چہرے والے بوڑھے کی باتیں سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے تو زندگی کبھی اس زاویے سے نہیں گزری تھی۔ نہیں اپنے استہوال کی ہر چیز کھانے پینے، سواری، آرام اور تھیش کی چیزوں اور لکھات کو اپنا اور اپنی محنت کا حق سمجھتا تھا۔ اپنے بڑوں کی دین سمجھتا تھا۔ بڑوں کی کئی سمجھتا تھا۔ نعمت اور شکر کا تصور تو میرے دس میں کہیں ڈور ڈور تک نہ تھا۔

میں نے کچھ دے سے لہجے میں رحمت اللہ صا حب سے پوچھا۔

"کیا آپ تبیغی ہیں۔۔۔۔؟"

وہ میری بات سن کر زور سے فہس پڑے۔

"خوب۔۔۔۔ تو تم اتنی دیر سے میری باتوں کو تبلیغ سمجھ رہے ہو۔۔۔۔ بڑے بھولے ہوسیاں۔۔۔۔ میں کہاں اور تبلیغ کہاں۔ میں تو ایک وقت کی بھوک بھی برداشت نہیں کر سکتا تبلیغ کے لیے تو پورا اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ تب جا کر کہیں آپ کو یہ حق ملتا ہے کہ آپ دوسروں کو کچھ نصیحت کریں، کچھ سکھائیں، کیونکہ پہلی شرط یہ ہے کہ آپ خود وہ کریں جو دوسروں کو کہتے ہیں اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔"

اسنے میں رحمت اللہ صا حب کی گاڑی کا وقت ہو چلا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی اور اب اس کا سائرن بھی وقفے وقفے سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ان کا سامان سینے میں ان کی مدد کی اور ان کے لاکھنچ کرنے کے باوجود ان کا سوٹ کیس اٹھا کر انہیں ڈبے تک چھوڑنے آیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئے جو کھڑکی کے ساتھ ہی تھی تو میں اتر کر پلیٹ فارم پر ان کی کھڑکی کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ ٹرین نے ہلکا سا جھٹکا یا۔ نہیں نے سر باہر نکال کر میرے ماتھے کا الوداعی بوسہ دیا اور بولے۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کسی چیز کی تلاش ہے۔ وہ طلب اور اس چیز کی شدت کی چاہت تمہاری آنکھوں سے ہر لمحہ چلتی ہے۔ لیکن کہیں نہ کہیں تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مذہب تمہارے راستے کی رکاوٹ ہے۔ لیکن یاد رکھو حاد میاں۔۔۔۔ مذہب جب تک ہی رکاوٹ لگتا ہے اور اس سے خوف محسوس ہوتا ہے جب تک آپ اس سے ڈور رہتے ہیں۔ قریب جانے پر مظلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بے ضرر اور بہت دوست ٹما کوئی چیز ہے۔ مذہب سے ڈور نہ رہنا۔۔۔ اسے اپنا دوست بنا لینا۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ آباؤ ہو۔۔۔"

ٹرین نے دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے کھسکن شروع کر دیا تھا، میں اس کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم کی آخری حد تک چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ عجیب نورانی بزرگ ہاتھ ہلاتے ہلاتے ٹرین سمیت میری نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ جو جاتے جاتے مجھے زندگی کے بہت سے زاویے بس ایک ہی ملاقات میں بتا گیا تھا۔

☆☆☆

## ہالوکاسٹ

آخر کی دنوں کی کوشش کے بعد مجھے جوزف سے تنہائی میں اس موضوع پر بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ ہالوکاسٹ کا نظریہ کیا ہے۔ جوزف میری بات سنتے ہی ایک دم خوف زدہ سا ہو گیا جیسے میں نے کوئی بہت ہی انہونی چیز پوچھ لی ہو۔ وہ سرگوشی میں یوں بولا جیسے ہم بہت بڑے رقوم کے درمیان بیٹھے ہوں حالانکہ وہاں نہر کے آس پاس ذور ذور تک ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

”اس جگہ ایسی کوئی بات کسی سے پوچھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ یہ موضوع یہاں پر ممنوعہ ہے۔“

میں نے حیرت سے جوزف کے اس بے اسرار انداز کی طرف دیکھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ ایسی کیا بات ہے اس موضوع میں۔۔۔۔۔ اور پھر سارہ نے اس دن اس نظریے کے حق میں اپنی تقریر کے دوران اتنے زیادہ دلائل بھی تو دیے تھے۔ پھر یہ سب ممنوعہ کیسے ہو گیا۔“

سارہ ایک یہودی لڑکی ہے اور اس کے تمام دلائل ہالوکاسٹ کے حق میں تھے۔ میں اس نظریے کے مخالف دلائل کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں قصص اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس نظریے کی حقیقت جان کر اس پر دوسروں سے بحث ضرور کرو گے جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا تم بھی اس نظریے کے مخالف ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں کیا ایک دنیا اس مفروضے کی حقیقت سے انکاری ہے۔ لیکن ان یہودیوں کے لیے یہ اس قدر مقدس نظریہ ہے کہ وہ کسی کا اس کے خلاف بولنا تو دور، سوچنا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ایسی کوئی بھی بات کرنے والوں کی زبان بند کرنا انہیں خوب آتا ہے۔ اسے یا تو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے یا پھر ملک بدر اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بلکہ اب تو انہوں نے ہر قاعدہ ایک قانون بنالیا ہے جس کے ذریعے انہوں نے اس موضوع کی مخالفت پر پابندی لگادی ہے ہر قاعدہ طور پر۔“

میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”اس جدید دور میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی کی سوچ، کسی کی زبان پر پھرے لگا دیں۔۔۔۔۔؟ اور پھر یہ لوگ تو آزادی ظہر رائے کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ یہ آزادی رائے اس وقت کیوں یا نہیں آئی انہیں جب یہ لوگ ایسا کوئی جبری قانون بنا رہے تھے۔“

جوزف نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے آواز دہمی رکھنے کا مشورہ دیا۔ ”یہ تمام ڈھنڈورے دوسری قوموں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ شاید تم یہ نہیں جانتے کہ تمہاری اس دن ہال میں کی گئی تقریر نے جانے کتنوں کی نیند آزادی ہوگی۔ یہ اس یونیورسٹی کے ایک سو تیس سالہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ کوئی اسٹیج پر آ کر باقاعدہ انہیں بچے لفظوں کے تازیانے لگا کر چلا گیا ہے۔ یہ لوگ اسکی جرأت کو بھولے نہیں۔۔۔۔۔ نازی پسند کرتے ہیں۔“

میں نے جھٹا کر کہا۔

”یہ لوگ۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔ آخر یہ لوگ ہیں کون۔۔۔ اگر ان میں اتنی اہمیت ہے تو سنے آ کر بات کیوں نہیں کرتے۔۔۔ آخر

یہ ہالوکاسٹ ہے کیا ہلا۔۔۔؟“

جوزف نے ایک لمبی سی سانس لی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کچھ جانے بغیر یہاں سے نکلنے والا نہیں ہوں۔ وہ دبی دبی سی آواز میں مجھے بتانے لگا۔

”یہودیوں نے اپنے اوپر ہونے والے نام نہاد مظالم کو سب سے زیادہ جرمی سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے جرمیوں پر

1298ء میں جرمن نائٹ رڈ فلیش کی سرکردگی میں جرمی میں موجود ایک سو چھیالیس یہودی بستیوں میں قتل عام کا الزام لگایا گیا۔ پھر 1336ء

میں دوسو یہودی بستیوں کو تباہ کرنے کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ لیکن سب الزاموں سے بڑھ کر الزام یہودی لیڈر ڈیوڈ بن گورین نے دوسری جنگ عظیم کے

بعد ہٹلر پر لگایا کہ اُس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران پچاس لاکھ سے زائد یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ختم کر دیا تھا۔ کچھ لوگ یہ تعدد 60

لاکھ تک بتاتے ہیں۔ اور یہودی اسی عظیم اٹھان اموات کے نظریہ کو ہالوکاسٹ کہتے ہیں۔“

میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”لیکن اتنی بڑی تعداد میں اگر یہودی مارے گئے ہوں گے تو ان کی موت کا کوئی ثبوت بھی تو ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم اور ہٹلر کا دور تو ابھی

کل ہی کی بات ہے۔“

”کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ثبوت ڈھونڈنے والوں اور اس نظریے کے خلاف جانے والوں کو سزا نہیں دی جاتی ہیں۔ ابھی ابھی پچھلے سال

ای آسٹریا کی ایک عدالت نے تاریخ کے ایک استاد پر دھیس ڈیڑھ لاکھ روپے کی سزائے قید سنائی ہے۔ صرف اس جرم میں کہ اُس نے

ہالوکاسٹ کے دوران یہودیوں کے قتل عام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔“

”حیرت ہے لیکن یہودی اس پروپیگنڈے کے ذریعے کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔“

”اپنی قوم اور اپنی نئی نسل کے لیے ایک الگ اور آزاد سلطنت، برطانیہ اور امریکہ سے یہودی رہنماؤں کو دوسری جنگ عظیم کے دوران

یقین دلایا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد یہودی سلطنت قائم کر دی جائے گی اور یہ ریاست فلسطین کی مقدس سرزمین پر قائم ہوگی۔ روس

نے بھی اس معاملے میں یہودیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔“

جوزف نے مجھے رچرڈ ہارڈ (Richard Harward) کی کتاب ”کیا واقعی 60 لاکھ یہودی مارے گئے۔“ فریج رائٹریاں راسی

نیر کی کتاب ”یورپی یہودیوں کا ڈراما“ امریکی مصنف ڈیوڈ ہوگن کی تصنیف ”مسلحہ شدہ جنگ“ اور ایسی بہت سی دوسری کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا۔

میرے لیے واقعی یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے اسی دن شہر کی مختلف کتابخانوں میں یہ تمام کتابیں منگوا لیں کیونکہ شہر کی بڑی

لائبریریوں میں ان کتابوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے میں ان کتابوں کو پڑھتا گیا۔ مت نئے راز میرے اندر واہوتے چلے گئے۔ پتہ یہ چلا

کہ ہالوکاسٹ کا یہ پروپیگنڈہ تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ جرمی سے تمام اتحادی افواج خائف تھیں، یہودیوں نے جو اس وقت

جرمنی میں اسلحہ سازی کی صنعت پر چھائے ہوئے تھے، اتحادی افواج اور امریکہ کا درپردہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اس شرط پر کہ جنگ عظیم دوم کے



بعد انہیں آزاد ریاست بنانے کی اجازت دے دی جائے۔

جرمن یہودی سارٹوں کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم ہار گئے، ہالوکاسٹ کے دلوٹے سے یہودیوں نے پورے قاتلہ اٹھایا اور فلسطین تک ان کی بستیوں کی رسائی میں اتحادی ملکوں نے پوری مدد کی۔ اور رفتہ رفتہ ہالوکاسٹ کے موضوع کو ہی مقدس گائے بنا دیا گیا تاکہ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہ بولے اور نہ ہی تحقیق کی نوبت آئے۔ مجھے ان سب کتابوں سے ایسی ایک ہی حقیقت کا واضح اشارہ ملا کہ۔۔۔ ”یہودی دراصل سازش کا دوسرا نام ہے۔“ اب مجھے کسی ایسے موقع کا انتظار تھا جب میں ان یہودیوں کے اس غرور کو توڑ سکوں۔ کامران نے میرے آگے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے کہ میں ان چکروں میں نہ پڑوں۔ اسے مجھ سے زیادہ سارہ کی فکر تھی کہ وہ میرے دوست کامران کے بارے میں کیا سوچے گی جب کہ ابھی تک سارہ کامران کے نام اور شکل سے بھی واقف نہیں تھی۔

اور پھر ایک ہی ہفتے کے دوران مجھے وہ موقع مل ہی گیا۔ ہیومنزنگ کی کلاس میں سر آئزک نے ہم سب کو مختلف موضوعات پر فرم بھیجے کھنے کے لیے کہ، موضوع کی کوئی قید نہیں تھی لیکن موضوع پہلے بتانا ضروری تھا کیونکہ اسے طالب علم کے نام کے ساتھ نوٹس بورڈ پر چپکانا ضروری تھا۔ جس دن نوٹس بورڈ پر وہ فہرست لگائی گئی جس کے اندر موضوعات بھی واضح کیے گئے تھے اس دن سب لوگ میرے نام کے سامنے مضمون کی فہرست میں ”ہالوکاسٹ“ کا عنوان دیکھ کر ہی سراسیمہ ہو گئے۔ چند لمحوں میں ہی پوری یونیورسٹی میں سرگوشیوں اور چپے میگنیوں کا ایک ریلا س بہہ نکلا۔ میں لاہوری سے نکل رہا تھا کہ پریشان سی ربیکا اپنے کئے ہال جھلاتی جانے کہاں سے آ نکلی اور بتا کچھ کہے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی مجھے راہداری کے ایک سنسان گوشے کی طرف لے گئی۔

”میڈی۔۔۔ تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو۔۔۔؟“

”کیوں۔۔۔ میں نے ایسا کیا کام کیا ہے کہ تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔“

”تم نے ہالوکاسٹ پر فرم بھیجے کھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ یونیورسٹی یہودیوں کی ہے اور اس کی تمام انتظامیہ یہودی

ہے۔ پیڑ میڈی۔۔۔ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لو۔۔۔ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

اُس نے واقعی اپنے گورے گورے سے ہاتھ میرے آگے جوڑ دیے۔ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

”کچھ نہیں ہوگا تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اگر یہ لوگ دوسری قوموں اور مذاہب کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں خود سے کم تر سمجھتے ہیں

تو انہیں بھی آئینہ دکھانے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔“

”اوہ میڈی۔۔۔ تم نہیں جانتے میں تمہارے لیے کتنی پریشان ہوں۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میں

نے چونک کر اُس بظاہر اناہلی سی نرکی کو دیکھا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آ کر گزر گئے۔ مجھے لگا ڈور کہیں پھر سے محبت کی راج ہنسی

پر پھیلا رہی ہے۔۔۔۔۔

☆☆☆

## سنگ دل

میں بنیادی طور پر مذہب کو انسان کا بے حد ذاتی فعل سمجھتا تھا۔ اس دن ترین والے بزرگ رحمت اللہ سے ہوئی ایک ملاقات نے میرے اندر سے مذہب کا بہت سارا خوف نکال دیا تھا۔ مجھے لگنے لگا کہ مذہب کو دوسروں کے ساتھ ڈسکس بھی کیا جاسکتا ہے اور اس پر بحث بھی ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی بُرائی بھی نہیں ہے۔

جانے انہیں کیسے پتہ چل گیا تھا کہ میں اپنی چاہت کے راستے میں اپنے مذہب کو حائل سمجھتا ہوں۔ یہ کیسا عجیب بزرگ تھا جو ہل بھر میں میری روح تک کھنگال کر اسے چھوڑ گیا تھا۔ بہرحال اب مجھے میرا راستہ نظر آنے لگا تھا۔

درمیان میں ایک دفعہ شکر کی طرف گیا تو پتہ چلا کہ وہ کمشنر صاحب کو لے کر اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ انکسٹن قریب آ رہے تھے دراب بابا کی بڑے گھروں کی یا تو ابھی بڑھنے لگی ہوگی۔ گھبت نے بتایا کہ وہ دونوں موتی ایمان کو دے آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ ایمان بہت دیر تک وہ دونوں موتی ہاتھوں میں لیے گم سہمی بیٹھی رہی تھی۔ اس نے گھبت سے پھر یہی درخواست کی تھی کہ وہ مجھے سمجھائے کہ میری ضد کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا لہذا میں یہ تیغ ترک کر کے واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔ گھبت اس سے اُلجھ پڑی تھی کہ جب اسے میری کوئی فکر ہی نہیں ہے تو پھر میری در بدری اور میری خواری کا خیال بھی اپنے ذہن سے جھٹک دے۔ اسے خواہ مخواہ خود کو مجرم سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو بھی کر رہا ہوں اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے کر رہا ہوں، ایمان کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گھبت کی یہ سخت جوابی سن کر وہ زہرہ جہیں ایمان کس قدر آرزوہ ہوئی ہوگی۔ میں یہ سوچ کر دنگی ہو گیا۔ لیکن گھبت نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر وہ چپ بھی رہتی تب بھی حیا ضرور اپنی بہن سے اُلجھ پڑتی۔ گھبت کو خود بھی اس بات پر حیرت تھی کہ جانے کیوں حیا کو مجھ پر اور میری ایمان سے محبت پر بے انتہا یقین تھا۔ اور وہ مجھے ایمان کے معاملے میں ذرا بھی قصور و رنج نہ سمجھتی تھی۔ مجھے اس انجانی لڑکی پر اس لمحے بے حد پیار آیا۔ چلو۔۔۔ کوئی تو تھا اس گھر میں جو کھیلے عام نہ کسی بھنپ کر ہی اس نازنین کے سامنے تنہائی میں میری دکات کرتا تھا، کہتے ہیں مستقل طور پر اگر پانی کا ایک قطرہ بھی کسی سنگ سخت پر پڑتا رہے تو وہ بھی پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔ دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ اس پتھر دل کا دل کب پگھلتا ہے۔

میں جانتا تھا کہ ایمان کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا ہے جن لڑکیوں کے دلوں کے ہر کوڑکی چابی ان کے ماں باپ کے پاس ہوتی ہے۔ ان کی ہر پسند ناپسند اپنے بزرگوں کی پسند سے مشروط ہوتی ہے، ان کے دلوں کا ہر راستہ ان کے باپ کی بیٹھک سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ بیٹھک جہاں سے آگے بڑھنے کی اجازت ملنے پر ہی وہ اپنے دل کا دروازہ کسی اجنبی کے لیے کھولتی ہیں۔ ورنہ یہ دروازے یہ کوڑ ساری عمر بند ہی رہتے ہیں۔ آپ لاکھ سرائیں، اتنے کوگر انکار کر ہو بہان کریں پر وہ بہری بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ ان تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ پرستان کی ان پریوں کی شہزادی کی طرح

کہ جس کے محل کے دروازے پر کوئی اڑدھ، کوئی دیوی یا کوئی جن پہرہ پہنے کے لیے ہمہ وقت موجود ہی رہتا ہے۔

لیکن مجھے جانے کیوں اپنی محبت کی طاقت پر کبھی شک نہیں رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ میرے پاس اب جینے کے لیے اس محبت اور اس کی طاقت پر بھروسہ کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ بھرم بھی ٹوٹ جاتا تو شاید میں اسی پہل خود بھی مرجاتا۔ اب میری زندگی کا مقصد ہی اس پتھر کی دیوار سے تاحر سر نکلانا تھا۔ ہاں کسی تیشے اور اوزار کے صرف اپنے خالی ہاتھوں اور کمزور ناخنوں کی مدد سے اس پہاڑ کو اوچیز کر ایک نہر کھودنا تھا۔ میرے ناخن تو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے، چمچ چکے تھے، ہاتھ لیولہان تھے اور پتھر کا پہاڑ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی جگہ ویسے ہی قائم تھا۔ لیکن میرا حوصلہ بھی جوان تھا۔ میری ہمت میرے ساتھ تھی۔ سوئیں بھی اپنی رفتار کے ساتھ کسی نہ کسی صورت مشقت جاری رکھے ہوا تھا۔ بس شرط سانسوں کی تھی۔۔۔۔۔ وہ جب تک ساتھ دیتیں۔۔۔ منہیں رکنے والا نہیں تھا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس راستے میں مجھے جو بھی لوگ ملتے گئے انہوں نے کسی نہ کسی طور میری مدد کی تھی۔ میرا راستہ سہل ہی کیا تھا۔ شاکر، نگہت، صدیقی صاحب، غفور اور اب یہ صوفی رحمت اللہ۔۔۔ سبھی نے میری ہمت کسی نہ کسی طرح سے بڑھائی ہی تھی۔

رحمت اللہ صاحب نے تو ایک نیا ہی راستہ دکھا دیا تھا۔ اور میں نے اب اسی راستے پر چلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگر مولوی صاحب کی نظر میں مذہب ہی میری کی اور میری خانی تھی تو میں نے اب تک اس کی کوہں خانی کو ذور کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی تھی۔ لوگ مذہب سے محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف جاتے ہیں تو کیا ہوا اگر میں اپنی محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف قدم بڑھاؤں۔۔۔؟ رحمت اللہ صاحب نے کہا تھا کہ لا کھوں کروڑوں میں کوئی ایک کامل دین ہوتا ہے۔ تو پھر میں بھی اگر ان ہزاروں تو سیکھوں کے ساتھ مل جاؤں تو اس میں کیا بُری ہے؟ مانا کہ یہ سب نہیں اس وقت ایمان کو پانے کے لیے ہی کرتا لیکن اپنی محبت کو بار دینے اور ہتھیار ڈال دینے سے تو پھر بھی یہ کہیں بہتر تھا۔ دل میں کوئی غلطش تو نہیں باقی

وہ جاتی گرمیوں کے دن تھے اور ستمبر کا مہینہ اور خزاں سر پر تھی۔ میں نے اسٹیشن کے چائے والے لڑکے کو کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے صبح ساڑھے چار بجے جگا دے۔ وہ رات کی شفٹ میں اسٹیشن پر پھیری لگا کر ایک مخصوص لوہے کے چکر میں شیشے کے گلاس پھنسنے ان پر ایک لوہے کی ہتھری تھم کر آواز نکال کر چائے بیچتا تھا۔ اور مجھ سے خاصی دوستی ہو گئی تھی اس کی۔ باہر نام تھا اس کا، باہر نے مجھے ٹھیک ساڑھے چار بجے۔ "چائے گرم" کے نعرے کے ساتھ ہی اٹھ دیا۔ بہت دنوں سے میں نے بیڈنی نہیں لی تھی، سو اس نے آج یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ بہت یہ بیڈنی نہیں بلکہ بیڈنی تھی کیونکہ وینٹنگ روم میں پڑے وہ لکڑی کے تختے ہی اب میرا بستر تھے۔ چائے پی کر میں جلدی سے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا اور باہر نکلتے نکلتے اسٹیشن کے کل سے منہ پر پانی کے دوچار چھینے بھی مار لیے۔ باہر اکا دکا تاکتے موجود تھے جو مٹی کے تیل والی بڑی بڑی لائٹیں اپنے تانگوں پر لٹکائے صبح کی تیار ہوں میں مصروف تھے۔ میں نے وہیں سے خیر و تانگے والے لڑکے کو آواز لگائی۔ خیر و تانگہ، ہاں! ہوا قریب۔ "گم۔"

"خیرتہ سے نمبر 137۔۔۔۔۔ آئی مجھ سے کمال کا ارادہ ہے۔"

نہ کا کہ اگر وہ ملے تو اسے بھی دیا۔ یہ کہیں سنسار، بڑی تھیں۔ گوشت سو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں، ہم شہنشاہی ہو چکے تھے۔

کے قریب پہنچ گئے۔ مسجد کے قریب پہنچ کر میں نے خیر و کوہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ خیر و نے تا نگہ ایک طرف لگایا اور حسب معمول اپنے تانگے کے ساتھ لٹکے ہوئے ہڈانے سنگل بینڈ کے ریڈیو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی مجھے ان تانگے والے، رکشہ والوں اور ٹیکسی چلانے والوں کی اس مخصوص عادت پر بہت حیرت ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو جائے، زمانہ ادھر کا ادھر ہو جائے پر یہ لوگ خبریں ضرور سننے اور بعد میں "پس" میں بیٹھ کر اس پر تبصرے کرتے جیسے وہ کوئی تانگہ یا رکشہ اسٹینڈ پر نہ بیٹھے ہوں بلکہ جیسے کسی اسمبلی کے رکن ہوں اور اگر وہ تبصرہ نہ کریں یا خبریں نہ سنیں گے تو جیسے ملک کا بے حد بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اور اس کے برعکس عام طور پر اسمبلیوں تک پہنچنے والے اسمبلی میں اس رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے جس کی توقع ہم ان تانگہ ہالوں سے کر سکتے تھے۔

میں خیر و کوہیں خبروں کی تلاش میں ریڈیو کی سوئی کھماتا چھوڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ مسجد ابھی تقریباً خالی ہی تھی، اکا دکا نمازی آنے لگے اور پھر جماعت کے وقت مولوی عظیم مسجد میں داخل ہوئے اور سیدھے امام کی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ دو رکعت نماز پڑھا کر انہوں نے سلام پھیرا اور پھر ذرا کے پے مقتدیوں کی طرف پلٹے۔ جیسے ہی انہوں نے ذرا کے لیے ہاتھ اٹھائے ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ لمبے بھر کے لیے تو وہ جیسے سن ہی ہو کر رہ گئے۔ پھر انہیں جیسے کچھ خیال آیا اور انہوں نے ذرا شتم کی۔ سب نمازی ایک ایک کر کے مسجد سے نکل آئے۔ میں بھی مولوی عظیم سے بنا کسی بات کے باہر آیا اور خیر و کوہیں سٹیشن چنے کے لیے کہا۔ خیر و نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”کیا بات ہے بابو۔۔۔۔۔ صرف نماز پڑھنے آتی ذرا تک آئے تھے۔۔۔ کیا کوئی منت وغیرہ مانی ہے۔“

”ابھی سمجھ لو۔“

خیر و نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔ سچ ہے محبت بھی تو ایک منت کی طرح ہی ہوتی ہے۔ بلکہ محبت سے بڑی منت اور بھلا کوئی دوسری منت کیا ہوگی۔ اس دن کے بعد سے میں نے اپنا یہ معمول بنالیا کہ میں ہر روز صبح فجر اور پھر عشاء کی نماز کے لیے اسی مسجد میں جاتا جہاں مولوی صاحب جماعت کرواتے تھے۔ سچ میں ظہر، عصر اور مغرب کا وقت اسٹیشن پر ڈیوٹی کے دوران ہو جاتا تھا لہذا یہ نمازیں مجھے سٹیشن پر ہی داکرنی پڑتی تھیں۔ میں نماز پڑھنے کو ہمیشہ سے ایک بے حد ذاتی فعل سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے اپنی خہا نماز کسی کے سامنے پڑھنے سے اس کی حرمت اور اس کی عظمت متاثر ہوتی تھی۔ جیسے کچھ دکھاوے کا پہلو نمایاں ہو رہا ہو شاید اسی لیے اسٹیشن پر کبھی کسی نے مجھے نماز پڑھنے سے روک دیکھا ہوگا۔ عہد اللہ نے بھی مجھے فجر اور عشاء کی نمازوں پر وہاں آتے جاتے دیکھا لیکن وہ بھی ایک عجیب جوان رعنا تھا۔ جب بھی مجھ سے ملا، بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ میں نے کبھی اس کے چہرے پر کسی قسم کا رنج، غصہ یا تاؤ نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں یوں اس مسجد میں آ کر مولوی صاحب سے روزانہ ایک سرد جنگ لڑ رہا ہوں۔ جس کی کڑواہٹ روز بروز مولوی صاحب کے چہرے پر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

عشاء کے بعد مولوی صاحب کا معمول تھا کہ وہ کسی بھی مسئلے یا حدیث کو لے کر پندرہ منٹ کا ایک درس دیتے تھے جسے سننے کے لیے چند نمازی پیچھے رُک جاتے تھے۔ جن میں اب میں بھی باقاعدگی سے شامل ہوتا تھا۔ عبداللہ بھی ضرور اس درس میں شامل ہوتا تھا بلکہ حدیث یا تفسیر کی کتاب حلق پر سے اُٹھ کر مانے اور واپس رکھنے کی ڈیوٹی بھی عبداللہ کی ہی تھی۔

لیکن شائد مولوی صاحب نے بھی یہ طے ہی کر لیا تھا کہ وہ اپنے طور پر مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ میں سلام کرتا تو جواب دیتے اور پھر وہی بات تھی۔۔۔ ان جیسے شریف اور وضع دار شخص سے کچھ ایسی ہی توقع کی جا سکتی تھی۔ میری نجر اور نماز عشاء کا یہ سفر جاری تھا۔ کبھی کبھار کوئی نمازی درس کے دوران کوئی مسئلہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتا تھا جس کا مولوی صاحب کبھی تفصیل اور کبھی مختصر کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی ایک نمازی نے مولوی صاحب سے چھ کلمے سنانے کی اور انہیں یاد کرانے کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے اس سے پوچھا کہ اسے اس وقت کتنے کلمے زبان یاد ہیں۔ اُس شخص نے کہا دو۔ مولوی صاحب نے وہ دو کلمے اس سے سنے اور پھر تیسرا کلمہ اُسے یاد کروایا۔ میں بھی وہیں بیٹھا دل ہی دل میں وہ تیسرا کلمہ یاد کرتا رہا۔ پھر اسی طرح اگلے دن انہوں نے اسی نمازی سے عشاء کے بعد تین کلمے سنے اور چوتھا یاد کروایا۔ میں بھی ساتھ ساتھ دہراتا اور دل ہی دل میں اُسے پکارتا رہا۔ اسی ترتیب سے پانچویں دن پانچواں اور چھٹے دن چھٹا کلمہ انہوں نے سے اذہر کروادیا۔ ساتویں دن درس کے بعد مولوی صاحب نے خود اس نمازی سے چھ کلمے سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے خافت چھ کے چھ کلمے سنا دیے۔ مولوی صاحب نے خوش ہو کر اس نمازی کی پیٹھ چھگی۔ میں نے آہستہ سے کھٹاکر کہا۔

”میں نے بھی یہ چھ کلمے یاد کر لیے ہیں جناب۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی صبح کے لیے ایک مرتبہ سنا دوں۔“

مولوی صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ عبد اللہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً ہی چھپا لیا۔ مولوی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا البتہ سر ہلکا کر اجازت دے دی۔ میں نے بھی چھ کے چھ کلمے مولوی صاحب کو سنا دیے۔ ایک آدھ جگہ میں اٹکا تو مولوی صاحب نے ہی صبح بھی کر دی۔ میں نے چھ کلمہ ختم کیا تو مولوی صاحب نے دھیرے سے کہا۔ ”جذاک اللہ۔“

ان کے فوراً بعد عبد اللہ کے منہ سے بھی یہی دعا نکلی۔ اب یہ ہمارا معمول ہو گیا تھا جو نمازی بھی مولوی صاحب سے کچھ بتانے یا سکھانے کی فرمائش کرتا میں بھی پنے آپ ہی ان کے ساتھ ساتھ وہ سب اذہر کرتا جاتا تھا۔ مثلاً ایمان مفصل، ایمان مجمل، دعائے قوت، مختلف مسنون دعائیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ مجھے بھی بچپن میں مولوی صاحب ہی کی طرح کے ایک مولانا نے سکھایا تھا۔ جیسے ہر گھر میں مسلمان بچوں کو سکھانے کے لیے کوئی مذکورہ کوئی لائق بندہ آتا ہی تھا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے جوانی کی مدتوں میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ میں یہ دعائیں بخوبی گئیں اور ان کی جگہ میرے ذہن میں انگشت گانے اور ان کے سنگرز کے نام بھرتے چلے گئے۔ ان چند دنوں میں مجھے پھر سے وہ سب کچھ اذہر ہو گیا تھا جسے میں کئی سالوں سے نہ دھرانے کی وجہ سے بھلا بیٹھا تھا۔

مولوی صاحب نے بھی اب جیسے میری موجودگی سے اک سمجھو ہی کر لیا تھا کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ میں نے کبھی کسی مقصد کے لیے بھی براہ راست ان سے بات کرنے کی یا پھر ان کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کبھی کبھی جب مولوی صاحب کسی وجہ سے جماعت کروانے کے لیے نہیں آ پاتے تھے تب عبد اللہ یہ فریضہ سرانجام دیا کرتا تھا۔ اُس دن البتہ میں عبد اللہ سے ضرور براہ راست کوئی سوال کر لیا کرتا تھا۔ جو مجھے کچھ دنوں سے میرے ذہن میں موجود تو ہوتا لیکن مولوی صاحب کی موجودگی

کی وجہ سے زبان پر نہیں آتا تھا۔ عہد اللہ بھی بڑے کھلے دل سے میرے سوال سنتا اور بہت تفصیل سے ان کے جواب دینے کی کوشش کرتا تھا۔ یوں چاہے میری محبت کی وجہ سے ہی کبھی پر دھیرے دھیرے مجھ پر میرا مذہب کھلنے لگا تھا۔

عہد اللہ نے کبھی اس دوران تنہائی میں بھی مجھ سے کسی ذاتی مسئلے پر گفتگو نہیں کی تھی۔ البتہ اس دوران عہد اللہ اور مولوی صاحب کی زبانی بہت سی باتیں جو پہلے میری نظر سے اوجھل تھیں مجھے اب ان کی سمجھ آنے لگی تھیں۔ خیر داتا گنگے والے نے تو اب یہ روز کا معمول بنالیا تھا کہ وہ فجر اور عشاء کے وقت کوئی درواری اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ اور میرے اسٹیشن سے نکلنے سے پہلے ہی وہ ان اوقات پر اپنا تانگہ سب سے آگے بڑھا کر کھڑا میرا انتظار کرتا رہتا تھا۔ اُسے مجھ سے میری "منت" کی وجہ سے عقیدت سی ہو گئی تھی اور اس کی بدولت سارے ریلوے اسٹیشن کو یہ بات پتہ چل گئی تھی کہ محمد بابو کسی منت کے سلسلے میں روز نہ کہیں جاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان بھی نے مجھ سے بنا کوئی بات کہے از خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ ضرور یہ منت کسی محبت کے سلسلے کی ہی ہوگی۔ شاید میری عمر ہی ایسی تھی۔ یا شاید محبت خود عاشق کے روم روم سے نکلتی ہے۔ اس کی آنکھیں، اس کی چال و حال اس کا چہرہ چمک چمک کر لوگوں کو بتا رہا ہوتا ہے کہ دیکھو۔۔۔ یہ جارہا ہے وہ شخص جس نے محبت کرنے کا جرم کیا ہے۔ یہی ہے وہ گناہ گار جو سنگسار کیے جانے کا حق دار ہے۔

بہرحال ان دنوں اسٹیشن پر میری اور میری "منت" کی بڑی دھوم تھی۔ صدیقی صاحب بھی کبھی کبھی دفتر چھوڑ کر ڈرائی پورٹ کے گوداموں کی طرف چلے آتے اور مجھے کہیں نہا بیٹھا دیکھ کر مسکرا کر میرے ہال ہاتھ بڑھا کر نکمیر دیتے اور بنا کچھ کہے واپس چلے جاتے۔ عجیب سی شفقت تھی ان کے انداز میں۔ جیسے کہہ رہے ہوں، کیے جاؤ یہ محبت کا جرم۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں گھبرانا نہیں۔۔۔۔

شکر سے گاہے گاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔۔۔۔ عہد اللہ نے شاید اُسے مسجد میں میری روزانہ کی حاضری کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے مل کر کچھ نہ بولا۔۔۔۔ بس مجھے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ محبت شاید پیدا ہی سب کو دلانے کے لیے ہوتی ہے۔ واپسی پر نگہت سونپی آنکھوں کے ساتھ برآمدے کی اوٹ سے باہر نکلے اور اُس نے میرے ہاتھ پر کوئی امام ضامن باندھ دیا۔ لوجی۔۔۔۔ یہ تو خیر وہی منت والی بات بھی سچ ہی ہوگئی۔ مجھے نگہت سے اُس ناز ادا کی حالت پوچھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی اس کے آنسو مجھے دیکھ کر قہقہہ نہیں پاتے تھے۔ کچھ پوچھ بیٹھتا تو اسے سنبھالنا واقعی مشکل ہو جاتا۔ امام ضامن باندھ کر اس نے بڑے پیار سے میرے ہال سنوارے اور سر پر ہاتھ رکھ کر یوں دعا دی جیسے وہ میری بڑی بہن ہو۔ اس ایک محبت نے مجھے کتنے لوگوں کی نظروں میں معتبر بنا دیا تھا، مجھے اس دن احساس ہوا کہ محبت بیک وقت ہمیں کئی نظروں میں معیوب کر دیتی ہے اور کئی نظروں میں ہمیں محترم بنا دیتی ہے۔ محبت ایک ہی وقت میں زہر اور اسی لمحے میں تریاق کا کام دیتی ہے۔

☆☆☆



## شرم پیچہ

جس دن سے میں نے ”ہالوکاسٹ“ پر اپنا تحقیقی پرچہ لکھنے کا اعلان کیا تھا اسی دن سے سراسر ترک بھی مجھ سے کچھ کچھ کچے سے رہنے لگے تھے۔ جوزف سے ملاقات ہوئی تو اس نے میرے کانٹے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں جانتا تھا کہ تمہیں روکنا بہت مشکل ہوگا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

ریکا جانے کلاس میں زیر لب کیا کچھ پڑھتی راتی اور مجھ پر آتے جاتے چومکس مارتی راتی۔ سارا ہستہ سکون تھی لیکن اس کا گینگ مجھے کھ جانے والی نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔ اور پھر اس دن وہی ہوا جس کا کامران بہت دنوں سے خدشہ ظاہر کر رہا تھا۔

اس دن یونیورسٹی جلدی خالی ہوگئی تھی کیونکہ شہر میں کسی جلسے کی وجہ سے آس پاس کی سڑکوں کو بند کر کے تہہ بول راستوں سے ٹریفک گزار نے کا اعلان کیا گیا تھا۔

انتظار میں نے اسٹوڈنٹس کی سہولت کے لیے ایک لیجر پہلے ہی یونیورسٹی کی بیس چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس دن کامران کی گاڑی سے کرا آیا تھا۔ میں اور ریکا مرکزی عمارت سے نکل ہی رہے تھے کہ کہیں سے جم، ڈیڑا اور نینتا نمودار ہو گئے۔ جم حسب معمول میرا راستہ روک کر کھڑ ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے تم نے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تم اس یونیورسٹی سے فوراً دفع ہو جاؤ۔ اور دوبارہ پلٹ کر اس طرف کا رخ بھی نہ کرنا۔“

”اور اگر نہیں ایسا نہ کرو تو۔۔۔۔۔؟“

ڈیڑا دو قدم آگے بڑھ آیا۔

”تو پھر جم تمہارا بندہ ہست کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔“

جم نے میرا گریبان پکڑ لیا، ریکا زور سے چلائی۔

”ہے جم۔۔۔۔۔ چھوڑ دو میڈی کو۔۔۔۔۔ تم وحشی ہو۔“

لیکن جم نے میرا گریبان نہیں چھوڑا۔

”میرا گریبان چھوڑ دو جم۔۔۔۔۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں۔۔۔۔۔“

اسنے میں سارہ جانے کس جانب سے دوڑتی ہوئی وہاں آ پہنچی اور میری بات اُدھوری رہ گئی۔ سارہ نے آتے ہی ایک جھٹکے سے میرا گریبان جم کے ہاتھوں سے چھڑوا دیا اور چلا کر بولی۔

”یہ کیا پاگل پن ہے جم تم گلی کے تختوں جیسے سارا تار کرو گے۔۔۔ تم سے یہ توقع نہیں تھی مجھے۔“  
 جم سارہ کو دیکھ کر کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ نہیں ریکا کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ مجھے آوازیں دیتی ہوئی پیچھے چلی آئی۔  
 ”جم کی طرف سے نہیں تم سے معافی مانگتی ہوں جانے اُسے کیا ہو گیا ہے۔“  
 نہیں نے غور سے سارہ کی طرف دیکھا۔

”شاید وہ سچ کو برواشت نہیں کر پا رہا۔ سچ کو ختم کرنا واقعی ایک مشکل کام ہے۔“ سس سارہ کو یونہی گم مسم کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ریکا نے رستے بھر جم کو دل کھول کر موٹی موٹی گالیاں دیں۔ میں ہانڈ پارک کے علاقے میں واقع اس کے اپارٹمنٹ تک اُسے چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔ پکاؤں کی مرکزی سڑک سے دائیں مڑتے ہی وہ بچوں کی طرح چلانے لگی۔ سڑک کے کنارے ایک کینڈی فلاس بیچنے والا جو کروں کے لباس میں کھڑا تھا اور آتے جاتے بچوں کو مختلف اوٹ پٹاٹک حرکتیں کر کے ہنسا رہا تھا اور انہیں لمبوں والی منڈی خریدنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہب۔۔۔ بچپن میں ہم اسے لمبوں والی منڈی ہی تو کہتے تھے۔ ہمارے گھر کے باہر گلیوں میں ایک بوڑھا سا ہاد شیشے کے بڑے سے مرتبان میں بہت سی روٹی کے گالوں جیسی سفید اور گلابی منڈائی کے گولے لے کر آتا اور ان کو ہر ایک مونے سے نیکے کے گرد خوب اچھی طرح گھما کر پیسٹ کر ہمیں بہت سے گولے تھما دیتا۔ یہاں پر انہی روٹی کے گولوں کو کینڈی فلاس کہا جاتا تھا۔

ریکا کی چچی و پکار سے مجبور ہو کر مجھے بھی گاڑی سڑک کے کنارے لٹائی پڑی۔ وہ جلدی سے اچھل کر گاڑی سے اتر کر بھاگ کر کھادوں کے پاس پہنچی مٹی اور پھر وہاں روٹی کے دو بہت بڑے سے پیپے اور گلابی گولے بنا کر مجھے بھی باہر آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ واقعی اس لڑکی کو ایک کر دٹ بھی ممکن نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے بھی نیچے اترنا پڑا۔ پھر ہم بہت دیر تک وہیں سڑک کنارے پتھر کی لمبی سی سل پر بیٹھے کھادوں کی بکری کرواتے رہے۔ ہمارا بچپن بڑھاپے تک ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اندر کہیں دیک کر بیٹھا رہتا ہے اور موقع ملے ہی مجھ سے باہر نکل آتا ہے۔ ہمیں جیہوں میں کچھ اور اخروٹ بھرنے پر اکساتا ہے۔ تنہا سڑک پر زور سے سیٹی مارنے پر مجبور کرتا ہے۔ راہ چلتے چلتے والے سے برف کے گولے پر شربت ڈالو اگر مزے سے چوسنے پر مائل کرتا ہے۔ کھنی منٹھی گویاں اور چوڑن گھروالوں سے ٹھپ کر من میں بھرنے پر شاباش دیتا ہے۔ وہی بچپن آج ریکا کے اندر سے بھی چھلک رہا تھا۔ اور اس لڑکی کے بہانے میں نے چند ہل اپنے بچپن کے بھر سے پتالے۔

لیکن اس وقت ہم دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ کل کا سورج کیا لے کر آنے والا ہے۔ اگلے دن یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلی جو خبر ملی وہ یہ تھی کہ میری اور جم کی وضاحت طلب کی گئی تھی۔ ہمارا جرم تھا یونیورسٹی کے ماحول اور ڈسپن کو خراب کرنا اور اس ایکسپلینیشن (Explanation) کا لکھنا جو اب ہمیں آج زبانی اور تین دن کے اندر تحریری طور پر جمع کروانا تھا۔ ریکا اس بات پر بے حد سخ پا تھی۔ ”یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ ساری یونیورسٹی جانتی ہے کہ سارا قصور جم کا تھا۔ اُس نے تمہارا راستہ روکا تھا اور تم نے تو جواب میں اسے کچھ کہا بھی نہیں۔ نہیں خود سراسر آنرک سے بات کروں گی۔۔۔ میں دیکھتی ہوں تمہارے خلاف کوئی کیسے ایکشن لیتا ہے۔“

وہ اپنے آپ ہی شدید غصے میں بڑبڑاتے جا رہی تھی اور جانے کب سے لان میں ادھر ادھر ٹھہل رہی تھی۔ جیسے زور زور سے زمین پر پاؤں مار کر اپنا غصہ نکال رہی ہو۔ مجھے اس کے اس ناراض سے انداز پر ہلکی آگلی۔



نہیں اسی باقاعدگی سے مولوی عظیم کی مسجد میں دن کی دو نمازیں پڑھنے جا رہا تھا۔ اس دوران ایک اور واقعہ درپیش آ گیا۔ کوئٹہ سے کراچی کے لیے سہ پہر چار بجے تک قریب بولان میل نامی ایک گاڑی روزانہ نکلتی ہے۔ جس کا کوئٹہ سے نکلنے کے بعد تیسرا اسٹیشن چھ نامی شہر پڑتا ہے۔ شہر کیا ہے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی وجہ شہرت یہاں انگریز سرکار کی بنائی ہوئی ایک بہت بڑی جیل ہے جو ”چھ جیل“ کے نام سے ہی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں جرائد نمیان کے کالا پانی جیل کی جو شہرت تھی وہی اس چھ جیل کی بھی تھی۔ اس قصبے کے درمیانے طبقے کے لوگ صبح کراچی سے آتی ہوئی اسی بولان میل کی پہلی گاڑی سے کوئٹہ آ جاتے تھے جو صبح آٹھ بجے کے قریب کراچی سے چھ پہنچی تھی۔ دن بھر اپنے کام چلنا کروہ شام کو اسی میل کی ڈاؤن ایکسپریس سے جا رہے دوبارہ چھ کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ جو انہیں ڈیڑھ گھنٹے میں چھ پہنچا دیتی تھی۔

اس دن صدیقی صاحب کے کوئی دوست جو ان دنوں مجھ ریلے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر تعینات تھے اپنے گھر والوں کے ساتھ صدیقی صاحب کی دعوت پر کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ شام کی گاڑی سے واپس مجھ جا رہے تھے۔ یہی بچوں نے شاید کوسنگ کے باز اوروں سے بھی چیزوں کا ایک آدمہ منونہ ضرور خرید تھا تبھی ان کے ساتھ سامان کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ٹرین چھوٹنے کا وقت تھا لہذا صدیقی صاحب اور دوسرے قلمیوں کو ہوا کر جلدی جلدی ن کامان گاڑی کی بوگی میں رکھا رہے تھے۔ میں نے دور سے دیکھا تو میں بھی در کے لیے چلا آیا۔ غصہ کے کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اس سے اور ایک دوسرے بوڑھے قلمی سے سوٹ کیس کے لیے اور گاڑی کی طرف پلٹا نظر انداز کیا تو عبداللہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ عبداللہ مجھے یوں قلمیوں کے لباس میں سوٹ کیسوں اور بکسوں کے بوجھ تلخ لدا پسند ادیکھ کر چند لمحے کے لیے تنگ سا کھڑا رہ گیا۔ میں نے مسکرا کر اس سے پوچھا کہ کیوں عبداللہ میاں۔۔۔ اقلی چاہیے تو بولو۔ لیکن حدودری۔۔۔۔۔“۔ اچانک جیسے میری زبان پر کسی نے کوئی جلتا ہو کوئلہ رکھ چھوڑا ہو۔ عبداللہ کے بالکل پیچھے کچھ فاصلے پر کاکے برقعے میں بیوس وہ کھڑی تھی۔۔۔۔۔

ہاں ہاں۔۔۔۔۔ وہ وہی تھی۔۔۔ میں اس کی اُن قاتل نگاہوں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ اس کے پیچھے جیہ اور ایک بوڑھی سی خاتون بھی تھیں جو سفید مٹیل کا کمرے میں بیویں تھیں۔ شاید وہ ایمان کی اماں ہی تھیں اور یہ سب لوگ عبداللہ کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کبھی مجھے پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیے۔ میرے دونوں ہاتھوں سے سوٹ کیس گرتے گرتے بچے۔ میں نے سامان نیچے رکھا۔ عبداللہ نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن میں اپنے حواس میں تھا ہی کہاں، پتہ نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ میں نے جتنی مرتبہ بھی ایمان کو اپنے روبرو پایا تھا، میں اپنا آپ کھو بیٹھا تھا۔ مجھے اس کے بعد ہمیشہ خود پر بے حد غصہ آتا تھا اور میں حسرت سے سوچتا تھا کہ جتنی گھڑیاں بھی وہ میرے سامنے موجود رہی تھی، میں نے اک اک مل بنا، کوئی لمحہ ضائع کئے اسے دیکھا کیوں نہیں۔۔۔۔؟ کیوں میری نظر ایک رتی بھر مل کے لیے بھی ادھر ادھر ہوئی۔۔۔۔؟

کیوں اس وقت میں کسی اور بات میں الجھا رہا۔۔۔؟ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت بھی میری ہو رہی تھی۔ جانے عبداللہ نے کیا کہا؟ جانے میں نے اسے کیا جواب دیا؟ غصہ اور دوسرے قلیوں نے دیکھا کہ میں اپنے کسی جاننے والے سے بات کر رہا ہوں تو وہ خود ہی میرے آس پاس بکھر، صدیقی صاحب کے مہمانوں کا سامان اٹھ کر چل دیے۔ جیسا ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے بزرگ خاتون کو بھی میرے بارے میں کچھ بتایا۔ ایمان حسب معمول سر جھکائے کھڑی تھی۔ پر میں نے محسوس کیا کہ جس پل اس کی بے خبری میں پہلی بار یہاں پیٹ فارم پر مجھ سے نظر چڑھوئی تھی، تب سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ میں نے عبداللہ کے ہاتھ سے ٹکٹ لے لیے تاکہ ان کی ان کے ذبے تک رہ نہائی کر سکوں۔ سامان لینے کی کوشش کی لیکن عبداللہ نے سامان کو مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔

ان کا ذابا بس دو بوگیاں چھوڑ کر ہی تھا۔ عبداللہ عورتوں کو اندر بٹھا کر خود باہر میرے پاس آ گیا۔ کچھ دیر تک ہم خاموش کھڑے رہے۔ شاید ہم دونوں کو کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔ دھنسا عبداللہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں اپنی آنکھوں سے لگایا۔ اس کی ہینگلی چٹکیں محسوس کرتے ہی میں نے تپ کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور اسے کندھے پر چسکی دی۔ کبھی کبھی واقعی لفظ ہمارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں دوسرا سہارا آنکھیں ہوتی ہیں جو ہمارے جذبات دوسروں تک منتقل کر سکتی ہیں۔ پر اگر اس لمحے آنکھیں بھی جھٹک رہی ہوں تو پھر ہمارے پاس ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ جو کبھی ہاتھ پکڑ کر، کبھی کمر سہل کر، کبھی جھکی دے کر اور کبھی دوسرے کو گلے لگا کر اسے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اس کے حال میں شریک ہیں۔ میں بھی اس وقت عبداللہ تک بس یہی باتھوں کی بولی ہی پہنچا سکا۔ میں نے اس سے محسوس کیا کہ جیہ کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں جنہیں اس نے فوراً برقعے کا پلو گرا کر چھپا لیا۔ جیہ اور ایمان کھڑکی کے قریب ہی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ عبداللہ نے جاتے جاتے بتایا کہ وہ لوگ بھی "مجھ" ہی جا رہے ہیں۔ جہاں مولوی صاحب کی بہن رہتی تھیں، شاید کسی تقریب کے سلسلے میں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میری ایمان سے ان دو تین ٹوٹی پھوٹی حقائقوں کے علاوہ آج تک کبھی سامنا بھی نہیں ہوا تھا لیکن یہ نہیں اس کے کوسے سے باہر جانے کی خبر سن کر مجھے ایسے محسوس ہوا کہ سارا شہر ہی ہمیشہ کے لیے سنسان ہونے والا ہے۔ مجھے لگا کہ جیسے یہ ٹرین مجھ سے میرا دل، میرا سب کچھ جھین کر لے جانے والی ہے۔ ایک دم ہی سے جانے کتنی بے چینیاں میرے رگ و پے میں تیرنے سی گئی تھیں۔ ٹرین دو بار دسل دے چکی تھی، عبداللہ نے مجھے گلے لگایا اور پٹ کر ٹرین میں چڑھنے کے لیے بوگی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میری نظر بے اختیار ذبے میں بیٹھی ایمان کی طرف اٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے جیسے یہ ٹرین، یہ پیٹ فارم، یہ آس پاس کے بھانت بھانت کی بوئیاں بولتے لوگ، یہ شور، یہ زمین، یہ آسمان۔۔۔ سب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایمان اور اس کی دو آنکھیں اس کائنات میں باقی رہ گئیں۔۔۔۔۔ لیکن میری اس بدحواسی کی صرف اتنی ہی وجہ نہیں تھی۔ ایمان میری ہی طرف دیکھ رہی تھی، جی ہاں۔۔۔ میری طرف۔۔۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے مجھ پر کوئی دوسری نظر ڈالی تھی۔ دوسری نظر، اور وہ بھی اپنی مرضی سے، جیسے ہی میری اس سے نظر ملی۔ اک تارے کو اس کی آنکھوں میں نمی کی ایک چمک سی لہرائی۔ اور پھر اس نے گھبرا کر نظر جھکا لیا۔ مجھے لگا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ اب میری سانسیں تھم جانی چاہئیں، مزید زندگی بے کار ہے۔

مجھے اپنے نصیب پر اتنا رشک پہلے کبھی نہیں آیا۔ جتنا اس لمحے آیا تھا۔ ٹرین نے ہلکا سا جھٹک لیا۔ ٹی ٹی نے تیسری اور آخری سیٹی بجائی۔

گازی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ عبداللہ بھی آ کر دوسری جانب اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ عبداللہ کو الوداع کہنے کے لیے اوپر اٹھ گیا۔ عبداللہ نے بھی ہاتھ ہلایا، میں اضطراری طور پر ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، جیسے کوئی بچہ اپنے کسی عزیز از جان کھلونے کو کسی اور کے ہاتھوں میں سوہنے تو دے پر جب وہ جانے لگتا ہے تو وہ بھی ساتھ ہی چل پڑتا ہے۔ گازی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی میرے قدموں کی بھی۔۔۔۔۔ جانے مجھے کس چیز کی آس تھی، کون سی تہن میرے دل کو اس وقت چیر رہی تھی، کاٹ رہی تھی۔ میری نظریں مستقل اندر بیٹھی سر جھکائے، کانپتی ہوئی ایمان پر تھیں۔۔۔۔۔ پلیٹ فارم کا آخری کنارہ قریب آتا جا رہا تھا۔ جانے میرے قدم راستے میں پڑی چیزوں اور سامان سے کتنی ٹھوکریں کھا چکے تھے، لیکن تب بھی میں لڑکھڑاتے ہوئے ڈھکی قدموں سے ٹرین کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا رہا۔ شاید غصے نے کچھ چل کر کہا تھا۔ شاید کچھ قلی میری طرف بڑھے بھی تھے تاکہ مجھے روک سکیں تاکہ میں پلیٹ فارم کے سرے سے گر کر ٹرین کے نیچے ہی نہ آ جاؤں۔ پر مجھے اس سے ہوش ہی کہاں تھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس بار ایمان میری نظروں سے ڈوب جھل ہوئی تو پھر شاید میں اُسے دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ میں نظریں اندر ڈبے میں گاڑ دی آگے بڑھتا رہا اور پھر جیسے قدرت کو میری حالت پر رحم آئی گیا۔ میری بے چارگی میری اچاری نے عرش پر جتنے ماتھے دیکھے تھے، شاید آسمان پر وہ سرے بعد بے نقاب ہو گئے تھے۔ ایمان نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھایا اور باہر مجھ پر نظر ڈالی۔ چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی ایک نظر میں جانے کتنے سوال، کتنی التجا، کتنی بے بسی تھی۔ دوسرے لمحے ہی ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم سے نکل چکی تھی۔ مجھے جانے کس کے بازوؤں نے تھم لیا۔ میں اپنی سمدھ بدھ کھو چکا تھا۔ بس ٹرین کے تیز پہیوں کی گڑ گڑاہٹ میری سماعتوں کو چیر رہی تھی۔ "نسوؤں سے میرا چہرہ دھل رہا تھا۔ میں وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ دوڑ جاتی ٹرین کو دیکھتا رہا۔ میرے آس پاس میرے ساتھی قلی، غفور، صدیقی صاحب اور جانے کون کون مجھے تسلی دینے کے لیے تھپک رہا تھا۔ سہارا تھا، اپنے ساتھ سمجھ رہا تھا، گلے لگا رہا تھا، لیکن مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ دنیا میرے لیے فنا ہو چکی تھی۔

جانے ایمان کی نظر میں کیا تھا؟ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی؟ شاید یہی کہ میں یہ پاگل پن اور بے پرواگی چھوڑ دوں، کہیں نہ کہیں تو میرے سینے کی یہ آگ اور میرے سینے سے اٹھتا یہ دھواں اس کا اجلا دامن بھی تو میلا کر رہا تھا۔ ہاں شاید یہی بات تھی۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ پھر اس کی "کھوں میں یہ بے بسی کیسی تھی۔۔۔۔۔؟ یہ سوال کیسے تھے۔۔۔۔۔؟ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس پٹری پر چلا جاؤں، چلا جاؤں۔۔۔۔۔ وہاں تک، جہاں وہ ٹرین، ایمان کو لے کر گئی تھی۔ اُسے جا کر اس انجانے قصبے میں سے کہیں ڈھونڈ نکالوں اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھم کر میں اس نازنین سے پوچھوں کہ "س کی آنکھوں میں وہ کیا سوال تھا؟ وہ ایک بار پوچھ کر تو دیکھتی۔۔۔۔۔ میں اپنی روح کا آخری دھماکا سمجھ کر بھی اس کے سوال کا جواب ڈھونڈ ہی مانتا۔

شام ڈھل چکی تھی، در، سنشائن دھیرے دھیرے ویران ہوتا جا رہا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے ایک کونے میں جلدے جانے والے لکڑی کے مٹکوں اور دیگر بے کار اشیاء کے جلتے الاؤ کے گرد بیٹھا ہوا تھا۔ آگ میں لکڑی کے تختے بچ رہے تھے۔ غصے نے میرے کان دھڑے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ تیرے اندر تو بڑی آگ ہے۔۔۔۔۔ سب ہی کچھ اندر رکھے گا تو اندر ہی اندر جھل جائے گا۔ ارے غفور تو سمجھتا تھا کہ آج تک صرف اُسی نے عشق کیا ہے۔ آج پتہ چلا کہ اپنے کو تو عشق کے سین کا بھی نہیں پتہ۔۔۔۔۔ کہاں سے لایا ہے تھالا۔۔۔۔۔ اتنی نار۔۔۔۔۔ ایک



جھٹک نے ہی سارا اسٹیشن جدا کر رکھا۔ ایسے نہ کر باپو۔۔۔ ہم غریبوں پر کچھ رحم رکھ۔۔۔ بتا دے تو کون ہے؟۔۔۔ کیوں ہم گناہ کاروں سے اور گناہ کردار ہا ہے۔۔۔ تو تو کسی سلطنت کا شہزادہ ہے، ان مزدوروں میں کیا کر رہا ہے۔۔۔؟۔۔۔

میرے پاس غفورے کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیا بتا میں اُسے؟ میں کچھ نہ بولا بس اس کا ہاتھ زور سے تھام لیا۔ ہاتھوں کی بونے اُسے جانے کیا پیغام دیا کہ پھر اس نے بھی دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ بس چپ چاپ بیٹھا آگ تا چارہا۔ جلتی آگ چلتی رہی اور ہم دونوں کے چہروں کو سنہری اُجالے سے روشن کرتی رہی۔

نہ جانے کیوں اس دن کے بعد سے میں جب بھی اسٹیشن کے کسی بھی حصے یا پیٹ فارم سے گزرتا تو اس پاس کام کرتے میرے ساتھی، اسٹیشن کا عہدہ، میرے افسر سبھی رک کر مجھے دیکھنے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا احترام در آتا تھا۔ جیسے مجھے اس عشق کی ایک واردات نے ان سب کی نظروں میں بہت محترم کر دیا ہو۔ حالانکہ میں خود اپنی اس دن کی بے خودی پر بے حد شرمندہ تھا۔ دوسرے دن اور اس کے بعد مجھے سب کے سامنے جاتے ہوئے کس قدر مشکل کس قدر شرمندگی ہوئی تھی یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔

میں لگا تار روز نہ کراہی سے آنے والی ایکسپریس اور دیگر گاڑیاں ضرور چپک کر تا تھا کہ شاید ایمان واپس آ گئی ہو۔ لیکن ہر روز مجھے یوپی ہی ہوتی تھی۔ دودن گزر گئے پھر تین پھر چار۔۔۔۔

میری پھر اور عشاء کی "نسٹ" والی نمازوں میں بھی بے قاعدگی ہونے لگی تھی۔ بس ہر لمحہ ذہن و دل پر وہ دو آنکھیں ہی سوار رہتی تھیں۔ مجھے ہر وقت بخیر سارے ہنے لگا تھا۔ غور ایک بار اصرار کر کے کسی ڈاکٹر کو کہیں سے پکڑ لایا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بیماری پوچھی تو غفورے کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "عشق کا بخار ہے ڈاکٹر صاحب۔"

اور ڈاکٹر بھی میرے ساتھ ہی انس پڑا۔ واقعی شاید یہ محبت کا ہی بخار تھا۔ یہ جذبے بھی کس قدر طاقت ور ہوتے ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر گھس کر، خون کے بہاؤ میں شامل ہو کر ہماری نسوں سے، ہماری رگوں سے، ہمیں چھانچھاڑ تک کر سکتے ہیں۔ ہمارے پورے جسم کا نظام بگاڑ سکتے ہیں، آلت پلٹ کر سکتے ہیں۔ اب بھلا ایسی کسی بیماری کو دے چارہ ڈاکٹر کیا پکڑ پاتا۔

اس رات بھی مجھے شدید بخار تھا، لیکن میں نے خیر کو تاکہ لگانے کا کہا اس نے میری طبیعت کے پیش نظر کچھ بیت و حل سے کام لیا تو میں دوسرے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔ مجبوراً خیر کو ہی اپنا تاکہ آگے بڑھانا پڑا۔ میں مسجد کے قریب پہنچ کر اتر گیا۔ راستے میں خیر نے اپنی بڑی سی پشادری شل مجھے زبردستی اوڑھادی تھی۔ میں اندر جا کر ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ مولوی علیم حسب معمول اپنے وقت پر پہنچے اور نماز پڑھوائی۔ نماز کے بعد حسب معمول درس اور پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولوی صاحب کی نظر مجھ کو تجلی صاف میں بیٹھے ہوئے مجھ پر پڑی اور پھر وہ سواں کرنے والے نوجوان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نوجوان نے پوچھا۔

"مولوی صاحب۔۔۔ یہ بتائیے کہ ہمارے مذہب میں محبت کی شادی کی گنجائش ہے یا نہیں۔"

بے اختیار میری نظر مولوی صاحب کی جانب اٹھ گئی لیکن انہوں نے مجھے دیکھے بتا اس نوجوان کو جواب دیا۔

”محبت شادی کے بعد میاں بیوی میں ہوتی تھی چائز ہے۔ اس کے علاوہ دوسری قسم کی محبت جائز نہیں ہے۔“ تو جوان کی تسلی نہیں ہوئی۔

”لیکن مولوی صاحب ہمارے مذہب میں لڑکی سے سوال کرنے کی گنجائش تو ہے نا۔ میں نے تو سنا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کو ایک دوسرے کی جھلک دیکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ مطلب لڑکی اور لڑکے کی پسندیدگی ضروری ہے۔“

”مولوی صاحب نے سختی سے کہا۔“

”ہاں اگر ضرورت پڑے تو کسی حد تک اس کی اجازت ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں وہی شادیاں کامیاب ہوتی ہیں جو والدین کی مرضی سے طے پا جائیں۔ اتنا بڑا فیصلہ ایک کمزور، ناکھ اور نا عمر لڑکی پر چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔ دنیا کے کوئی ماں باپ جان بوجھ کر اپنی معصوم بیٹی کو کس لحاظ سے کس شخص کے ساتھ کیوں باندھنا چاہیں گے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ یہ فیصلہ لڑکی کے ماں باپ یا اس کے بڑوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔“

مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے جواب دے دیا تھا تو جوان تو شاید مطمئن ہو ہی گیا ہو لیکن جانے اس ایک ہل میں مجھے کیا ہوا۔ میں کئی ہفتوں سے یہاں آ رہا تھا اور اس عرصے میں کبھی نہیں نے مولوی صاحب کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی لیکن اس روز نہ جانے میں کیوں بول پڑا۔ مولوی صاحب محفل سمیٹ کر اٹھنا ہی چاہ رہے تھے کہ میری آواز سن کر کبھی چونک کر رک گئے۔

”مولوی صاحب کسی بھی لڑکی کے بچے اس کے ماں باپ کو رشتہ طے کرتے وقت لڑکے میں کن شرعی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“

کچھ دیر کے لیے مولوی صاحب چپ سے رہ گئے۔ لیکن باقی نمازیوں کی وجہ سے انہیں جواب دینا ہی پڑا تھا۔

”تمام شرعی باتوں کا، مذہب، کلمہ، نماز، روزہ، حسب نسب سبھی کچھ۔“

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے مولوی صاحب کہ رشتہ مانگتے وقت کوئی اتنا ہی مذہبی ہونے کا ڈھونگ کر رہا ہو جتنا لڑکی کے گھر والے اس سے توقع کرتے ہوں۔“

”ایسی صورت میں یہ دھوکا ہو گا۔۔۔۔۔ اور دھوکے کا عذاب اس شخص کو پہنکتا ہو گا۔“

”میں پانچ وقت کا نمازی ہوں مولوی صاحب۔۔۔۔۔ چھ کلمے بھی مجھے یاد ہیں اور مذہب جو شرانگہ لگا تا ہے کسی مسلمان لڑکی سے شادی کے لیے میں ان سب پر پورا اترتا ہوں۔ دعا کریں کہ میں جس گھر میں رشتہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرا رشتہ طے ہو جائے۔“

میری بات سن کر اس پاس بیٹھے نمازی زیر لب مسکرا دیے۔ مولوی صاحب نے بادل غواستہ ہی سہی، پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھ دیے۔ دعا قسم ہوئی اور لوگ اٹھ کر وہاں سے چل دیے۔ میں اور مولوی صاحب پیچھے تیار رہ گئے، انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

”میں جانتا تھا کہ تم یہ سب کچھ کس دھوکے کے طور پر کر رہے ہو، تمہارا اصل مقصد کچھ اور ہے اور خرکار آج تمہارے دل کی بات زبان پر آئی گئی۔“

”آپ کون ہوتے ہیں کسی کی عبادت کے بارے میں حتیٰ فیصلہ دینے والے۔ یہ تو بھلے گا اپنے خدا کے ساتھ براہ راست معاملہ ہوتا ہے۔ آپ یا میں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دکھ وا ہے؟ اور آپ کو تو دوسروں کے دکھاوے کو بھی بیچ مان کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ کون جانے

”یہی دکھاؤ کسی کو کسی دن سیدھی اور سچی راہ پر را کھڑا کر دے۔“

مولوی صاحب کچھ لاجواب سے ہو گئے۔ انہوں نے بات کا رخ بدل دیا۔

”تم چاہتے کیا ہو، آخر اس طرح سے بار بار میرے سامنے آنے کا تمہارا کیا مقصد ہے۔“

”آپ میرا مقصد جانتے ہیں، آپ نے اس دن مجھے میری لادینی کا احساس دلایا تھا۔ حالانکہ اس کم مذہبی میں بھی میرا اپنا سارا تصور نہیں تھا۔ مجھے بچپن کے بعد کسی نے ان باتوں کا احساس ہی نہیں دلایا۔ بہر حال۔۔۔ چاہے دیر سے ہی سہی۔ لیکن اب میں آپ کی مذہب کی لگائی ہوئی شرط پر بھی بہت حد تک پورا کرتا ہوں۔ اگر کچھ کی روگنی ہے تو میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ میں اسے بھی پورا کر دوں گا۔“

مولوی صاحب غصے سے پھٹ پڑے۔

”میں تمہاری سمجھ میں جانے یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہمارا اور تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اس گھر میں بیاہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”میرا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ درخواست میں اپنی ذاتی حیثیت میں کر رہا ہوں۔“

مولوی صاحب کی آواز بھڑاسی گئی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کی اور لرزتے ہوئے لہجے میں بولے۔

”کیوں میری برسوں کی کمائی ہوئی عزت کے در پے ہو۔ جب تمہیں اس مسجد میں یا اپنے محلے کے آس پاس بھی دیکھتا ہوں تو ساری ساری رات فکر سے مجھے نیند نہیں آتی۔ لوگوں کی زبان اگر چل پڑے تو پھر اُسے روکنا ناممکن ہوتا ہے۔ میری بچیوں پر اگر کوئی تہمت لگ گئی تو ساری عمر ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوز می ہو جائیں گی۔ ہماری غریبی پر کچھ رحم کرو۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے اور اس سے بھی چھوٹا ہمارا محلہ ہے۔ یہاں بات پھیلنے دیر نہیں لگتی۔ پہلے ہی تمہارے گھر کے نوکر دوں نے اس دن طرح طرح کی چٹیکونیاں کی تھیں۔۔۔۔۔ وہ تو بھلا ہوش کر کا۔ جس نے ان کی زبان وہیں روک دی۔ ورنہ تمہاری ماں اور بھابھی نے مجھے سولی پر لٹکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہر حال جو ہو اسو ہوا۔ لیکن میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”آپ یہ تصور بھی کیسے کر سکتے ہیں کہ میں کبھی ان جانے میں بھی آپ کی کسی بھی طرح کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہوں۔“

”تو پھر میں تم سے دوبارہ یہی التجا کرتا ہوں کہ اس خیال کو اپنے دس سے نکال دو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

مولوی عظیم کی آواز ”نودوں کی لرزش سے لمحہ بھر کو کانپنی اور ایک ہلکی سی میس وہ میرے گھٹنوں کے قریب دوڑا تو ہو کر بیٹھ گئے اور روتے ہوئے انہوں نے میرے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”میں چند لمحوں کے لیے توشن ہو کر ہی رہ گیا۔ یہ انہوں نے کیا کر دیا۔ میں نے تڑپ کر ان کے بندھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ مولوی عظیم کی بے باقاعدہ رو رو کر ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے مزید گناہ گار اور شرمندہ نہ کریں۔ میرا مقصد ہرگز آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ میں تو۔۔۔۔۔“

ان کی حالت دیکھ کر مجھے میں اپنے لفظ ہی کو بیٹھا تھا۔ میری بات کاٹ کر بولے۔

”تو پھر میری بات مان لو۔ تمہارا اور اس کا میل نہیں ہو سکتا۔ تمہارے گھر والے اور ہمارا معاشرہ اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ وہ زمین کی خاک ہے، اور تم آسمان ہو۔ تم جہاں کہیں بھی جاؤ گے کشتن کے بیٹے ہی کہلاؤ گے اور وہ جہاں کہیں سے بھی گزرے گی ایک غریب مولوی کی بیٹی ہی کہلائے گی۔ لوگ اس ملن کو عجیب عجیب طرح کے نام دیں گے۔ کل تک وہ الزام صرف تمہارے گھر والوں کی زبان پر تھے، جب ساری دنیا پینچ پیچھے یہی باتیں کرے گی۔ میں ایک پیش امام ہوں، لوگ میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ سوچو کل جب یہی لوگ میری پینچ پیچھے میرے گھر کی عزت اور ناموس پر انگلیاں اٹھائیں گے تو میں کیسے جی پاؤں گا۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے اُس کا گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالوں۔“

بس۔۔۔ اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے مولوی صاحب کے ہاتھوں کو زور سے دبا دیا اور اٹھ کھڑ ہوا۔ آسوں کا سیلاب اب بھی ان کی سفید داڑھی کو تر کر رہا تھا۔ میں کچھ اس طرح سے مسجد سے نکلا کہ جیسے کوئی جواری جوان ہنسب کچھ دُپر لگا چکا ہو۔ یکا یک آخری ہاری بھی ہارے۔ جانے میں کس طرح تانگے تک پہنچا۔ خیر میری حالت دیکھ کر بھلا گیا۔ اُس نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”اوئے خانہ خراب۔۔۔۔۔ بابو تیرا بخار تو شدید تیز ہو گیا ہے۔“

خیر نے جلدی سے مجھے تانگے کی کچھل سیٹ پر آڑھا تر پھانسا اور اُس نے تانگہ سڑک پر ڈال دیا۔ مجھ پر جیسے غنودگی کی سی اک کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے خود پر شدید فصد بھی آ رہا تھا۔ مجھے مولوی صاحب سے اس وقت یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آخری امید کا بھی خون کر دیا ہے۔

انسان بھی کتنا بے صبر ہے۔ جب تک امید کا دامن ہاتھ میں ہو، تب تک وہ اپنے زخم کریدنے سے باز نہیں آتا۔ ہر بار اس امید میں زخموں کا کھرند پکنے سے پہلے ہی دوبارہ کھرچ دیتا ہے۔ اور جب زخم اس بار بار کی پھینچ چھاڑ سے پک کر ناسور بن جاتا ہے تب وہی انسان پینچ کر ساری زندگی خود کو کوستا رہتا ہے۔

اُس وقت مولوی صاحب کی جو حالت ہو رہی تھی اُسے دیکھتے ہوئے وہاں سے میرا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ اس وقت مولوی صاحب کسی بھی قسم کی توجیہ سننے کے قابل نہیں تھے۔ انہوں نے نوٹ کر اپنی انا کا خوں بھی اپنے آپ ہی پاس پاٹ کر دیا تھا۔ کاش وہ اس دن بھی اپنے اُسی آپے میں ہی رہتے، مجھے ڈانٹتے، بُرا بھلا کہتے، دھککا دیتے، دھکے دے کر مسجد سے نکال دیتے، پر وہ نہ کرتے جو انہوں نے کیا تھا۔ اب میں ان کا سامنا کیسے کروں گا؟ میرے لیے تو جیسے ہر ذرہ ہی بند کر دیا تھا انہوں نے۔

جانے میرے ذہن میں کیسے کیسے دسو سے پلتے رہے۔ خالی سناں سڑک پر تانگہ تیزی سے تک تک کی آدزیں نکالتا انٹیشن کی جانب رواں تھا۔ سڑک کے کنارے لگی پہلی لٹکی تیلوں کے دائرے روز پر وقتے وقتے سے پھیلے ہوئے تھے۔ میرا ذہن بھی ان دائروں کی روشنی کے بیچ میں سڑک کے اندھیرے حصے کی طرح کبھی ڈوب جاتا اور کبھی روشن ہو جاتا۔ انٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اور میرا ذہن کھل اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔

☆☆☆

## جیوری کا فیصلہ

میں نہیں جانتا کہ سارہ کو انکوائری کمیٹی نے گواہی کے لیے بلایا یا نہیں، لیکن تین دن کے اندر انکوائری کمیٹی نے پانچ سو نوٹس بورڈ پر چپکا دیے۔ مجھے اور جم (Jim) دونوں کو ایک ایک سمسٹر کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ایک سمسٹر کا مطلب چھ مہینے کا تھا۔ ابدت ہمیں موقع دیا گیا تھا کہ ہم اس فیصلے کے خلاف یونیورسٹی انتظامیہ سے اپیل کر سکتے تھے۔ لیکن تین دن کے اندر اس کے بعد ہم یہ حق بھی کھو دیتے۔

اس دوران میرا اور جم کا ایک آدمہ ہار یونیورسٹی کیپس میں سامنا ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ بھرا آئی تھی۔ جیسے اس کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ جم جیسے لڑکوں کے لیے چھ مہینے کی معطلی صرف ایک پنک تھی۔ اس کا مقصد کسی بھی طریقے سے مجھے یہاں سے باہر نکالنا تھا۔ مجھے تو اب یونیورسٹی انتظامیہ بھی اس کی سازش میں براہِ راست شریک دکھائی دے رہی تھی۔ یہ گورے ہر کام بہت سوج بکھ کر اور طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں کا قانون اس قدر سخت ہے کہ مجھے بغیر کسی انکوائری کے یونیورسٹی سے نکال دینے میں انہیں اس بات کا خدشہ ہو گا کہ نہیں کہیں عدالت کا دروازہ نہ کھٹکنا دوں۔ اس لیے انہوں نے پکا انتظام کیا تھا اور اپنی ایمان داری اور انصاف ظاہر کرنے کے لیے انہوں نے جم کو بھی قربانی دینے پر تیار کر دیا تھا۔

پوری یونیورسٹی میں میرے واحد غمگینا صرف جوزف اور ریک تھے۔ ریکا کے تو آنسو ہی نہیں رک پارہے تھے۔ میں اُسے سمجھا بکھا کر قہقہہ مچاتا تھا کہ ابھی حتیٰ فیصلہ ہونا باقی ہے لیکن وہ ریکا ہی کیا جو کسی کی بات مان لے۔

آج یونیورسٹی میں اپیل داخل کروانے کا آخری دن تھا، ورنہ کل سے مجھے یہ کیپس چھوڑ دینا تھا۔ میں سیدھا ذین کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کمیٹی کے چاروں ارکان موجود تھے۔ سر آئزک نے دوبارہ مجھے تمام روداد پڑھ کر سنائی اور یہ بھی بتایا کہ یونیورسٹی انتظامیہ میرے تحریری جواب سے مطمئن نہیں ہو پائی لہذا میرے ایک سمسٹر کے لیے معطلی کا فیصلہ برقرار رکھا گیا ہے۔ میں نے براہِ راست سر آئزک کی آنکھوں میں دیکھ لیا لیکن وہ نظر نہ اٹھائے، میں غمگین ہوئے سچے میں بولا۔

”آج ہفتے کا دن ہے۔۔۔ اور میں جانتا ہوں کہ چیئر مین انکوائری کمیٹی مسٹر آئزک کے لیے یہ کس قدر مقدس دن ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ آج کے دن کوئی جانبدار فیصلہ نہیں کریں گے۔“

ہفتہ یودیوں کے لیے دیوہائی مقدس دن ہوتا ہے، جیسا ہمارے لیے جہو، مسٹر آئزک میرے اس طنز کو سمجھ گئے اور غصے کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ جیوری نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے مزید اپنی صفائی میں تو کچھ نہیں کہنا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ جیوری نے فیصلے پر دستخط کے لیے اپنے قلم اٹھ لیے۔

پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور سارہ کسی آغوشی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ سر آترک نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔

”مس سارہ۔۔۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ آج ڈین آفس میں روزانہ کے معمولات نہیں چلائے جا رہے۔ آج یہاں ایک ہم انکوائری کا فیصلہ سنایا جا رہا ہے۔“ سارہ نے جلدی سے اپنی سانس درست کی۔

”نہیں بھی اسی انکوائری کے سلسلے میں جیوری کی مدد کرنے آئی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بیان کمپنی کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دے گا۔“ سر آترک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارہ کو کسی بھی طریقے سے کمرے سے باہر بھجوا دیں۔ لیکن بات چونکہ دوسرے ممبران پر بھی کل پگلی تھی لہذا انہیں مجبوراً سارہ کو برداشت کرنا پڑا۔ انہوں نے پھر بھی حتیٰ لچھے میں کہا اور اس بار ان کے لچھے میں شدید سختی تھی۔

”نہیں نہیں سمجھتا مس سارہ کہ اس موقع پر کسی مزید بیان کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مسز حماد خود اپنا فائل بیان دے چکے ہیں۔ اور ہم نے فیصلہ بھی سن دیا ہے۔ بس اس فیصلے پر ہمارے دستخط ہونا باقی ہیں۔“

سارہ شایان کے لچھے میں چھپی دھمکی کو محسوس کر گئی۔ اُس نے بھی حتیٰ لچھے میں ہی کہا۔

”کوئی بھی فیصلہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انصاف کے تمام تقاضے نہ پورے کیے جا سکیں۔ میں اس واقعے کی مینی گواہ ہوں اور مجھے آج تک کمپنی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ مسز حماد نے میرا نام بطور گواہ کمپنی کو پیش کیا تھا۔۔۔؟ بہر حال میں یہ بیان دینے آئی ہوں کہ اس تمام واقعے میں مسز حماد کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جم نے ہی جھگڑا شروع کیا تھا اور میرے سامنے حماد کو یونیورسٹی سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ جواب میں حماد نے جم سے کچھ نہیں کہا۔“

سر آترک کا بس چلتا تو اسی وقت سارہ کو وہاں سے غائب کر دیا جیتے۔

سارہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کاغذ کی ایک لمبی سی فہرست لہرائی۔

”بیان چالیس طلبہ کی فہرست ہے جن کے سامنے یہ سارا واقعہ اس دن پیش آیا تھا۔ یہ سب بھی اس وقت میرے ساتھ ہی آئے ہیں اور آپ کے آفس کے باہر اپنا بیان ریکارڈ کر دینے کے جمع ہو چکے ہیں۔ اگر کمپنی اجازت دے تو ان سب کا بیان بھی ریکارڈ کیا جاسکتا ہے۔“

گویا سارہ پورا انتظام کر کے آئی تھی۔ سر آترک کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

”نہیں۔۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، ان بدلے ہوئے حالات میں کمپنی کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا ہوگی، جیوری ممبران کی کیا رائے ہے۔“ تمام جیوری کے ممبران نے یہ بات تسلیم کی کہ سارہ کے بیان کے بعد صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ لہذا نظر ثانی کے لیے انہیں تین دن کی مہلت دی جائے۔ سر آترک کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ مجھے جانے کی اجازت دے دی گئی اور جب میں ڈین کے کمرے سے باہر نکلا تو میری پوری کلاس اور یونیورسٹی کے اور بہت سے طلباء باہر میرے انتظار میں اکٹھے تھے۔ سارہ نے جب انہیں بتایا کہ میرے خلاف فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے تو سب سے پہلے جلائے اور نعرہ لگانے والی ریکارڈ تھی۔ پھر اس کے بعد تو وہ شور مچا کہ سر آترک کا



ہی۔ اے گھبرا کر باہر نکل آیا اور سب کی منت کرنے لگا کہ ہم یہاں سے دور چلے جائیں کیونکہ سر آئزک ناراض ہو رہے ہیں۔ ربیکا نے فوراً ہی پوری یونیورسٹی کو اسی وقت ایک بڑی ٹریٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ بقول اس کے، اس کے باپ کے آسٹریلیئن پاؤنڈ کس دن کام آئیں گے۔ سب لوگ ہنستے، شور مچاتے کیے ٹیڑی کی طرف چل پڑے لیکن سارہ خاموشی سے دوسری جانب پلٹ گئی۔ میری نظر اس پر تھ پڑی جب وہ مرکزی عمارت سے باہر جانے والی راہداری میں غور رہی تھی۔ میں فوراً اس کے پیچھے لپکا۔ تب تک وہ کافی آگے جا چکی تھی۔

”سارہ۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔ پلیز رکو۔“

وہ غصہ لگی، میں اس کے قریب پہنچا۔

”شکریہ۔“

”کس بات کا۔“

”میرا ساتھ دینے کا، آج گر تم وقت پر نہ آتیں تو کس میرے خلاف جارہا تھا۔“

”میں نے تمہارا نہیں بچ کا ساتھ دیا ہے۔ اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں۔“

”اس دنیا میں بچ کا ساتھ دینے والے کم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔“

سارہ ہلکے سے مسکرائی۔ ”تو پھر خدا کا شکریہ ادا کر دو کہ اس نے ان نایاب لوگوں میں سے ایک سے تمہاری ملاقات کر دی۔“

میں بھی اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

”ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن وہ شکریہ میں اس سے اکیلے میں کہہ دوں گا۔ فی الحال تمہارا شکریہ۔“ میں پلٹا اور واپس جانے لگا۔ سارہ نے کچھ سوچ کر مجھے آواز دی۔

سوچ کر مجھے آواز دی۔

”مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ تم نے انکوائری کے سامنے گواہی کے لیے میرا نام کیوں دیا۔ میں تو خود ان میں سے ایک تھی جو تم سے جھگڑا رہے تھے۔“

”پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔۔ مجھے تم ایک سچی لڑکی لگتی ہو، سوچا کہ ایک بار اپنا یہ مجرم بھی آزمائی لوں۔“

سارہ ہنسی، پہلی مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ ہنسنے سے اس کے گالوں میں دو خدے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

”واہ۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ کیا موقع ڈھونڈا ہے جناب نے اپنے مجرم آزمائے کا، میں اگر وقت پر نہ پہنچتی تو۔۔۔۔۔؟“

”میرا بچ پر سے یقین اٹھ جاتا۔“

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”کافی خطرناک لگتے ہو،“ ڈش بومیٹ آف ٹک۔Wish you best of luck

سارہ ہنستی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ یہ ہماری دوستی کا پہلا دن تھا۔ بعد میں ربیکا نے مجھے بتایا کہ سارہ کو انکوائری کیسٹی نے گواہی کے

یہ طلب ہی نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے خود اس کی ضرورت محسوس کی تھی کیونکہ جم بہر حال اس کا بہت بڑا انا اور سب سے اچھا دوست تھا، لیکن جب ربیکا نے سارہ کو یہ بتایا کہ خود میں نے انکو، بڑی کمپنی کے سامنے سارہ کا نام بطور گواہ دیا ہے تو وہ چند لمحوں کے لیے تو سن ہو کر رہی رہ گئی تھی۔ اُسے بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ میں اسی پر یہ سارا معاملہ ڈال دوں گا۔ ربیکا کو اب تک اس بات پر حیرت تھی کہ سارہ میرے حق میں گواہی دینے پر کیسے راضی ہو گئی۔ نہ صرف خود بلکہ اس نے آدمی یونیورسٹی کو بھی اس بات کے لیے راضی کر لیا تھا۔ ربیکا سے ہی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سارا کڑک سارہ سے اس بات پر اس قدر ناراض ہوئے کہ کئی دن انہوں نے اس سے بات ہی نہیں کی۔ جانے سارہ نے اس سارے معاملے کو کس طرح سے نبھایا ہوگا۔ واقعی وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔

تیسرے دن کمپنی نے مجھے اور جم دونوں کو ذہن کے کمرے میں بلایا اور بتایا کہ میرے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا لہذا مجھے بری کیا جا رہا ہے، جبکہ جم کو ایک سسٹر کے لیے یونیورسٹی چھوڑنی پڑے گی۔ اس کے بعد بھی یونیورسٹی انتظامیہ اُسے واپس لینے سے پہلے کمپنی نبھائے گی۔ جم کا چہرہ دلنگ گیا۔ میں نے ذہن سے کچھ کہنے کی درخواست کی۔ ذہن نے اجازت دے دی۔

”سر میری جم سے کوئی ذاتی جگہ نہیں ہے۔ اس دن میں شاید اس کی بات ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پایا جب کہ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ جم اور ڈیوڈ کا ایک سنجیدہ قسم کا مذاق تھا۔ لیکن رد عمل اس تیزی سے ہوا کہ ہم میں سے کسی کو بھی سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں جیوری سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی معمولی بات کے لیے جم کو یونیورسٹی سے خارج نہ کیا جائے۔ ہم دونوں کو اس مذاق کے لیے بھاری جرمانہ کر دیا جائے تو بھی ہم اسے انتظامیہ کی میزبانی سمجھیں گے۔“

جم حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ جیوری نے میرے ”جج“ کی تعریف کی اور ہم دونوں کو ایک سمجھہ کے بعد کلاس لینے کی اجازت دے دی گئی۔ جم کو کچھ کاغذوں پر دستخط کرنے کے لیے روک لیا گیا اور میں ذہن آفس سے نکل آیا۔

اگلے دن میں کلاس روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ نینسی میڈیم اکناکس کا لیکچر دے رہی تھیں کہ جم کلاس میں داخل ہوا۔ وہ ویسے بھی کلاس میں آنے جانے کے لیے کبھی اجازت لینے کا تکلف نہیں کرتا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف بڑھا اور میرے ذہن کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔ ساری کلاس کو سانپ سونگھ گیا۔ خود نینسی میڈیم کی آواز بھی طلق سے نہیں نکل پاری تھی۔ کچھ دیر وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر گھورتا رہا۔ کلاس پرست ٹاچا ہوا تھا۔ ربیکا نے میرا ہاتھ زور سے تھام رکھا تھا۔ پھر جم نے ہٹا، کچھ کہے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر پھیلا دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جم نے مجھے سمجھنے کے لیے گھلے لگالیا۔ ساری کلاس نے ذہن کے بجائے سر پر اٹھالیا۔ ربیکا نے جانے کہاں سے سیٹی مارنا سیکھ لی تھی۔ اُس کی سیٹیوں کلاس میں گونجتی رہیں۔ میری نظر سارہ پر پڑی وہ دُور بیٹھی مسکراتی تھی میرے دل نے کہا۔ ”محبت قاتل عام۔۔۔“

☆☆☆

## بے خودی

جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اُجالا بھیل چکا تھا۔ لیکن یہ جگہ تو میرے لیے کچھ غیر مانوس ہی تھی۔ میں کچھ دیر تک گم مسم سا لیٹا یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کہاں ہوں۔ رات کو تو خیر و مجھے تاتلے میں لاؤ کر اسٹیشن کے لیے ہی نکلا تھا۔ پھر یہ کٹھ دو سا کمرہ صاف ستھرا ستر، اُبلے، اُبلے سے پروے اور بڑے بڑے سے روشن دانوں اور کڑکیوں والا ٹین کی سیون ٹائپ چھت والا کمرہ کس کا تھا؟

کچھ فاصلے سے ٹرین کا بھونپو بجا اور ٹی ٹی کی سیٹی ستائی دی۔ مطلب یہ جگہ اسٹیشن کے قریب ہی تھی۔ پر یہ کس کا گھر ہے؟ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر اٹھاتے ہی مجھے ایسا جیسے میرے سر کی جگہ لوہے کا کوئی بھاری گولہ میرے کاندھوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہو۔ میں ایک کراہ کے ساتھ سر پکڑ کر دو پارہ ڈسے سا گیا۔ میری آواز سن کر باہر کچھ آہٹ ہوئی اور پھر صدیقی صاحب ہاتھ میں کچھ گولیاں اور جوس کا گلاس لیے ندر داخل ہوئے۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے مجھے کاندھے سے پکڑ کر دو پارہ لٹا دیا۔

”پینے رہو۔۔۔ ابھی تمہاری حالت پوری طرح سنبھلی نہیں ہے۔“

”لیکن سر میں۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔ کیسے؟“

”میں تم خود تو کبھی کچھ بتاتے نہیں ہو۔۔۔ جانے سار اور خود ہی سننے کی یہ کیا ضد ہے تمہاری۔ پر تمہارا بھی قصور نہیں ہے۔ شاید یہ میری ایسی ہوتی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر دو گولیاں میرے منہ میں ڈال کر زبردستی آدھا گلاس پانی میرے مٹک سے نیچے اتار دیا۔ مجھے انہیں یوں اپنی خدمت کرتے دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ میں نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔

”سر میں اب ٹھیک ہوں۔ پر میں یہاں آیا کیسے؟“

انہوں نے تکیہ میری پشت پر سیدھا کر کے مجھے بیٹھنے میں مدد دی۔

”خیر تمہیں شدید بخار اور ہڈیاں کی کیفیت میں تین دن پہلے رات کو یہاں اپنے تاتلے پر ڈالے آیا تھا۔“

میں اُچھل ہی تو پڑا۔

”تین دن پہلے۔۔۔۔۔ لیکن میں تو کل رات۔۔۔“

”ہاں میاں۔۔۔ تم تین دن تک تقریباً بے سدھ ہی بخار میں پڑے سڑتے رہے ہو۔ میں نے سوچا ریوے کے ہسپتال سے بہتر ہے کہ یہیں گھر پر ہی تمہاری نگہداشت کی جائے۔ ڈاکٹر روزانہ تین وقت آتا رہا ہے۔ شکر ہے کہ آج صبح سے بخار کچھ ٹوٹا ہے۔ لیکن ابھی تم کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔ لہذا کسی بھی قسم کی ضد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ٹھیک نہ ہو جاؤ یہاں سے ہٹنے کی کوشش نہ کرنا۔“

یا خدا۔۔۔ میں تین دن سے اس بیماری کی حالت میں یہاں اس شریف انسان پر بوجھ بنا رہا۔ مجھے اپنی کیفیت پر غصہ آ گیا۔ میں نے انہیں اتنی تکلیف پہنچائی وہی دیکھی۔ اب مزید نہیں۔

"سر آپ یقین کریں میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ پہلے ہی تین دن آپ اور آپ کے گھر والوں پر بوجھ بنا رہا ہوں، مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔"

"میاں پہلے تو یہ بوجھ والی بات واپس لے لو۔ دوسری بات یہ کہ میں اس گھر میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ بیوی سے مزاج مل نہیں پایا لہذا دو سال میں دس مہینے میکے میں ہی گزارتی ہیں۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ بس میں ہوں اور گھر کے دو چار نوکر ہیں۔ خوب مزے میں کٹ رہی ہے۔"

وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"وہیے بھی دی بناشادی کے تیار ہے تو اتنا مزہ نہیں آتا جتنا شادی کے بعد بیوی کے میکے جا کر رہنے کی صورت میں تنہائی میسر آنے کے بعد آتا ہے۔ یقین نہ آئے میری بات پر تو شادی کے بعد بیوی کو میکے بھیج کر کبھی تیار ہو کر دیکھا۔"

میں بھی مسکرایا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہے سر۔۔۔ لیکن میں اس طرح یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں میں آپ کی تنہائی میں قفل ہوتا رہا ہوں۔"

"ارے یا تنہائی تو اپنی جہنم جہنم کی ساتھی ہے، وہ بھی میرے ساتھ رہتے رہتے کبھی کبھی آکٹائی جاتی ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

"میری لاکھ ضد کے باوجود صدیقی صاحب نے مجھے اس گھر سے تو کیا اس کمرے سے بھی باہر نہیں نکلنے دیا۔ اب ہتھ شام کو جب نوکر نے برآمدے میں چائے لگ جانے کی اطلاع دی تب وہ مجھے لیے برآمدے میں آ گئے۔

کوئٹہ میں ریوے اسٹیشن کے سامنے سے ہوتی ہوئی ایک ذیلی سڑک آگے جا کر بائیں ہاتھ کو ایک مرکزی سڑک سے مل جاتی ہے۔ اسی سڑک سے ٹی ہوئی ہے یہ ٹھنڈی سڑک جسے عرف عام میں کالون روڈ کہتے ہیں۔ اسی ٹھنڈی سڑک پر ریوے کے بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ صدیقی صاحب کا چھوٹا سا بنگلہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ریوے کی مخصوص برٹش دور کی طرز تعمیر والے سرخ ٹین کی چھت والے یہ بنگلے خاص طور پر کوئٹہ کے موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی راج میں تعمیر کیے گئے تھے۔ کمروں کے باہر برآمدہ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر مخصوص لکڑی کے سبز رنگ کیے ہوئے ستون، برآمدے کو تھامے ہوئے تھے اور برآمدے کے سامنے کشادہ سا باغیچہ جس میں اتار، انگور، سیب اور ناشپاتی کے درخت اور بے تحاش پھول لگے ہوئے تھے۔ صدیقی صاحب کافی اعلیٰ ذوق معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔

"اپنی بے ہوشی کے ہذیان میں تم بہت کچھ بولتے رہے ہو۔ لیکن اس میں سے زیادہ تر باتیں تم اردو میں نہیں بلکہ انگلش میں کر رہے تھے۔ شاید تم اپنے گھر میں زیادہ اردو نہیں بولتے تھے؟"

جس بات کا مجھے ڈرتا، صدیقی صاحب نے وہی بات آخر پوچھ لی۔ میں پہلے ہی یہ سن کر چونک گیا تھا کہ میں تین دن بے ہوشی کے عالم میں یہاں گزار رہا ہوں جانے اپنے ہذیان میں کیا کیا بک گیا تھا میں۔۔۔۔۔؟

میں چہرے لمحے چپ رہا، صدیقی صاحب نے بات جاری رکھی۔



ریلوے اسٹیشن کے پیٹ فارم پر میرے پہنچنے ہی سب کو خبر ہو گئی اور وہ سب میرے آس پاس یوں جمع ہوتے گئے جیسے شہد کے چھنے پر

کھیاں۔۔۔۔

سب ہی کو فردا فرما دیتے تھے کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ان میں سے کئی تو مجھ سے یوں پر تپاک انداز میں گلے ملتے رہے جیسے میں کسی محاذ جنگ سے واپس لوٹا ہوں۔ پھر مجبوراً غصے کو مدخلت کرنا پڑی اور اُس نے اپنی گرج دار آواز میں سب کو حکم دیا کہ بابو صاحب کی طبیعت ابھی مشکل سے سنبھل رہی ہے۔ اگر سب میرے گرد یونہی جمع رہے تو مجھے آرام کا موقع نہیں ملے گا لہذا انی الحاح سب مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ غصے کا حکم ٹاننا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، لہذا بھیڑ رفتہ رفتہ چھٹ ہی گئی۔ غصے نے میرا ہاتھ بکڑ کر مجھے شیخ پر بندھ دیا اور خود میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

”میں جانتا تھا باؤ۔۔۔۔ تم زیادہ دن صدیقی صاحب کے گھر نہیں لگو گے۔ اور سیدھے یہیں واپس آؤ گے۔ تم اس گھر کا آرام اور سکھ زیادہ دن برداشت نہیں کر پاؤ گے، قصص اب بے آرائی اور بے سکونی میں ہی سکھتا ہے۔“

دو شاہ میرے صدیقی صاحب کے گھر سے واپس چلے آئے پر غصہ تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”ناراض ہو؟“

”جائے دے باؤ۔۔۔ اپنی ناراضی کس کام کی۔ ٹو نے غصے کو کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں، ورنہ اس مولوی واں بات کو مجھ سے نہ چھپاتا۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں باؤ۔۔۔ خیر دتا گلے والے نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس دن جب تم بخیر میں اس مسجد میں اندر گئے اور پھر بہت دیر تک باہر نہیں نکلے تو خیر وغیرہ گھبرا کر تمہارے پیچھے اندر مسجد میں گھس گیا تھا کہ کہیں تمہاری طبیعت زیادہ خوب نہ ہو گئی ہو۔ پر اندر جانے سے پہلے ہی اس نے تمہاری اور مولوی صاحب کی باتیں سن لی تھیں۔ پر خیر دہی یاروں کا یہ ہے۔ اس نے یہ باتیں در کسی کو نہیں بتائی ہیں۔ وہ قصص صدیقی صاحب کے گھر چھوڑ کر سید حامد میرے پاس آیا تھا۔ شاید وہ مجھے کبھی کبھار بتاتا۔ پردہ تیری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا کہ خدا غور سے کہیں تجھے کچھ ہوئی نہ جائے۔ اگر ایک آدھ دن مزید تیری حالت نہ سدھرتی تو ہم سیدھے تیرے گھر چلے جاتے بتانے کے لیے۔“

میں پھر حیرت سے چوٹکا۔

”میرے گھر۔۔۔؟“

”ہاں باؤ۔۔۔۔ خیر و نزن لیا تھا جو بھی اس مولوی نے کہا تھا۔ ٹو لاٹ صاحب کا بیٹا ہے، ہمیں سب پتہ چل گیا ہے۔“

شاید غصہ اور کشر صاحب کو ہی لاٹ صاحب کہہ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اس دن مجھ سے کہا تھا کہ تم جہاں بھی جاؤ گے کشر کے بیٹے ہی کہل ڈگے۔ مطلب میرا ہر راز کھل چکا تھا۔ شاید اب یہاں سے بھی میری رخصت کا وقت ہو ہی چلا تھا۔ آج نہیں تو کل یہ سب لوگ میری اصیت جان جائیں گے۔ مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ غصہ وغیرہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے۔

”لیکن خبر دو جو تو نے اب یہاں سے کہیں اور جانے کا سوچا بھی تو۔ قسم مولائی، میں تجھے رسیوں سے باندھ دوں گا، ورنہ سب کو بتا دوں گا۔“



کہ یہ کون سا شہزادہ اتنے دن سے ہمارے بچ رہ رہا ہے۔“

مجھے غفورے کی بات پر ہنسی آگئی۔ اس نے فوراً میرے ہاتھ پکڑ لیے اور وہاں سنا سنا ہو کر بولا۔

”دیکھ باؤ۔۔۔۔۔ تجھے میری دوستی کا واسطہ۔۔۔۔۔ اب یہاں سے کہیں نہ جانا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری کوئی بھی بات باہر نہیں نکلے گی۔

پڑو اگر یہاں سے چلا گیا تو غفور از زندگی بھرا اپنا چہرہ نہیں دیکھ پائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ میں روزانہ کی طرح اپنا سارا کام خود ہی کروں گا۔ تم مجھ

سے دوستی میں یا میرے گھر کی حیثیت کی وجہ سے کوئی خاص سلوک نہیں کرو گے۔ ورنہ میں ایک دن بھی یہاں نہیں رکوں گا۔“ غفورے نے خوشی سے

میرے ہاتھ چوم لیے۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی کی لہر دوڑ گئی۔

”ٹو واقعی اس دنیا کا نہیں ہے۔ پر تیری محبت کی قدر یہاں کون جانے گا۔۔۔۔۔“ تو بولے تو میں خود جا کر اس موسوی کے چہروں میں گر

جاؤں گا۔ ساری زندگی اس کی غذائی کروں گا۔ بس تو ایک بار حکم کرو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ معتمد حکم کا نہیں ہے۔ عرض کا ہے۔۔۔۔۔ میں نے بھی اپنی عرضی ڈالی ہوئی ہے۔ اب سوئے انتظار رکے اور کوئی چارہ

نہیں ہے۔“

غفورے کی آنکھوں میں میرے لیے ایک خاص سی عقیدت درآئی تھی۔ وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ

دیر کے بے خبر دوتا گئے والا بھی آیا اور بہت دیر تک مجھ سے گلے ل کر اس نے مجھے جکڑ رکھا۔ یہ غریب لوگ بھی جذباتی کے معاملے میں کتنے امیر

ہوتے ہیں۔ جس کسی کو ایک ہار دل میں بٹھالیں تو پھر اس پر اپنا سب کچھ بچھ کر دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ بس شرط صرف اتنی سی ہے

کہ کوئی ان کے دل کو چھو بیٹنے والا ہونا چاہیے۔ خیر اور غفورے دونوں نے میرے دل کی آرزو کی کٹھن خاطر رکھتے ہوئے دوبارہ مجھ سے موسوی

صاحب یا میرے گھر والوں کی کوئی بات نہیں کی۔ بس ادھر ادھر کی بات کرتے رہے۔ وہ دونوں ایک معاملے میں ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔ دونوں

کا پسندیدہ فلم اداکار دیپ کمار تھے اور دونوں ہی ہر وقت خود کو دیپ کمار کا حقیقی پرستار ثابت کرنے کی بھرپور کوشش میں لگے رہتے تھے۔

خیر دہر وقت کسی ایک فلم کا حوالہ دیتا تھا جس میں دیپ صاحب نے ناٹکے بان کا کردار ادا کیا تھا اور خیر دہر دیتا تھا کہ جس دن سے اس نے

وہ بلیک اینڈ وائٹ فلم دیکھی ہے تب سے وہ دیپ کمار کی طرح ہی ناٹک چلاتا ہے۔

وہاں غفورے کو ایک ایسی فلم یاد تھی جس میں اس کے پسندیدہ ہیرو نے مزدور لیڈر کا رول بالکل اسی طرح ادا کیا تھا جس طرح غفور خود

اصل زندگی میں تھا۔ عام طور پر جب یہ دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو میں جان بوجھ کر دیپ کمار صاحب کی کوئی بات چھیڑ دیتا تھا جس کے بعد گھنٹوں ان

دونوں کی بحث جاری رہتی اور یہ بحث آخر کار دونوں کے اس دن کے جھگڑے کی صورت میں ختم ہوتی۔ اس دن بھی خیر دہر غصے میں روٹھ کر چلا گیا کیونکہ

غفورے نے اس سے کہہ دیا تھا کہ دیپ کمار جیسے بڑے اداکار کو ناٹکے بان جیسا معمولی کردار ادا ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ہم دونوں خیر دہر کے اس جذباتی پن میں اٹھ کر چلے جانے پر بہت دیر تک ہنستے رہے۔ پھر چانک جیسے غفورے کو کچھ یاد آ گیا اور اس نے

اپنے ہی سر پر زور سے ایک چپت ماری۔

”وہمت تیرے کی غمورے۔۔۔۔۔ بھر بھول گیا۔۔۔۔۔“

میں نے حیرت سے غمورے کی جانب دیکھا۔

”کیا ہوا، کچھ بھول گئے ہو کیا۔“

”ہاؤ تیرے آنے کی خوشی میں دیکھ ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ تیرے تیار پڑنے کے بعد پچھلے ہفتے میں ایک داڑھی والے جوان ساڑھ کادو بار

تیرا پوچھتے ہوئے اسٹیشن آیا تھا۔۔۔۔۔ بھلا سا نام بتایا تھا اُس نے۔۔۔۔۔“

غمور ماتھے پر ہاتھ رکھے نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دل اُٹھل کر مطلق میں آ گیا۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک سی گئی اور میں

نے سرسراہٹ سی آواز میں نام دہرایا۔

”عبداللہ“

غمورے نے خوشی میں زور سے تالی ماری۔

”ہاں۔۔۔۔۔ عبداللہ۔۔۔۔۔ یہی نام بولا تھا اُس نے۔۔۔۔۔ بڑا پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے تیری ہماری کے بارے میں اسے بتا دیا

تھا۔ کل پھر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تجھے یہ پیغام دے دوں کہ ٹھیک ہوتے ہی شا کر صاحب سے مل لینا۔۔۔۔۔ شاید کوئی ضروری کام ہو؟

میرے ذہن میں جیسے دھمکے سے ہونے لگے تھے۔ عبداللہ یہاں کیوں آیا تھا؟ اس نے مجھے شک کر سے ملنے کا کیوں کہا ہے؟۔۔۔۔۔

کہیں مولوی صاحب کی طبیعت۔۔۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ لیکن عبداللہ تو خود یہاں نہیں تھا۔ وہ تو ایمان اور ان کے گھروالوں کو

لے کر چھ گیا ہوا تھا۔ اور جس دن میں مولوی صاحب سے آخری مرتبہ مسجد میں ملا تھا تب تک وہ واپس نہیں آیا تھا۔ میرا دل جانے کیوں ڈوبنے لگا

تھا۔ مغرب کی ڈان کا وقت تھا۔ میں نے خیر و کفر اپنی ہم بھجوا یا کہ تانگہ تیار رکھے۔ ہم ابھی کہیں کے بے نکل رہے ہیں۔ غمورے نے مجھے لاکھ منع کیا

کہ بھی دیر ہو گئی ہے اور میری حالت بھی پوری طرح سنسنیلی ہے۔ میں کل شک کر سے ملنے چلا جاؤں لیکن اب میرے دل کو ایک ہل بھی قرار نہیں

تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پلک جھپکنے سے پہلے حویلی پہنچ جاؤں۔

خیر و جس رفتار سے تانگہ بھاگا سکتا تھا، بھاگا رہا تھا۔ میں نے اسے جلد از جلد نہانی حویلی پہنچنے کا کہا تھا۔ شہر کی مرکزی سڑکوں پر کچھ خاص دُش نہیں

تھا، جدیدی ہم شہر کے مصفاہات میں حویلی کو جاتی ہوئی لمبی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ میں اپنے ہی دوسروں اور خیالات میں ڈوبا ہوا تھا خدا خیر ہی کرے۔۔۔۔۔

میں اس وقت چٹنگا جب خیر و نے حویلی کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر زور سے گھوڑے کی لگا میں کھینچیں، میں نے خیر و کو وہیں رکنے کے لیے کہا۔

تکھت حویلی کے دالان میں ہی مکی خوابندوں کو جو شاید دھوپ میں سو کھنے کے لیے ڈالی گئی تھیں، حویلی کے نوکروں سے جمع کر دیا، تھی،

مجھے دیکھتے ہی وہ سب چھوڑ چھوڑ کر بھاگتی ہوئی تیزی سے میری طرف آئی۔ کچھ دیر تو اسے اپنا سانس سنبھالنے میں ہی لگ گئی۔ وہ میرے چہرے اور

ہاتھوں کو بے تابی سے ٹٹولتی رہی۔

"کیا ہو گیا تھا آپ کو بھیا۔۔۔ بیمار کیسے ہو گئے تھے۔۔۔ کتنے کمزور لگ رہے ہیں۔۔۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے۔"

مجھے اس کے سوال کی بوجھاڑ سے بچنے کے لیے اپنی بیماری کے بارے میں مختصر اٹھانا پڑا پھر میں نے جھوٹے ہی اس سے شاکر کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ ہمیں نے گھبت کو عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی بتایا۔

گھبت نے شاکر کے بارے میں تو یہ بتایا کہ وہ ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آیا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ وہ عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی جانتی ہے لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر پارہی۔۔۔

مجبوراً مجھے اس کو اپنی قسم دینی پڑی۔ گھبت شاید پہلے ہی بہت دیر سے ضبط کر رہی تھی۔ میرے یوں اصرار کرنے پر اس کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میرا دل تو پہلے ہی ہول کھائے جا رہا تھا۔ گھبت کی یہ حالت دیکھ کر تو جیسے ہی میں بالکل ہی بوکھلا گیا۔

"خدا کے لیے گئی۔۔۔ کچھ تو تباؤ۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ مولوی صاحب کے گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔۔۔ ایمان تو ٹھیک ہے نا؟۔۔۔"

گھبت نے عجیب ڈھنگی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کوئی پانی پلانے والا حسرت سے کسی دم توڑتے سپاہی کو میدان جنگ میں آخری گھونٹ سے پیسے ہی اس کی سانس رکتے ہوئے دیکھتا ہے۔

"مولوی صاحب نے ایمان کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اگلے ماہ کی چند رو کو اس کی رخصتی ہے۔"

چند لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری سنہ، سمجھنے، دیکھنے اور بولنے کی تمام حسیات چھین لی گئی ہوں۔ مجھے اپنے آس پاس صرف ک خدا محسوس ہوا۔ یہ کوئی اتنی غیر متوقع بات بھی نہیں تھی۔ اس دن میری مولوی صاحب سے جو آخری گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد حفظہً بالقدم کے طور پر انہیں کچھ ایسا ہی قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ وہ پہلے ہی مجھ پر واضح کر چکے تھے کہ وہ کسی صورت میرا ایمان کے لیے رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی بدنامی اور زمانے کی باتوں کا خوف بھی ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا۔ میری دیوانگی اور وحشت بھری حاست کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شریف باپ کو وہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ خبر میرے لیے کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ گھبت کو میری اندرونی حالت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے وہ بہت دیر تک میرے لرزے ہاتھ پکڑے وہیں کھڑی رہی۔

انسانی اعصاب کا کھیں بھی عجیب ہے۔ شاید ایک انسان کے اندر بیک وقت یہی ایک چیز ہوتی ہے جو سب سے کمزور اور سب سے زیادہ مضبوط ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم سب کو ایک دن مر جانا ہے۔ پھر بھی کسی آپے کی موت کی خبر سن کر کچھ دیر کے لیے تو ہمارے اعصاب سن سے ہوجاتے ہیں۔ شاید ہم جانتے ہوئے بھی ہر لمحہ خود کو اس انہونی کے نہ ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ ایمان کے کہیں رشتہ طے ہوجانے کی بات بھی میرے لیے اور میرے اعصاب کے لیے بھی کچھ ایسی ہی خبر تھی۔ دراصل کچھ باتوں کی سنگینی کا ہمیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب وہ سرزد ہوجاتی ہیں۔ میرے لیے یہ احساس ہی روح نچوڑ دینے والا تھا کہ وہ نازنین کسی در کی ہونے والی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ہم دونوں میں تو آج تک کبھی کھل کر بات بھی نہ ہونے پائی تھی، تب میرا یہ حال تھا اگر کہیں اس کی طرف سے بھی قول و اقرار ہو چکا ہوتا تو شاید میرا دل وہیں پھٹ جاتا۔

بہت دیر تک نہیں اور گھٹ خاموش کھڑے رہے۔ حویلی کے بلند و بالا درختوں کے پرندے بھی ڈھنکی شام کے ساتھ گھر واپسی پر شور مچاتے مچاتے چپ ہو گئے تھے۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ پھر میں نے بہت بچھ کی اور نوٹے ہوئے لہجے میں گھٹ سے پوچھا۔

”کون ہے وہ۔۔۔۔۔ کس کے ساتھ ایمان کا رشتہ طے ہوا ہے۔“

”اس کے چچا زاد۔۔۔۔۔ عبد اللہ کے ساتھ۔“

”عبد اللہ۔۔۔۔۔ ایک۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“

لفظ میرے منہ میں ہی ٹوٹ گئے۔ یہ دوسرا پہاڑ تھا جو انہی چند لمحوں میں میرے سر پر ٹوٹا تھا۔ عبد اللہ تو میری دیوانگی کا خود شہ تھا۔ پھر عبد اللہ۔۔۔۔۔ لیکن کیسے۔۔۔۔۔ میرے ذہن میں خیالات گزرتے ہوئے لگ گئے تھے۔ گھٹ نے بتایا کہ مجھ میں مولوی صاحب کی جو بڑی بہن رہتی تھیں وہ عبد اللہ کی بہن بھی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی منہ بولی ماں بھی تھیں۔ مولوی صاحب نے مجھ جاتے ہوئے ان کے نام خط اپنے گھر والوں کے ہاتھ ہی بھیج دیا تھا۔ واپسی پر وہ بھی ایمان لوگوں کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ مولوی صاحب نے ان کے سامنے ایمان کے رشتے کی بات رکھی تو انہوں نے سب سے پہلے عبد اللہ کا نام ہی تجویز کر دیا بلکہ بڑی بہن ہونے کے ناطے انہوں نے مولوی صاحب سے بطور حق ایمان کا رشتہ، لگا شدہ مولوی صاحب کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں اندر یہی خواہش پل رہی تھی، جمی انہوں نے رات بھر سوچنے کے بعد ہاں کر دی۔ لیکن عبد اللہ۔۔۔۔۔ عبد اللہ سے کیا کسی نے اس کی رائے نہیں پوچھی۔۔۔۔۔ اس نے کیوں ہاں کر دی۔۔۔۔۔ لیکن وہ کیوں ہاں نہ کرتا۔۔۔۔۔ اس نے ایمان کے لیے میری دیوانگی ہی تو دیکھی تھی۔۔۔۔۔ اس پر وہ نشین نے تو مجھ پر کھل کر آج تک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان کا اس قلم قصبے میں کوئی قصور نہیں تھا۔۔۔۔۔ میرا ذہن خود ہی سوال کر رہا تھا اور پھر خود ہی ان کے جواب بھی تلاش کر لیتا تھا۔ بہت دیر تک میں وہیں بیٹھا اپنی قسمت کو رد کرتا رہا۔۔۔۔۔

نہ جانے شکر کو اس دن تنی دیر کیوں ہو گئی تھی۔ مجھے باہر تانگے میں بیٹھنے خیر و کامیابی خیال تھا۔ رات ڈھنکی جاری تھی اس بے گھٹ کے بے حد اصرار کے باوجود میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا، چلتے چلتے گھٹ نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ انسان ہزار دشمنوں سے لڑ سکتا ہے لیکن جب اس کی تقدیر ہی اس کی دشمن بن جائے تو پھر اس سے مقابلہ کون کرے۔ میری تقدیر کا وار بھی جانے کب سے میرے درپے تھا۔ اس جیسے اور نہ جانے کتنے حادثے ابھی میرے تقب میں تھے۔ میں گھٹ کو جھوٹی تسلی دے کر گھر سے نکل آیا۔ خیر نے مجھے دیکھتے ہی تانگے کو اڑا دیا اور ہم دوبارہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے خیر کی سب سے اچھی عادت یہی لگی تھی کہ وہ از خود کبھی سوال کر کے دوسروں کی تنہائی میں غل نہیں ہوتا تھا۔ چپ رہ کر اس بات کو کھٹنے کا انتظار کرتا تھا۔ خاموشی بھی تو بہت بڑا صبر ہوتی ہے۔ اور خیر اس معاملے میں بہت صابر تھا۔

مجھے اسٹیشن کے دروازے پر اتار کر وہ اپنا تانگہ اسٹینڈ میں کھڑا کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ میں لٹا پٹا سا چلتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہوا۔ اسٹیشن ویران سا پڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی راتیں آنکھوں آنکھوں میں کائی تھیں۔ لیکن اس رات کی تنہائی اور اس رات کے درد کا بیان ہی کچھ مختلف کچھ سوا تھا۔

میں میں دوبارہ شا کر کی جانب جانے کا سوچا ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں غورے کی آواز آئی۔  
 ”وہ رہے حماد پاؤ۔۔۔۔۔“

میں اس وقت صبح کی گاڑی میں سے مل اتروانے کی تیاری میں تھا۔ اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بنے گاڑی کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی۔ وہ عبداللہ تھا۔۔۔ جو میری جانب بڑھ رہا تھا۔ جانے کیوں میں عبداللہ سے نظریں نہیں ہٹا پایا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے میں اس نوجوان کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ تو یہ تھا وہ خوش نصیب جس کے نام میری ایمان کا قرعہ نکلا تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔۔۔ میں تو اسے اپنا رقیب بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ میرا رقیب ہی تو تھا۔ عبداللہ کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی اپنے اپنے لفظ بھول گئے تھے شاید، پھر مجھے ہی رسم ادا کرنی پڑی۔

”کیسے ہو۔۔۔۔۔؟ گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔۔۔۔۔؟ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔“ جی۔۔۔۔۔ سب خیریت ہے۔۔۔۔۔

میں۔۔۔۔۔ میں آپ سے یہاں سحانی مانگنے آیا ہوں۔“

”میں اس قابل نہیں ہوں۔۔۔۔۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔“

”میں پہلے صبح شا کر صاحب کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ رات آپ وہاں آئے تھے۔۔۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ آپ کی تلاش میں یہاں آ چکا ہوں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے غم نہ لگتا، نہ رشتہ مبارک ہو۔“

شاید شدید کوشش کے باوجود بھی میں اپنے لہجے کی سختی نہیں چھوڑ سکا۔ عبداللہ نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں اک عجیب سی شکایت تھی۔ مجھے اپنے الفاظ کے چناؤ پر شرمندگی ہونے لگی۔

”آپ کو حق ہے۔۔۔۔۔ جو چاہے کہہ لیں۔۔۔۔۔ شاید میں آپ کو کبھی اپنا مینڈ چیر کر اپنے دل کی حاست نہ دکھا پاؤں۔“

”میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ شاید کبھی کبھی لفظ اپنے معنی خود ہی طے کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا ان کو دا کرنے کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو دوسرے کے کانوں تک پہنچتا ہے۔“

عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”یہ بھی آپ ہی کا طرف ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی آپ ہی معذرت کر رہے ہیں۔ میں بچپن سے مولوی صاحب کے اس قدر احسانوں تلے دبا ہوا ہوں کہ اگر میں ان کا شمار بھی کرنا چاہوں تو کم از کم اس زندگی میں نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھے بچی بن کر نہیں۔۔۔ بلکہ باپ سے بھی بڑھ کر پالا ہے۔۔۔۔۔ خود تکلیفیں اٹھائیں لیکن مجھ پر کبھی کوئی سخت وقت نہیں آنے دیا۔ ان کے اپنے ہاتھ چھل گئے پر انہوں نے کبھی میرے پیروں میں کوئی چھال نہیں بننے دیا۔“

”تو کیا تمہارے اقرار کی وجہ بھی صرف ان کے احسانوں کا بوجھ ہی تھا۔“ عبداللہ نے پھر اسی کرچی کرچی نظر سے میری طرف دیکھا۔  
 ”اس وقت ان کی حاست ایسی ہے کہ ذرا سی ٹھیس بھی انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ سکتی ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔ یہ سچ ہے کہ جب انہوں نے

پچھو اور تمام گھر والوں سے چھپ کر اکیلے کمرے میں میرے سامنے اپنے سر کی دستار ڈال دی تھی تو میں نے اپنی زبان کو بالکل ٹنک پایا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں آپ کی ایمان کے لیے دیوانگی سے واقف ہوں۔۔۔ شاید اسی لیے انہیں اپنی عزت کو یوں میرے سامنے گروی رکھنا پڑا۔ حالانکہ ان کی ہمیشہ سے یہی مرضی تھی شاید۔۔۔ لیکن آپ کے درمیان میں آ جانے سے وہ بہت ڈر گئے تھے۔۔۔ وہ اس بات سے بھی بے حد خوفزدہ تھے کہ ایمان کے کسی دوسرے گھر میں رشتے کے بعد کہیں کسی مقام پر آپ اپنی دیوانگی کے ہاتھوں اگر اس کے سسرال والوں کے سامنے آ گئے یا اگر بات ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے کھل گئی تو ان کی عزیزار جان بیٹی کی زندگی ہل میں برباد ہو جائے گی۔۔۔

آپ کیا کرتے؟

عبداللہ میرے سامنے سرتاپا سوال بنا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں بھی وہی کرتا۔۔۔ جو تم نے اس وقت کیا۔"

عبداللہ کے اکثرے ہوئے بدن میں جنبش سی ہوئی اور اس کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

"میں نے کہا تھا نا۔۔۔ یہ صرف آپ کے طرف کا ہی حوصلہ ہو سکتا ہے۔ ایک اور بیچ کا، قرر کرنا چاہتا ہوں آج آپ کے سامنے۔۔۔ میں بچپن ہی سے جانتا تھا کہ میری شادی ایمان کے ساتھ ہی ہوگی۔ بچا کی نظر میں ہمیشہ سے میرے بے وہ خاص پسند موجود رہی ہے جو کسی بھی باپ کی آنکھ میں پنے ہونے والے فرزند کے لیے ہو سکتی ہے۔ جب لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھ تو میری پہلی نظر بھی ایمان کی طرف ہی اٹھی تھی۔ اور اس پہلی نظر سے لے کر آج تک میں ایمان سے شدید محبت کرتا ہوں۔ محبت کی شدت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے خود کبھی محبت کی ہو۔ لیکن آج تک کبھی اس محبت کے اظہار کی نوبت نہیں آئی۔ پہلے اظہار کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ ایمان تو ہمیشہ سے ہی میرے نام لکھی جا چکی تھی۔ سوچا کہ شادی کے بعد پہلی رات اسے اپنی زندگی بھر کی کہانی سناؤں گا۔۔۔ اُسے ایک ایک بات یاد دل کر بتاؤں گا کہ تب میرے اس کی کتاب میں مور کے پر رکھ دینے کا کیا مقصد ہوتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے جان بوجھ کر اس سے پانی کیوں مانگتا تھا۔ اپنے استری شدہ کپڑے پھر سے اُسے استری کرنے کے لیے کیوں دے دیتا تھا۔ شدید سردیوں کی رات میں بچا سے ٹھپ کر اس کے لیے اچھی ڈور سے پان کیوں لاتا تھا۔"

عبداللہ جانے کیا کیا بولے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھینکتی جا رہی تھیں اور میرے دماغ میں جیسے آندھیلوں کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اچھا۔۔۔ تو ایک مرتبہ پھر محبت ہی تھی جو اس نوجوان کو ہمیشہ بھیڑ میں بھی سب سے الگ دکھاتی تھی۔ عبداللہ کی بات جاری تھی۔

"لیکن پھر آپ آ گئے، میں جانتا ہوں کہ ایمان نے آج تک پلٹ کر آپ کو کوئی جواب نہیں دیا ہوگا۔ کوئی اُمید نہیں درائی ہوگی کیونکہ میں اس لڑکی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ شرم و حیا اور رواداری کی جس مٹی سے گوندھ کر خدائے اُسے بنایا ہے۔ اس میں شاید ایسی محبت کی میزبانی نہیں رکھی گئی۔ اس کی زندگی کا مقصد مولوی صاحب کی خوشی ہے اور وہ اس خوشی کے لیے ان کے ہونٹوں پر ایک ہل کی مسکراہٹ لانے کے لیے اپنی زندگی تو کیا۔۔۔ اپنا ایمان تک تیاگ سکتی ہے۔۔۔۔۔"

لیکن جانے کیوں۔۔۔ آپ مجھے باقی سب سے مختلف لگے۔ مجھے دیر دیر سے ایسا لگنے لگا کہ آپ مولوی صاحب کے دل میں گھر



کری لیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سوچ سوچ کر ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں بچا آپ کے سامنے ٹوٹ ہی نہ جائیں۔۔۔۔ میری خود غرض سوچیں تھا ہی میں مجھے رلاتی تھیں کہ اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو کیا ہوگا۔ آپ کی محبت کی طاقت سے میں بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ آپ کی محبت ایک ایسا طوفان ہے جو سب کچھ بہا کر لے جاسکتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود میں کبھی آپ کے خلاف کچھ نہیں سوچ سکا، کبھی آپ سے دل میں بھی نفرت نہیں کر سکا۔ شاید یہ بھی آپ کی محبت کا ہی کمال ہوگا۔“

لیکن پھر جس دن میں نے آپ کو اس اسٹیشن پر ریلوے قطعی کے روپ میں دیکھا اس دن میرا دل بھی آپ کے سامنے بارمان گیا۔ آپ سے جیتنا مجھ جیسے کمزور شخص کے بس کی بات ہی نہیں۔ میری محبت نے اسی دن آپ کی محبت کی عظمت کو سجدہ کر دیا تھا۔۔۔۔ افسوس۔۔۔۔ بچا اس محبت کو نہیں سمجھ پائے۔۔۔۔ وہ ایک ڈرے ہوئے مجبور باپ ہیں۔ اور ان کی تربیت اور ماحول میں ایسی کسی محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ میں یہاں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میرے گھر والوں نے آپ کی، آپ کی عظیم محبت کی قدر نہیں کی۔۔۔۔ آپ ہم سب کو معاف کر دیں۔۔۔۔ معاف کر دیں۔“

عبداللہ کی آواز انکپیوں میں ڈوب گئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ جوان رعنا آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ہے، اپنے ہاتھ معافی کے اندر زمیں جوڑے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور ایک جھٹکے سے کھینچ کر اُسے اپنے گلے لگایا۔ پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔ ہم دونوں کے پاس مزید کچھ کہنے کو تھا بھی نہیں۔ بس یہ آنسوؤں کی بولی ہی تھی جو ہم دونوں کو یک دوسرے کی بات سمجھ سکتی تھی۔ کتنا عجیب منظر تھا، دنیا نے آج تک رقبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرتے، لڑتے اور ایک دوسرے کی جاں لیتے ہوئے تو دیکھ ہوگا یہ کیسے دور قریب تھے جو ایک دوسرے کے گلے لگ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک سب کچھ پا کر رو رہا تھا تو دوسرا سب کچھ ناکر اس کے بعد عبداللہ زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکا۔ مجھ سے علیحدہ ہو کر اس نے لودھ بھر کے لیے میرے ہاتھ پکڑے، انہیں اپنی ہانگی آنکھوں سے لگایا اور پٹت کر وہاں سے چل دیا۔ میں وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ دنیا میں اتنے ہمت والے لوگ میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ وہ آیا، اس نے کس دیر وہ دلیری سے اپنا سچ مجھے بتایا اور واپس چلا گیا۔ ہم میں سے زیادہ تر ایسا کوئی فیصلہ کرنے میں ہی جی عمر گنوا دیتے ہیں۔ اس سے کہیں چھوٹا سچ بولتے ہوئے ہماری زبان میں سالہا سال پھلتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ سچ ہمارے منہ سے نکل نہیں پاتا۔ جھوٹ درجھوٹ کی جہیں ہمارے ضمیر کو ڈھانپتی راتی ہیں اور آخر کار ہم سچ بولنا ہی مجھ جاتے ہیں۔ واقعی۔۔۔۔ سچ بولنا صرف محبت کرنے والوں کا ہی شیوہ ہے۔ کیونکہ شاید دنیا میں صرف محبت ہی سچ ہے۔ باقی سارے جذبے کسی نہ کسی منافقت کی پیداوار ہیں۔

اگر عبداللہ میرے سامنے ایمان سے اپنی محبت کا اقرار نہ کرتا تو مجھے ساری زندگی اس کا پتہ نہیں چلتا نہ ہی اُسے کوئی اور مجبوری تھی کہ وہ میرے سامنے یہ راز کھولے۔ لیکن یہ اس نوجوان کے اندر کا سچ تھا جس نے اُسے یہاں مجھ ہنر ادبک چل کر آنے پر مجبور کیا۔ عبداللہ اپنا سچ بول کر چلا گیا تھا، جب کہ مجھے اپنی زندگی کے بہت سے بھائی نک سچ تھا جھیلنے تھے اور ان میں سب سے زیادہ سچ یہ تھا کہ ایمان سب کسی اور کے نام سے منسوب ہو چکی تھی۔

## جادوگر

ربیکا نے ہم کے میری طرف دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کے بعد میرا نام جادوگر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ جادوگری میری شخصیت کا حصہ بنانے والی دور میرے دہس کی ایک کل فام ہے، جو مجھے جینے کا ہر قاعدہ سکھا گئی ہے۔

اس دن بھی وہ کلاس میں بیٹھی میرے کان کھا رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کچھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سب کیسے کر لیتے ہو۔ سارہ جیسی لڑکی نے تمہارے لیے باپ سے جھگڑ کر گواہی دے دی۔ تم

جیسا مقررہ اور بدتمیز امیر زادہ خود تمہارے پاس چل کر دوستی کے لیے آ گیا۔ یہ سب جادو نہیں تو کیا ہے۔۔۔۔۔؟ مجھے بھی سکھادو نا یہ سب کچھ۔“

”میں نے ایسی کوئی انہونی نہیں کی ہے جس کی وجہ سے تم اتنی حیران ہو رہی ہو۔ میں، تم، سارہ اور ہم۔۔۔۔۔ یہ سب انسان ہی تو ہیں، بس

انسان کو اک ڈار سا انسان ہی کی طرح سمجھنے کی بات ہے۔ اور کچھ نہیں۔“

”یہی تو سب سے مشکل کام ہے مائی ڈیر سیڈی۔۔۔۔۔ انسان کو سمجھنا ہی تو محال ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ رہوں گی تو یہ بھی سیکھ لوں گی۔“

اساتے میں ربیکا کو اس کی کسی سیکل نے آواز دے دی اور مجھے منہ کنارے کھڑے جوزف کا پیغام آ گیا۔ آج دو پھر مصلاہ کے موڈ میں

تھا۔ آج ندن میں چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور اس چیز کا قاعدہ اٹھانے کے لیے تمام اسٹوڈنٹس کلاس سے غائب باہر گھاس کے میدانوں میں

آڑھے ترچھے بڑے نظر آ رہے تھے۔ جج ہے ندن میں رہ کر مجھے بھی دھوپ کی اس ٹاپی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں جوزف کی طرف بڑھ گیا۔

جوزف نے تصویر ابھی عمل نہیں کی تھی لیکن مجھے اس نے اپنی تصویر کے لیے نہیں بلکہ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کھڑی سارہ کی پینٹنگ دکھانے کے لیے بلایا

تھا۔ سارہ اپنے دستے رنگ پر دھوپ کی گرمی جھیلی ہوئی گہرے نیلے سرٹ میں آسانی رنگ کی سوٹر پہنے ڈیڈا ماں فیہا سے بے خبر اپنی تصویر مکمل کر رہی

تھی۔ جوزف مجھے اس کی طرف بڑھنے کا اشارہ کر کے خود اپنی تصویر مکمل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میں سارہ کو اور اس کی تصویر کو آخری اسٹروک دیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سارہ نے تصویر مکمل کر کے میری طرف رائے طلب نظروں سے دیکھا۔

”بہت اچھی ہے۔۔۔۔۔ لیکن ابھی مکمل نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ ایک تھکی۔۔۔۔۔ ایک نامکمل پن کا احساس ہو رہا ہے تمہاری تصویر کو دیکھ کر۔“

”بہت خوب۔۔۔۔۔ گویا رنگوں کی زبان بھی جانتے ہو۔ ٹھیک کیا تم نے۔۔۔۔۔ میری ہر تصویر میں تمہیں اس نامکمل پن کا احساس ملے گا۔“

لیکن سر جوزف کے بعد تم پہلے انسان ہو جسے اس کی کا احساس ہوا ہے۔ یہ نہیں کیوں، میں تصویر مکمل کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی ہوں۔“

”شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ تمہاری ہر تصویر کا موضوع کوئی تلاش، کوئی کھوج ہوتی ہے۔ اور شاید وہ کھوج پوری ہونے سے قبل ہی تم بہت بار دیتی ہو؟“

سارہ نے اُلجھ کر میری طرف دیکھا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے، مجھے بھلا کس چیز کی کھوج ہو سکتی ہے۔“

”سچ کی کھوج۔“

”سچ۔۔۔۔۔ سچ کو کھوج کی بھلا کیا ضرورت۔۔۔۔۔ وہ تو سامنے ہی روشن اور عیاں ہوتا ہے تم یہ بتاؤ تمہارا غم پیچہ کہاں تک پہنچا۔“

”ابھی درمیان میں ہوں، لیکن اس غم پیچہ کی وجہ سے بہت سے لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میرا اشارہ سر آئزک کی طرف تھا۔ سارا نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ تم سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔“

”اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔“

”لیکن مجھے تو تم سے ڈر نہیں لگتا۔“

”میں نے کہا نا۔۔۔۔۔ تم بھی اڑکی ہو۔۔۔۔۔ اور سچ کو اُجالے کا خوف کیسا؟“

سارا وہ زور سے ہنسی۔

”میں نے بھی کہا تھا نا۔۔۔۔۔ تم واقعی بہت خطرناک ہو، کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔“

میں بھی ہنس پڑا۔

”بے فکر ہو، جس میں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”ویسے تم نے جن کو معاف کر کے اس کا دل ہی پلٹ دیا ہے کل تک جو تمہارا جانی دشمن تھا، آج سارا دن تمہاری خوبیوں کے گن گاتا رہتا ہے۔“

”میں یہاں دشمنیاں پانے تو کبھی نہیں آ یا تھا، مجھے تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہارے اور سر آئزک کے درمیان کتنی

بیدا ہوئی۔“

سارا نے سر ہلکا لیا۔

”آف۔۔۔۔۔ یہ بیکار بھی نا۔۔۔۔۔ اس کے پیٹ میں کبھی کوئی بات نہیں رہ سکتی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاپا اور میرے درمیان ایسی

لوک جھوٹ چلتی ہی رہتی ہے۔ انہیں دراصل اس بات کا برا لگتا تھا کہ تیس سال میں آج تک یونیورسٹی میں کسی نے ان کے فیصلے کے خلاف سرائے نے

کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ ہر نئے کام کی ایک دن ابتداء ہونی ہی ہوتی ہے۔ وہ مزید بگڑ گئے اور پھر مجبوراً ماما کو سچ میں کودنا

پڑا۔ پھر حسب معمول پاپا کو ہار ماننا ہی پڑی۔“

”لگتا ہے جس میں اپنی ماما سے بہت پیار ہے۔“

سارا وہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”اوہ ہاں۔۔۔۔۔ میری ماما ہی تو میری جان ہیں۔ پاپا تو ہمیشہ مجھے بیٹوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ مجھ سے بہت زیادہ توقعات لگاتے

ہیں لیکن ماما ہمیشہ میری مرضی کو ترجیح دیتی ہیں، وہی میرے دل کی حالت سب سے بہتر جانتی ہیں۔“

سارا وہ کی اس کی ماں سے محبت اس کے لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔

”اب تو وہ تھارے ہارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہیں۔ کبھی ملواؤں گی تمہیں ان سے۔“

”ضرور۔۔۔۔۔ نہیں اسکی خاتون سے ضرور ملنا پسند کروں گا جو بیک وقت سرائزک اور تمہارے دل پر راج کرتی ہیں۔“

میری تعریف کے انداز پر سارہ کھٹکھٹا کر غصہ دی۔

”نہیں مگر تو تمہاری یہ بات ضرور بتاؤں گی۔“

میں اور سارہ اس روز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس بات سے بے خبر کہ دور کہیں دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے کوئی شخص بہت دیر سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ شخص کوئی اور نہیں تھا۔ میرے ساتھ کھڑی اس صاف دل لڑکی کا باپ آئزک تھا۔ جس کا دل اب میری طرف سے اتنا صاف نہیں تھا۔

فرم بچہ جمع کروانے کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ میرے دس اور رات کا بیشتر حصہ ”ہالوکاسٹ“ سے متعلق ریسرچ کی کتابوں کی ورق گردانی اور نوٹس بنانے میں گزر رہا تھا۔ اس دن بھی میں لائبریری میں سرپرو دیر تک اپنے مطلب کی چیزیں دیکھتا رہا۔ مجھے دراصل اپنی یونیورسٹی سے ”ہالوکاسٹ“ کے حق میں ہی مواد مل سکتا تھا۔ لیکن وہ بھی میرے لیے فائدہ مند ہی ثابت ہوا تھا کیونکہ مجھے ہالوکاسٹ کے حق میں وہ اس کے مخالف نظریے میں مقابہ کر کے حقائق جاننے کا مزید موقع میسر آ گیا تھا۔ اب میں دلیل در دلیل بحث کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی کے گیٹ سے نکلے ہوئے مجھے سارہ کی سفید چلنے والی گاڑی آگے جا کر رک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ سارہ کے ساتھ ایک میٹھی سی مسکراہٹ والی بچی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے گاڑی تک چل کر آنے کے وقت میں شاید سارہ اسے میرے ہارے میں کچھ بتا چکی تھی۔ عورت نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

”اچھا تو یہ ہے تمہاری کلاس کا باغی۔۔۔۔۔ بھئی یہ تو بہت اچھا لڑکا ہے۔“ سارہ مسکرائی۔

”تمہارے۔۔۔۔۔ یہ میری ماما ہیں، مسز جینی آئزک۔“

میں نے سر جھکا کر مسز جینی کو آداب کیا، انہوں نے مسکرا کر جواب دیا، سارہ بولی۔

”کہاں جا رہے ہو، آؤ ہمیں حصص چھوڑ دوں گی۔“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ آ جاؤ۔۔۔۔۔ راستے میں کپ شپ بھی رہے گی۔“ مسز جینی نے جلدی سے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں یہاں قریب ہی چوراہا اسکوائر کے قریب والی لائبریری تک جا رہا ہوں۔ بس اگلے گھنٹے کے پاس ہی ہے۔“

آپ لوگ جائیں۔“

”نہیں بھئی اتنی آسانی سے تو ہم حصص نہیں جانے دیں گے۔“ مسز جینی فیس کر بولیں۔ اگر آج رات ہماری طرف کھانے پر آنے کا وعدہ کرو تو جان بچھوٹے گی۔“

سارہ نے بھی سر ہلایا، اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا میرے پاس۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں رات کو ان کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

☆☆☆

## دشمنِ خدائی

اس دن عبد اللہ کے وہاں جانے کے بعد جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایک دم سے ہی جانے کیوں مجھے ساری خدائی ہی دشمن لگنے لگی تھی۔ ایک دم ہی میرا دل جیسے ہوا مجھے احساس سے عاری ہو گیا تھا۔ نہیں جس دن سے صوفی رحمت اللہ سے ملا تھا تب سے اس دن عبد اللہ کی مجھ سے اسٹیشن پر ملاقات ہونے تک، میری ایک بھی نماز نہیں چھوٹی تھی۔ لیکن اس دن عبد اللہ کے واپس چلے جانے کے بعد میرا اس مذہب سے بالکل ہٹ گیا تھا۔ جیسے میرے اندر کا یقین ہی بالکل ختم ہو گیا تھا۔ دُعا اور اس کی قبولیت سے میرا بھروسہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سب ایک ڈھکوسلہ لگنے لگا تھا، میری ساری نمازیں چھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے ہر دم یہ احساس رہنے لگا تھا کہ یہ نمازیں، یہ دُعا کیں سب بے فائدہ ہیں۔ اگر ان نمازوں سے دن دُعاؤں سے کچھ فرق پڑنا ہوتا تو خدا موصی صاحب کا دل میرے لیے نرم کر دیتا۔ آج ایمان عبد اللہ سے منسوب ہونے کی بجائے مجھ سے منسوب ہوتی۔

مجھے مولوی صاحب کی ہر بات بھی صرف ایک ڈھکوسلہ لگنے لگی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ شخص سر سے جوت تک صرف ایک دکھ دہائی تو ہے، جو زمانے کے سامنے اپنی پارسائی کا سوا گنگہ رچانے کے لیے میری محبت کے درپے ہے۔ اسے صرف یہ فکر ہے کہ کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے معتدلوں اور نمازیوں کی تعداد کم نہ ہو جائے۔ جو صرف یہ چاہتا ہے کہ آتے جاتے اور اسے بازاروں سے گزرتے دیکھ کر لوگ اس کی تعظیم کے لیے اٹھ اٹھ کر اسے سلام کرتے رہیں اور اس کے گزر جانے کے بعد اونچی سرگوشیوں میں اس کی نیکیوں اور پاک بازی کے کُن گاتے رہیں۔ جنہیں کُن کر وہ اپنی عظمت کے نشے میں خود ہی ہمد وقت سرشار ہے۔

ایسے اور اس جیسے جانے کتنے خیالات دن رات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔ شاید مجھ سے یہ توفیق ہی نہیں لی گئی تھی کہ نہیں کوئی مثبت بات سوچ سکوں۔ مولوی صاحب کے پاس جب میں عشاء کی نماز پڑھنے جاتا تھا تو نماز کے بعد کے درس میں عجیب و غریب قسم کے مسائل سننے کو ملتے تھے۔ مثلاً ایک دن نماز کے بعد ایک نوجوان مولوی صاحب کو بتانے لگا کہ اس کے ساتھ ایک انوکھا مسئلہ ہے۔ اور وہ یہ کہ جب وہ گھر سے کہیں دُور کسی کام کے لیے نکلتا ہے، یا پھر جب وہ دوسرے شہر پڑھنے کے لیے جاتا ہے اور اسے پور ڈنگ میں رہنا پڑتا ہے تو اس سے ساری نمازیں چھوٹ جاتی ہیں۔ وہ چاہے کہ بھی نماز نہیں پڑھ پاتا کیوں کہ نماز پڑھنے سے اسے گھر کی یاد اور زیادہ ستاتی ہے؟ اسے لگتا ہے کہ اگر وہ نماز پڑھے گا تو اور زیادہ غمگین ہو جائے گا، لہذا وہ نماز پڑھنے کے بجائے ان اوقات میں دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے اور فلم وغیرہ دیکھنے چاہتا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک اور صاحب تشریف لائے جو اس بات سے بے حد پریشان تھے کہ ان کا دل حج پر جانے کو نہیں مانتا۔ حالانکہ وہ صاحب استطاعت ہونے کے ساتھ ساتھ تندرست بھی تھے اور ان پر کوئی ایسی ذمہ داری بھی نہیں تھی کہ وہ خود اور اپنی بیگم کو رے کر حج کے لیے نہ نکل پاتے۔ لیکن بقول ان کے، ان کا دل ہی اس طرف مائل نہیں ہو پاتا تھا۔ انہیں حج پر جانا ایک بڑی خواری کا کام لگتا تھا، اور جو محبت خدا کے گھر کو دیکھنے کے لیے دس میں ہونی چاہیے تھی، وہ اس محبت سے بالکل عاری تھے۔

ان دنوں میں بڑی حیرت سے لوگوں کے یہ مسئلے سنا کرتا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مولوی صاحب کے جواب ہوتے تھے۔ مثلاً ان حج والے صاحب کو انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ ساری بات توفیق ملنے کی ہے۔ فی الحال ان کے لیے یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ کم، زکم اس بات پر پریشان تو ہوتے ہیں کہ انہیں حج سے رغبت کیوں محسوس نہیں ہوتی۔ فی الحال انہیں پریشان ہونے کی توفیق عطا کی گئی ہے۔ جس دن حج پر جانے کی توفیق نصیب ہوگی، وہاں جانے کی محبت اور غلت خود بخود دل میں پیدا ہو جائے گی۔ ہاں البتہ دعا ضرور کرتے رہیں کیونکہ پریشانی کی بات تب ہوگی جب دل سے حج نہ کرنے کی پریشانی بھی جاتی رہے گی۔ ایک دن اسی طرح دعا کے معلق ایک عجیب بات سننے کو ملی۔ ایک نوجوان مولوی صاحب کے سامنے پریشان حال بیٹھا اس بات کا رد و رد ہاتھ کا اس کی دعا میں غصہ شامل نہیں ہوتا۔ وہ بس برائے نام ہی خدا کے سامنے گڑ گڑاتا ہے۔ نہ ہی اس کی توبہ اور معافی میں کچھ سچائی ہوتی ہے۔ وہ منافقانہ انداز میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی تو مانگ لیتا ہے لیکن اندر سے اسے اس گناہ پر خوشی محسوس ہو رہی ہوتی ہے اور دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ اگر کبھی دوبارہ موقع ملتا تو وہ یہ گناہ ضرور دوبارہ بھی بنا کی جنت اور نعمت کے کرگزرے گا۔

مولوی صاحب نے اسے بھی جواب میں یہی بات کہی۔ "توفیق" اسے بھی یہی دلاسا دیا گیا کہ ابھی کچھ اور منافقانہ معافی کی توفیق ملی ہے۔ پُر غصہ معافی کی بھی وقت آنے پر مل جائے گی۔ شرعاً صرف اتنی سی ہے کہ اس منافقانہ اور دکھاوے کی معافی کا دامن بھی نہ چھوڑا جائے۔ ندامت چاہے دکھاوے کی ہو یا چاہے منافقانہ سے خوش کر دینا چاہیے۔

اسی ہے مجھے بھی لگ رہا تھا کہ مجھ سے ہر اچھی بات سوچنے کی اور ہر نیک کام کرنے کی توفیق بھی شاید عبد اللہ سے ہوئی اس ملاقات کے ساتھ ہی چھین لی گئی تھی۔ میں سارا سارا دن یونہی خالی الذہن بیٹھا رہتا اور اپنے سامنے ہونے والے دنیا کے قماشے کو دیکھتا رہتا تھا۔ اب میں نے شا کر کی طرف جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ خیر واد ضرور سے بھی کم ہی بات چیت ہوتی تھی۔ صدیقی صاحب بھی میری راہ نکلتے رہتے تھے اور پھر انتظار سے اکتا کر خود ہی نشیمن پر چلے آتے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتے۔ کبھی یہ جانتے تھے کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے لیکن میرے اندر ہونے والی اس تبدیلی کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ خیر و روزانہ اس امید پر مچ و شام مانگ جوت کر میرا نشیمن کے باہر انتظار کرتا رہتا کہ شاید مجھے اپنی منت پر جانا ہو، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میری ہر منت دم توڑ گئی تھی۔ ایمان کو مانگنے کے بعد میرے پاس مانگنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ نہ ہی کسی مراد کے پورے ہونے کا یقین ہی دل میں باقی بچا تھا۔ میں دنیا کی ہر خوشی اور ہر غم سے لاقطع ہو گیا تھا۔ میں ایمان کی قریب آتی ہوئی شادی کے دن یوں گمن رہا تھا جیسے کوئی چھانی کا قیدی کال کوٹھڑی میں اپنی موت کی گھڑیاں گنتا ہے۔

دو ایک ایسا ہی دن تھا، بوجھل، بے نور، انتہائی طویل اور اکتا دینے والا۔ میں سر پہر کو پلیٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جو کسی وجہ سے پچھلے چھ نمک پر بہت دیر سے رکی ہوئی تھی۔ تھک کر میں بسپوسٹ کے نیچے بڑے تھڑے پر بیٹھ گیا اور جس طرف سے مال گاڑی کو انشیشن میں داخل ہونا تھا اس طرف کے سگنل کو دیکھنے لگا۔ آج غصہ اور بھی نہیں تھا اور تمام مال مجھے ہی اتروانا تھا، دفعتاً میری نظر سگنل سے ہوتی ہوئی نیچے پڑیاں کر اس کر کے پلیٹ نمبر 2 کی طرف آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ کچھ دیکھا بھابھا سا لگ رہا تھا۔ پر کون تھا یہ آدمی۔ اچانک میں اپنے حواس میں ایک جھٹکے سے لوٹ آیا۔ ارے۔۔۔ یہ تو شا کر تھا، اپنی مخصوص ڈرائیوروں والی سفید وردی میں، جس کی وجہ سے میں ڈور سے اسے ریلوے کائی کوئی ہلکا کچھ میٹھا تھا۔ شا کر میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ شا کر نے قریب آتے ہی مجھے زور سے سمجھائی کیا اور بہت دیر



تک بنا کچھ کہے پپ چاپ مجھے گلے لگائے کھڑا رہا اور جب مجھ سے علیحدہ ہوا تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”حماد بابا۔۔۔ کیا میرا گھر اس قابل بھی نہیں تھا کہ آپ وہاں کچھ دن رہ سکتے۔“

”تم جانتے ہو اس بات نہیں ہے۔۔۔ وہ میرا دوسرا گھر ہے۔۔۔ لیکن اگر گھر میں ہی رہنا ہوتا تو پھر پہلا گھر ہی کیوں چھوڑتا۔۔۔ لیکن تمہیں یہاں کا پتہ کس نے دیا۔۔۔“

”میں جانتا تھا گفت زیادہ دن تک یہ بات چھپا نہیں پائے گی۔“

”میں چاہتا تو آپ کو گھر سے نکلنے کے بعد پہلے دن ہی تلاش کر لیتا بابا۔۔۔ لیکن میں نے صرف آپ کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ آپ نہ امان جائیں گے۔ آج بھی واقعی میں محبت کے بتانے پر ہی سیدھا یہاں آیا ہوں۔ اس نے آپ کو بھی گھر دیا ہے۔ کہہ رہی تھی بہت ضروری کام ہے۔ آپ کو ابھی میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔“

”ابھی۔۔۔ لیکن مجھے اس وقت بہت کام ہے۔۔۔ میں شام کو۔“

”نہیں بابا۔۔۔ آپ کو ابھی چلنا ہوگا۔ اگر جلدی نہ ہوتی تو محبت مجھے بھی آپ کا پتہ نہ دیتی۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی بات کا کتنا مان رکھتی ہے۔“

شاہر کے بچے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے مال گاڑی کا معاملہ ایک دوسرے سنسنر لگی کے ہاتھوں میں سوپ کر اس کے ساتھ اسٹیشن سے نکلنا ہی پڑا۔ ہر ایک بڑائی اولیٰ کھڑی تھی۔ شاہر جانتا تھا کہ میں کشتر صاحب یا گھر کی کسی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا اس لیے وہ شاید کسی جاننے والی کی کار لے کر آیا تھا۔ ہم دونوں بڑائی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں شاہر نے بتایا کہ امی اب اندر سے ٹوٹ چکی ہیں اور میری تلاش میں عبد کو ہر طرف دوڑا چکی ہیں۔ لیکن کشتر صاحب کے در سے کوئی کھلے عام میری جدائی کا ذکر گھر میں نہیں کرتا۔ اب وہ سب ہی جان چکے ہیں کہ میں اپنے کسی دوست کی طرف نہیں گیا تھا اور گھر سے نکلنے کے بعد سے ہی تنہا کس رہ رہا تھا۔ امی نے شاہر سے بھی مجھے تلاش کرنے کو کہا تھا اور فرکار شاہر کو کون کی تس کے لیے انہیں بتانا پڑا تھا کہ میں کبھی بھڑائی حویلی میں محبت اور شاہر سے ملنے کے لیے آتا رہا ہوں اور خیریت سے ہوں۔ امی نے شاہر سے یہ بھی کہا تھا کہ اب اگر کبھی میں بڑائی حویلی آؤں تو شاہر چپکے سے امی یا عبد کو اطلاع کر دے۔ میں نے چونک کر شاہر کی طرف دیکھا۔ کہیں میرا دل وہ اسی پروگرام کا ہی تو کوئی حصہ نہیں۔ لیکن پھر میں نے خود ہی کو ملامت کی۔ شاہر کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ورنہ وہ مجھے یہ سب تفصیل بتاتا ہی کیوں؟

کچھ ہی دیر میں ہم بڑائی حویلی کے پھاٹک نما گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ شاہر نے مجھے گیٹ پر اتارا اور مجھے گاڑی واپس کر کے جلد آنے کا کہہ کر وہیں سے واپس مڑ گیا۔ شام کے ساڑھے چار کا وقت ہوگا۔ حویلی پر اک سکوت سا چھا یا ہوا تھا۔ گیٹ سے اندر دھکتے ہی سب سے پہلے میری نظر محبت پر پڑی جو بے چینی سے حویلی کے بطنی دالان میں خنجر رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھی۔

”اوہ بھیا۔۔۔ کہاں رہ گئے تھے آپ۔۔۔ کتنے دن سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں مجبوراً مجھے آج بابا کو آپ کے چھپے بھینجا پڑا۔ کیا آپ نے ہم سب سے بھی اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔۔۔ تبھی آپ مجھ سے بھی ملنے نہیں آئے نا۔“

محبت کی آنکھوں میں شکوہ تھا، میں نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگائی۔

”بڑی چابک ہو۔۔۔۔۔ جانتی ہو کہ میرا پتہ بتانے پر ڈانٹ پڑے گی مجھ سے اس لیے پہلے ہی سے تیری کر رکھی ہے مجھ سے ناراض ہونے کی۔۔۔۔۔ ہاں؟“

”بات ہی ایسی تھی۔۔۔۔۔ ورنہ میں آپ کا پتہ کبھی کسی کو نہ دیتی۔ دراصل حیا آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں آ چکی ہے۔ لیکن تب بھی آپ کا کچھ لٹ پٹ نہیں تھا۔ میں نے اُسے تب یہ کہا تھا کہ شاید آپ ایک آدھ دن میں آئیں گے تو میں آپ کو آج کے دن دوبارہ آنے کا کہوں گی۔ تب وہ بھی آجائے اور آپ سے بات کر لے۔ لیکن دن گزرتے گئے اور آپ مجھ سے ملنے آئے ہی نہیں اور آج کا دن ابھی آ گیا جب میں نے حیا کو یہاں دوبارہ آنے کا کہا تھا۔ بس ہی پریشانی میں اب آپ کی طرف بھیجنا پڑا۔“

میرے لیے حیا کی مدد واقعی بہت حیرانی کا باعث تھی۔ وہ تازہ سی لڑکی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی جس کے لیے اُسے دوسرے اپنے نفس جیسے گھر سے نکل کر اتنی دُور تک یہاں آنا پڑا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس گھر سے نکلنا حیا کے لیے کس قدر مشکل مرحلہ ثابت ہو گا۔

”کہاں ہے حیا۔۔۔۔۔؟“

”میں نے اُسے حویلی کے بڑے برآمدے والے گول کمرے میں بٹھایا ہے۔ ابھی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ یہاں پہنچی ہے۔ میں سی پریشانی میں یہاں ٹہل رہی تھی کہ اگر آپ اب اس کو اسٹیشن پر نہ ملے تو میں حیا کو کیا جواب دوں گی۔ آپ اس سے دو گھڑی دیں مل میں، میں ابھی آتی ہوں۔“

گھبت نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا۔ میں گونگی کیفیت میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر چلتے چلتے مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے جاتی ہوئی گھبت سے آواز دے کر پوچھا۔

”لیکن حیا یہاں تک اکیلے آئی کیسے۔۔۔۔۔؟“

”وہ اکیلے نہیں آئی، اُس کی امی بھی اس کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ اندر ہماری طرف اماں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔“

گھبت پلٹ کر چلی گئی، میں حریہ انہیں کا شکار ہو گیا۔ حیا اپنی امی کے ساتھ آئی ہے۔۔۔۔۔ تو کیا اس کی ماں کو بھی اس بات کی خبر ہے جو حیا مجھ سے کہنے کے لیے اتنی دُور آئی ہے؟

میں اسی شش و پنج میں مبتلا چلا ہوا حویلی کے بڑے برآمدے تک پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کی اور پھر میں قدم بڑھا کر اندر داخل ہو گیا۔ حیا نے آہٹ سن کر چونک کر مجھے اندر آتے دیکھا اور بوکل ہٹ میں دو گھڑی ہو گئی۔ جلدی میں اُس نے مجھے سلام کیا۔ اس دن میں نے پہلی مرتبہ حیا کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ ایمان سے بے حد مماثلت رکھتی تھی۔ شاید عمر میں دو تین سال ہی اُس سے چھوٹی ہوگی۔ اس کی پلکیں بھی ہر لمحہ ایمان کی پلکوں کی طرح لرزتی ہی رہتی تھیں۔ وہ بھی ایمان کی طرح ہی بڑی سی چادر میں لپٹے سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کسی ان جانے جذبے کی طاقت سے یہاں تک تو آ گئی ہے لیکن یہاں مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ مجھے اس کی دلجوئی کے لیے خود ہی بات شروع کرنی چاہیے۔ ورنہ شاید ہم دونوں ہی یوں خاموش کھڑے رہتے۔

”آپ کھڑی کیوں ہیں۔ پلیز بیٹھ جائیے۔“

جیائے چاہ بیٹھ گئی، میں بھی سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

”معافی چاہتا ہوں آپ کو میری وجہ سے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی لگی نے بتایا کہ آپ آئی ہوئی ہیں۔“  
جیائے چائیں اٹھائیں در میری طرف دیکھا۔

”آپ اپنے آپ کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔“

مجھے اس براہ راست طرز خطاب کی توقع نہیں تھی۔

”شاید میری قسمت میں ہی یہ سزا لکھ دی گئی تھی۔ اور پھر تقدیر سے کیا الٹتا۔۔۔۔۔؟“

”آپ جو محبت کر رہے ہیں وہ اب صرف کتابوں اور افسانوں میں باقی رہ گئی ہے۔۔۔۔۔ ایسی محبت کو سمجھنے والے اب اس دنیا میں باقی نہیں ہیں۔“

میں نے حیرت سے اس نازک سی گل اندام لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی اسکول، کالج سے واپس آئی ہوئی لگتی تھی۔ مجھے اس سے تنی بڑی بڑی باتوں کی توقع ہرگز نہ تھی۔ لیکن شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ رکھتی ہیں۔

”محبت کرنا نہ کرنا اپنے اختیار میں ہی ہوتا تو پھر مسئلہ کس بات کا تھا۔ محبت کا سب سے بڑا البیہ یہی ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ نہ ہی محبت کو اس بات کی پروا ہوتی ہے کہ کوئی اسے سمجھے گا یا نہیں۔“

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔

”کاش آپ کا اور ایمان آپ کی کامیل ممکن ہوتا۔ لیکن ایک اس میل کے نہ ہونے سے آپ باقی ساری دنیا کو تو نہیں چھوڑ سکتے تے۔ آپ کے لیے ایمان ہائی کا یہی پیغام مائی ہوں میں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ خدا کے لیے یوں در بدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ یہ ان کی آپ سے آخری التجا ہے۔“

اور۔۔۔۔۔ تو حیا اُسی ماہر کا پیغام لے کر آئی تھی۔ گویا اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا تھا۔ شاید وہ اس دن اسٹیشن پر میری حالت کو ابھی تک بھولی نہیں تھی۔ لوگ کتنے مصحوم و رہو لے ہوتے ہیں۔ بھول جانے کا کہہ کر سمجھتے ہیں کہ دوسرا شاید سب بھول ہی جائے گا۔ چلو اس سنگ دس کو مجھ پر اتار دھم تو آیا کہ اس نے نامہ بر بھیج کر مجھے اپنا دروازہ اپنی دھشت بھول جانے کا پیغام تو بھیجا۔ اس ایک جنم کے لیے تو اس کی یہ مہربانی بھی کچھ کم نہ تھی۔

”اگر آپ کی ایمان آپ کی تسلی اس بات سے ہوتی ہے کہ میں واپس اپنے رشتوں کے پاس چلا جاؤں تو آپ ان سے جا کر یہی کہہ دیجئے گا کہ میں واپس چلا گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی اگلی ساری زندگی اس احساس کے ساتھ گزاریں کہ ان کی وجہ سے کوئی گھر سے بے گھر ہوا تھا۔“

جیائے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔

”میں جانتی تھی کہ آپ میری بات نہیں مانیں گے۔ کیوں سارا کچھ خود ہی سہتا چاہتے ہیں۔ کیوں خود کو اتنی اذیت دے رہے ہیں۔ اس وقت بھی آپ کو آپ کی احساسات کا ہی خیال ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ صرف میرے کہہ دینے سے اس بات پر یقین کر لیں گی کہ آپ واپس گھر چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”میں جانتی تھی کہ آپ میری بات نہیں مانیں گے۔ کیوں سارا کچھ خود ہی سہتا چاہتے ہیں۔ کیوں خود کو اتنی اذیت دے رہے ہیں۔ اس وقت بھی آپ کو آپ کی احساسات کا ہی خیال ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ صرف میرے کہہ دینے سے اس بات پر یقین کر لیں گی کہ آپ واپس گھر چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”پھر آپ ہی بتائیے۔۔۔ میں انہیں یقین دلانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”آپ اس دنیا کے نہیں لگتے۔۔۔ یہ دنیا آپ جیسوں کے لیے بنی بھی نہیں ہے۔ لیکن ہو سکے تو میری درخواست پر غور ضرور کیجئے گا۔ یہ صرف آپ کی ہی خواہش نہیں ہے۔ یہ میری بھی آپ سے یہی التجا ہے۔ اس دن آپ کو انکسٹن پر دیکھ کر ہماری کیا حالت ہوئی تھی۔ آپ نہیں جانتے۔۔۔ اس دن ای نے بھی آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ انہیں بھی آپ ساری دنیا سے الگ نظر آئے تھے۔ کاش ہماری بدنہیبی کے ستاروں کا سایہ آپ پر کبھی نہ پڑتا۔“

اتنے میں گہمت کمرے میں داخل ہوئی۔ حیا اُسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ محبت نے اسے بتایا کہ اس کی می جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ حیا نے مجھ سے رخصت لی اور جانے کے لیے ہلکی۔ میں گم سم سا بیٹھا ہی رہ گیا۔ اچانک حیا کی اور اُس نے اپنے ہاتھ میں چھپ دیا ہوا کاغذ کا رقعہ لکھا۔ اور میرے قریب آ کر اُسے میری طرف بڑھایا۔

”یہ آپ نے مجھے اس وقت آپ کو دینے کا کہا تھا جب مجھے لگے کہ میری درخواست آپ کی قبولیت پانے کے قابل نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔ حیا پلٹ کر چلی گئی اور ہاتھ میں سفید کاغذ کی دو پرچی تھیں کی حیا رہ گئی۔ کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ گہمت بھی حیا کو چھوڑنے پر چلی گئی تھی۔ میں نے کاغذ کی تھیں کھولیں۔ محبوب کا خط کھولنے اور اُسے پڑھنے کی لذت سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جنہوں نے خود اس تجربے سے گزر کر دیکھا ہوتا ہے وہ چند لمحے کسی قارون کے خزانے سے کم نہیں ہوتے، میرے لیے تو ویسے بھی یہ اس مذہب کے پہلے چند لفظ تھے جو تجربے کی صورت میں اُس نے بھیجے تھے۔ ورنہ لوگ تو ہزاروں مرتبہ کے کہے، سنے اور پڑھے ہوئے لفظوں کو بھی کسی تھک کی طرح سنہال کر رکھتے ہیں دن میں ہزار ہزار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار انہیں وہ تحریر اتنی ہی نئی لگتی ہے جتنی پہلی مرتبہ لگی تھی۔ میری نظریں تیزی سے کاغذ پر چھلکتی جا رہی تھیں۔ خوبصورت لکھائی میں صرف چند جملے ہی لکھے ہوئے تھے۔ بتا کسی القابات اور روایتی سلام و دعا کے بغیر۔

”آپ کے ارادے اور اس کی سچائی کی عظمت پر شک نہیں ہے۔ بس اتنا کہنا تھا کہ محبت میں ضد نہیں ہوتی۔۔۔ ضد تو دشمنی کی پہچان ہے۔ آپ گھر واپس چلے جائیں اور یہ دشمنی ختم کر دیں۔ یہ میری آپ سے پہلی اور آخری التجا ہے۔“

☆☆

شاید ان چند لکھوں میں میں نے بیسیوں بار اس رقعے کو پڑھا ہوگا۔ ہر دفعہ اس اُمید پر کہ شاید کوئی لفظ مجھ سے کچھلی مرتبہ چھوٹ گیا ہو۔ شاید مجھ سے پڑھنے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔ دراصل میں اب تک خود کو یقین ہی نہیں دلا پا چکا تھا کہ میرے ہاتھوں میں اس گل رخ کی تحریر ہے جو اس نے صرف میرے لیے لکھی ہے۔ صرف میرے لیے۔۔۔ عداوت اور ہمدردی کے لیے۔۔۔ کیا رنگی حیدر جیسے کا اس سے بڑا کوئی اور بہانہ ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کاغذ کے ٹکڑے میں، ان لفظوں کی پور پور سے اور اس روشنائی کے ہر ٹکڑے سے اس کی تصویر جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کاغذ نہ ہو۔ ایمان خود میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ خط میرے لیے پوری ملاقات سے بھی بڑھ کر تھا۔

میں نے آس پاس نظر ڈالی، قریب ہی چند کاغذ اور ایک جنسل میز پر دھری پڑی تھی۔ میں نے جنسل اٹھائی اور کاغذ پر چند سطور کھینچ دیں۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک  
کون جیتا ہے حیرتی زلف کے سر ہونے تک  
ہم نے مانا کہ تحافل نہ کرو گے لیکن  
خاک ہو جائیں گے ہم ٹم کو خبر ہونے تک

میں نے اس کے گھر میں غالب کو بکھرے پایا تھا، غالب اُس کا پسندیدہ شاعر تھا، میں نے اسی کے پسندیدہ شاعر کی زبان اپنا حاضیون کر دیا تھا۔ میری بات تو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ شاید اپنے شاعر کی بات اس کو سمجھ میں آ جائے۔ دوسرے کاغذ پر میں نے گفت کے لیے ایک پیغام لکھا کہ اگر حیا اب تک نہیں گئی ہے تو وہ اس کے ذریعے پانچمرکس اور طریقے سے یہ پیغام ایمان تک پہنچا دے۔ میں ان دونوں کاغذوں پر سنگ مرمر کا بنا ہوا خوبصورت سا چھوٹا وزن رکھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا، میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکن چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ می نے شا کر کے ملادو بھی حویلی کے کسی لوکر کو میرے آنے کا اطلاع دینے کا پابند کر رکھا ہو۔ میں حویلی کے پچھلے سے گزرتا ہوا باہر سرک پر آ گیا۔ کچھ ہی دور مجھے ایک ٹانگہ مل گیا اور میں اسے اسٹیشن کا پتہ دے کر کچھ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں اپنے خیالوں میں اور اس کاغذ کے کٹڑے کے دل کے اتنے پاس ہونے کے احساس میں اس قدر رگن تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اسٹیشن چلنے لگا۔

شام ڈھل رہی تھی، پیٹ فارم پر پہنچا تو صدیقی صاحب کا خاص بنگالی نوکر جو ان کا درجنی بھی تھا، پیٹ فارم پر میری ہی تلاش میں دھر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ لہرایا، وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔

”وہ صاحب۔۔۔۔۔ آپ کو ادھر جاتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کے لیے چاول مولا بنایا ہے ہم نے۔“  
میں نے تھکن کاغذ پیش کیا لیکن میں جانتا تھا کہ ابراہیم اب مجھے ساتھ لیے بنایا ہوا سے نہیں لے گا۔ صدیقی صاحب نے اُسے کچھ اسی قسم کی ہدایت دے کر بھیجا ہوگا۔ مجبوراً مجھے اس کے ساتھ ہی صدیقی صاحب کے بٹلے جانا پڑا۔ وہ برآمدے میں ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر وہ بھی کھل سے گئے۔

”ہاں میاں۔۔۔۔۔ اب بھلا ہماری یاد کیوں آنے لگی۔ اب تو جناب کی صورت دیکھتے ہی ہفتہ ہفتہ ہو جاتا ہے۔“  
میں مسکرایا۔۔۔۔۔ ”ایسی بات نہیں ہے، آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو آپ ہر دم میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔“  
صدیقی صاحب ہلکے کمرے پر پڑے۔

”مظلوں کی کبھی بھی کی نہیں رہی تمہارے پاس۔ کبھی تو کسی کو تارض ہونے کا موقع دیا کر دیا میاں۔“  
صدیقی صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جانے میں انہیں کس طرح اور کیا جواب دینا رہا۔ میرا دھیان تو کہیں اور ہی تھا۔ بس صدیقی صاحب کی دلجوئی کے خیال سے ان کا ساتھ دیتا رہا۔ ابراہیم نے جلد ہی کھانا لگا دیا۔ وہ ہمیشہ سے چاول چھل بہت لذیذ بناتا تھا۔ اور پھر کھانے کے دوران وہ آس پاس ٹہلتا رہتا تھا کہ ہم اس کے کھانے کی تعریف کر سکیں۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے صدیقی صاحب سے اجازت چاہی۔ وہ میرے ساتھ ہی باہر مچن میں بنے نکلوی کے چھوٹے سے سفید چائیک فرم گیٹ تک آئے۔ میں رخصت لے کر نکلنے لگا تو انہوں نے پٹنے سے مجھے روک لیا کہو دیر تک مجھے دیکھتے رہے جیسے میرے چہرے پر کچھ کھوج رہے ہوں۔

[illegible]

یہ کیسا تھم تھا۔۔۔۔۔ میری محبت لٹ رہی تھی اور صدیقی صاحب اور ان جیسے اور کتنے ہوں گے جو اس وقت بھی مجھ سے کسی ڈوبتے جہاز کے کپتان کا سادہ قار توقع کرتے تھے، ایک ایسے بحری جہاز کا کپتان جو یہ جانتا ہو کہ اس کے آدھے ڈوبے ہوئے جہاز کو پورا غرق ہونے سے اب دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی، پھر بھی وہ اپنے عملے اور مسافروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جہاز کے شکستہ عرشے پر سینٹائے کھڑ رہتا ہے۔ اور آخر کار جہاز کے ساتھ ہی غرق ہو جاتا ہے، جانے ان لوگوں نے مجھے اتنا دلیر اور اتنے بڑے دل والا کیسے سمجھ لیا تھا۔۔۔؟

☆☆☆



## یہودی بستی

شام کو جب میں سارہ کے گھر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا تب کامران آ گیا۔

”کیا۔۔۔ تم اس یہودی بستی میں جاؤ گے، ناممکن۔“

”اوہو۔۔۔ میں کسی یہودی بستی میں نہیں بلکہ سارہ کے گھر جا رہا ہوں جو نورٹی کے پچھلے جاک میں ہی واقع ہے۔“

”جانتا ہوں، اسی کو نہیں یہودی بستی کہتا ہوں۔ تمہارے ایڈمیشن سے پہلے دوسرے تمہارے ہی کام سے گزر رہا تھا میرا وہاں ہے۔ ایک عجیب

سی حقارت تھی ان سب کی نظروں میں میرے لیے جیسے میں کوئی انسان نہیں، کسی نالی کا کیزا ہوں۔ کسی نے میری بات کا صحیح جواب تک نہیں دیا۔ تم نہیں

جانتے صرف تمہارے فارم اس آئزک سے تصدیق کروانے میں مجھے کس قدر مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میری مانگو تو وہاں جانے کا ارادہ ہر دو۔“

میں نے منسکرا کر کامران کے کاندھے کو تھپتھپایا اور اس کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے لی۔

”فکر مت کرو، تمہارا دوست اتنی مٹھی گولی نہیں ہے جسے وہ لوگ اتنی آسانی سے نگل جائیں گے۔ میں صرف سارہ اور اس کی ماما کی وجہ

سے وہاں جا رہا ہوں۔ ان لوگوں سے منا میرے نرم ہنچ میں بھی میری مدد کرے گا۔ میں ان لوگوں کا رہنما بن کر قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

کامران نے ٹھنڈی سی سانس لی۔

”اچھا۔۔۔ پھر اس یہودی حسینہ کو میرا سلام بھی کہہ دیتا۔۔۔ اور یہ بھی کہنا کہ آئندہ جب بھی تمہیں اپنے گھر کھانے پر بلائے تو ساتھ ہی

تمہارے جگر کی دوست کامران کو بھی ضرور بلائے۔ کیونکہ تم اس کے بغیر کھا ناطلق سے نیچے نہیں اُتار سکتے۔“

میں آٹھ بجے کے نگ بھگ سر آئزک کے بچنے بچنے گیا۔ سارہ نے گیٹ پر ہی میرا استقبال کیا۔ سبز چینی، ندر ماؤنج میں موجود قمیض لیکن

سر آئزک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ سارہ کا گھر بہت سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ گھر کی ہر چیز سے ناست اور اعلیٰ معیار تک رہا تھا۔ سارہ کی بنائی ہوئی بہت

سی چیتنگز دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ گھر کے ایک کونے میں چھوٹا سا عبادت خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ جس کے چوہارے کے گرد بہت سی موسم بٹیاں ایک

خاص ترتیب میں رکھی گئی تھیں۔ ضرور ان موسم بٹیوں کا تعلق بھی ان کی عبادت کے کسی خاص حصے سے ہوگا۔ سارہ انتظامات میں لگ گئی اور سبز چینی

میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”ہاں تو اب بتاؤ، یہاں تک کیسے پہنچے؟ تمہارے ملک کے بارے میں میں نہیں نے بہت سنا ہے، لیکن تم اتنے بڑے اسرار نہیں لگتے جتنی بڑے اسرار

کہانیاں تمہارے لوگوں کے بارے میں سنی تھیں؟

”ایسا کچھ خاص ہے نہیں میرے پاس بتانے کے لیے، اور دوری، ہمیشہ چیزوں کو بڑے اسرار بنا دیتی ہے۔ قریب آنے پر چیزوں اور لوگوں کی بڑے

اسرا ریت ختم ہو جاتی ہے تبھی میں سچ آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔“

سارہ جو قریب ہی میز پر پھلوس کی نوکری جانے میں مشغول تھی میری بات سن کر ہنس پڑی اور ماں سے کہنے لگی۔

”آپ ان سے کسی بات کے سیدھے جواب کی توقع مت کیجئے گا۔ اسے سوالوں کے جواب میں سوال کرنے کی عادت ہے۔“

سبز جینی ہنس پڑیں۔ میں نے اپنے بارے میں انہیں مختصر بتا دیا۔ سبز جینی غور سے سنتی رہیں۔ میں نے ان سے سرتازک کے بارے میں پوچھا۔

”وہ ابھی آتے ہوں گے۔ یہ ان کی عہدوت کا وقت ہے۔ دراصل تمہارے معاملے کی وجہ سے ان میں اور سارہ میں کچھ تناؤ سا چل رہا ہے۔ اس لیے وہ کچھ اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ اس لیے ذرا دیر سے ہی آئیں گے۔“

میں حیرت سے اس بدکاری عورت کو دیکھتا رہا، کس قدر آسانی سے انہوں نے بنا کچھ لگی لپٹی رکھے سب سچ بتا دیا تھا۔ سارہ بھی یقیناً

انہی کا پرتو ہوگی۔ وہ بھی نبی کی طرح صاف دل اور سچی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو کوئی بھی بات بتا دیتا لیکن اپنے گھر کی اندرونی بات کبھی نہ بتاتا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ پھر تو آپ کو مجھے یہاں مدعو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سے باپ نبی کے بچے تناؤ مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ سارہ نے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مجھے۔ میں خود بھی تم سے ملنا چاہتی تھی۔ سارہ کبھی کسی غلط

آدمی کی حمایت نہیں کر سکتی۔ تم سے مل کر مجھے اس بات کا ایک بار پھر سے یقین ہو گیا ہے۔“

کچھ ہی دیر میں سرتازک بھی گھر کے پھوٹے سے نمودار ہو گئے۔ آج واقعی وہ اپنے رواجی لباس میں نہیں تھے۔ سر پر چھوٹی سی سفید

ٹوپی، جسم پر لمبا سا چنڈا اور ہاتھوں میں لکڑی کی بڑی سی تسبیح۔ مجھ سے انہوں نے خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر ہم موسم کی اور دھڑا دھڑکی معمول کی

باتیں کرتے رہے پھر سارہ نے ہمیں کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ سارہ اور سبز جینی نے مل کر اپنے ہاتھوں سے بہت سی

ایسی ڈشز تیار کی تھیں جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ مثلاً کھجور کا ایک خاص قسم کا حلوہ جو اناس اور ناریل کی قاشوں میں بال کر بھرا گیا

تھا۔ برن کے گوشت کے ٹکین کباب اور اس جیسی اور جانے کیا سوچا تھا۔

میں نے سبز جینی سے کھل کر کھانے کی تعریف کی اور انہیں یہ بھی کہا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سارہ بھی واقعی اتنا کچھ بنا سکتی ہوگی۔ جواب

میں سارہ صرف مسکراتی رہی۔ سرتازک نے سارہ سے کھانے کے دوران کوئی بات نہیں کی۔ کھانے کے بعد سبز جینی اور سارہ کچن میں مصری قبوہ

بنانے کے لیے چلے گئے۔ میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ گھر میں جو دو چار ملازما کیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں، انہوں نے صرف کھانا لگانے اور برتن

اٹھانے میں ماں بیٹی کی مدد کی ورنہ زیادہ تر کام خود سارہ اور سبز جینی نے ہی خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہ یہودیوں کا دوسروں

کو عزت دینے کا ایک خاص انداز تھا۔ مجھے کامران کی بات یاد آئی جو اُس نے یہاں کے لوگوں کے بارے میں بتائی تھی۔

سارہ اور جینی کے جانے کے بعد میں اور سرتازک ڈائننگ ٹیبل پر تنہا رہ گئے، انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”تمہاراظم پیپر کہاں تک پہنچا۔۔۔۔۔ مجھے اُمید ہے کہ تم کوئی بہتر پرچہ تیار کرو گے۔ کیونکہ یہ آئندہ ہمیشہ یونیورسٹی کے ریکارڈ میں رہنے

والی ایک چیز ہوگی۔" میں ان سے اس سوال کی توقع کر رہا تھا۔

"یقیناً سر میں پوری تحقیق کے بعد ہی اپنا نظریہ اس پرچے کی صورت میں جمع کراؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی کتنی اہمیت ہے۔"

"تم نے اس سلسلے میں لائبریری میں موجود کتابوں سے تو کافی مدد لی ہوگی۔"

"جی بالکل۔۔۔۔۔ نہ صرف یونیورسٹی کی لائبریری سے بلکہ شہر کی دیگر لائبریریوں سے بھی میں نے کافی مدد لی ہے۔ شہر میں اور نثرینیت پر جتنا مواد مجھے مل سکتا تھا میں نے اکٹھا کر لیا ہے۔" میری بات پر سر آؤزک نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کس کس کتاب سے حوالے جمع کیے ہیں تم نے۔"

میں نے انہیں سر ڈیوڈ رینگ کی کتاب سے لے کر اب تک اس موضوع پر چھپنے والی تمام کتابوں کے نام گنوا دیے۔ سر آؤزک کا مواد خراب ہو گیا۔ وہ کچھ تلخ لہجے میں بولے۔

"اتنے اہم موضوع پر لکھنے کے لیے تم نے ان گھنیا اور بے تحقیق قسم کی کتابوں کا سہارا لیا ہے۔ اگر تمہیں مدد کی ضرورت تھی تو مجھے کہتے نہیں تمہیں ان سے ہزار درجہ بہتر کتابوں کے نام بتا سکتا تھا۔"

"اتنے میں سارہ در سز جینی بھی قبوہ نے کر میز پر آ چکی تھیں۔ سارہ نے اپنے باپ کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر کہا۔

"پاپا بہتر ہوگا کہ ہم یونیورسٹی کی باتیں یونیورسٹی میں ہی ڈسکس کریں، یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

لیکن سر آؤزک کے لہجے کی کتنی اب بھی برقرار تھی۔

"یہ بات صرف یونیورسٹی یا لائبریری میں جمع کیے جانے والے ایک ٹرم پیپر کی بات نہیں ہے۔ یہ ہمارے عقیدے اور نظریے کی بات ہے۔ اور میں کسی کو بھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اور دوسرے لوگوں کے بیچ ممتاز اور منفرد نظر آنے کے لیے اپنے اس نظریے کا غلط پرچار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"سر میں نے بھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے یا منفرد نظر آنے کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ اور پھر میں غلط ہوں یا صحیح، اس کا فیصلہ آپ ابھی سے کیسے کر سکتے ہیں۔ پہلے میرا پرچہ تو جمع ہو جانے دیں۔ پھر میں اس پر کیے گئے اعتراضات کا جواب بھی پوری ایمان داری اور سچائی کے ساتھ دوں گا۔"

سر آؤزک نے کڑے تیوروں کے ساتھ میری بات سنی۔ پھر انہوں نے معذرت کے ساتھ اپنی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنایا اور وہاں سے اٹھ گئے۔ لیکن جاتے جاتے انہوں نے عبرانی میں سز جینی سے کہا کہ وہ دیکھتے ہیں کہ گھر میں ایک خط مہمان کو مدعو کیا گیا ہے۔ سارہ نے احتجاجی انداز میں زور سے سر آؤزک سے صرف اتنا کہا۔

"پاپا۔۔۔۔"

"سر آؤزک اٹھ کر اندر چلے گئے۔ وہ اس بات سے شاید بے خبر تھے کہ میں عبرانی زبان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ سارہ کا چہرہ مجھے سے سُرخ ہو گیا اور وہ ہیر پھٹتے ہوئے باپ کے پیچھے اس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں نے سز جینی سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے کھلے دل

سے اپنی غلطی تسلیم کی کہ ان کے شوہر کی وجہ سے بدسرگرمی پیدا ہو گئی تھی اور اس بات کے لیے انہوں نے مجھ سے معذرت کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے فوراً انہیں روک دیا۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ مجھے یہاں آ کر واقعی بہت اچھا لگا۔ آپ سے ملنا بھی زندگی کا ایک بہت خوبصورت تجربہ ہے۔ آپ کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”دراصل میں سمجھتی تھی کہ تمہارے یہاں آنے سے آئزک کو تمہارے بارے میں مزید جاننے کا موقع ملے گا۔ دوران کے اور سارہ کے بیچ میں تناؤ میں کچھ کمی آئے گی۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ میں نے آج تک پوری زندگی میں کبھی آئزک کو اس قدر بدتمیز و بدتاؤ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ یقیناً کسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔“

میں سسزپینی کا ہاتھ تھپک کر وہاں سے اٹھ گیا۔ انہوں نے باہر تک مجھے چھوڑنے کے لیے آنا چاہا لیکن میں نے انہیں روک دیا کہ ہمارے باب بڑے چھوٹوں کو یوں شرمندہ نہیں کرتے۔ میں باہر نکلا تو ہوا خشک تھی اور ہوا میں برف کے چھوٹے چھوٹے ذرے شامل ہو کر ادھر ادھر ڈرتے ہوئے گر رہے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ کے کالر اٹھا لیے اور دو رائیخوں سے بنی پکی روش پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اندر سے سارہ مجھے آؤزس دیتی اور تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اُس نے جلدی میں کوئی گرم چیز بھی اوپر اوڑھنے کے لیے نہیں لی تھی اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ کپکپانے لگی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔۔ تم مجھ سے دواغ لیے بغیر کیسے نکل پڑے۔۔۔۔۔ میں تو پاپا سے بات کرنے کے لیے دو گھنٹی اندر گیا تھا تو تم باقاعدہ رخصت ہی ہو پے۔۔۔۔۔“

”جس خضے میں تم وہاں سے نکلیں تھیں۔ مجھے نہیں لگا تھا کہ تم جلد واپس آؤ گی۔ اور تمہاری ماما بے چاری خواہ مخواہ میرے سامنے معذرتیں پیش کر کے تھک جاتیں۔ سو میں نے سوچا کہ نکل جانا ہی بہتر ہے۔ ہاں البتہ میں رات دیر گئے تھیں فون ضرور کرتا۔“

سارہ کے چہرے پر بھی خجالت سی تھی۔

”مجھے پاپا سے اس رویے کی امید نہیں تھی۔۔۔۔۔ مجھے صاف کر دینا۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔“ آج مجھے احساس ہوا کہ اس باہمت لڑکی کے اندر بھی ایک بے حد نازک سادول دھڑکتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بھٹکتی تھیں، میں نے جلدی سے کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو، یقیناً جانو مجھے سر آئزک کی کوئی بھی بات بُری نہیں لگی۔ انسان اپنے نظریات کے بارے میں جذباتی ہوتی جاتا ہے۔ وہ تو انہوں نے خود اس بات کا ذکر بھیج دیا تھا ورنہ میں اس جگہ کبھی ان سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرتا۔ تم یقیناً کرو۔ یہاں آ کر میرے دس میں تمہاری تمہاری ماما اور سر آئزک کی عزت اور زہد بڑھ چکی ہے۔ اس میں ذرا برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ اور یہ میں پورے غلوں دل سے کہہ رہا ہوں۔“

سارہ کچھ دیر تک پونجی پُچپ سی کھڑی رہی۔ میں جانتا تھا اُس جیسی وضع دار لڑکی کے لیے یہ کس قدر مشکل مرحلہ ہو سکتا تھا۔ ہوا میں تیزی آ گئی تھی اور اب باقاعدہ برف باری شروع ہو گئی تھی۔ برف کے بڑے بڑے گالے ہم دونوں کے بالوں میں چاندی سی بکھیرنے لگے تھے۔ میں نے

اپنی جیکٹ اتار کر سارہ کے کاندھوں پر ڈال دی، اور اس کے بال نکھیر دیے۔

”چلو اب تم اندر جاؤ۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے، کہیں تمہیں کچھ ہو گیا تو سہرا تڑک واقعی میرا دماغ پوندوٹی میں بند کر دیں گے۔“

میرا یہ د رکار گر رہا اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔ اس کے دل کا بوجھ کم ہوتا دیکھ کر مجھے بھی بہت سکون محسوس ہوا۔ اس نے ہلکے سے مجھے چھیڑا۔

”آج احساس ہو رہا ہے کہ تم لوگوں کو کیسے جیت لیتے ہو۔ لیکن یاد رہے پوندوٹی میں تمہاری اور تمہارے نظریات کی سب سے بڑی

مخالف اب بھی نہیں ہی ہوں۔ میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔“

میں مسکرتا ہوا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے انکیتھن آن کی اور کٹڑی سے سر نکال کر اسے جواب دیا۔

”چلو تم نے آج اتنا تو تسلیم کر لیا کہ تم کبھی نہ کبھی ہارو گی ضرور چاہے آسانی سے نہ سہی بہت ہمدرد اور جستجو کے بعد ہی سہی

اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اوداع کہا۔ جب میں گاڑی اس کے محل نما گیٹ سے باہر نکال رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر Back

view mirror میں دیکھا کہ وہ ابھی تک تیز گرتی برف میں وہیں کھڑی مجھے جاتا دیکھ رہی تھی۔ برف اس کے بالوں پر ہلکے سے گڑھے پڑے

گالوں کو چھو چھو کر زمین پر گر رہی تھی۔ جیسے طرف کی کوئی شہزادی اپنی سلطنت میں کھڑی ہو۔ میری گاڑی نے تیزی سے موڑ کاٹا اور میں رفتہ رفتہ اس

کے محل سے دور ہوتا چلا گیا۔ لندن سنسان تھا، رات گہری تھی اور سڑکیں خالی تھیں۔ میرا دوست دریائے ٹیمز بھی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ سفید برف کی

رضائی نے اسے ڈھانپ رکھا تھا۔ سڑکوں کے کنارے لمبے لمبے درخت ایک دوسرے کو کہانی سناتے سناتے چپ سے ہو گئے تھے اور حیرت سے برف

کے گالوں کو خود سے شرارت کرتا دیکھ رہے تھے۔ رات کے سنانے میں گرتی برف کا منظر اور لطف دہی لوگ جانتے ہیں جو خود کبھی رات میں چہل کی میں

کسی دیرانے میں برف گرتی دیکھ چکے ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان سے ننھے سفید گالوں کی صورت میں نور کی برسات ہو رہی ہو۔ گرتی برف کی اپنی

ایک سفید دودھی سی روشنی ہوتی ہے جیسے بہت سے جگنو بیک وقت آپ کو راستہ دکھا رہے ہوں۔ ایسے ہی بہت سے جگنو اس وقت میری دوزنی گاڑی

کے آس پاس گر رہے تھے، مجھے اس وقت پھپھن میں ثانی اماں سے سنی ایک بوری بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جس کے بول کچھ یوں تھے۔

”چند اکوڑھوٹے کبھی۔۔۔“

تارے نکل پڑے

طلوں کی نیند چھوڑ کر

سارے نکل پڑے۔۔۔“

میری گاڑی سفید برف سے بھری سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ میں بھی تو اک ٹوٹا تارہ تھا۔ جو اپنے چاند سے چھڑ کر جانے کب سے

ڈھونڈ رہا تھا۔

☆☆☆

## وہ ایک ملاقات

اس روز صبح سے ہی آسمان پر بادلوں کے کتلے شریر بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سحر ستمبر کی میٹھی سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ دھوپ پٹی تہ زت کھو چکی تھی اور سائے لمبے اور سرد تھے۔ ہلا خرابادلوں کے ان شریر کتلوں نے ایک دوسرے کو پکڑ لی یا دوسرا آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھک گیا۔ نہیں اس وقت گیارہ بجے والی مال گاڑی سے مال انروار ہاتھاجب پہلی بوند نے میرا ہاتھ چوم لیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں آسمان سے مینہ کی جھڑی برسا شروع ہو گئی۔ مزدوروں نے بھاگ کر ادھر ادھر چھپنے کی جگہ تلاش کرنا شروع کر دی۔ غفورے نے ایک برآمدے کے ککڑی اور ٹین سے بنے چھت کے نیچے پہنچ کر مجھے آواز دیں دینا شروع کر دیں کہ میں وہاں کھڑا بھیگتا نہ رہوں بلکہ برآمدے کی طرف چلا آؤں۔ جانے لوگ بارش سے کیوں چھپتے ہیں۔ بارشیں تو تن اور من کو ہلک کر اچلا کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔

اسنے میں دُور سے صدیقی صاحب کے دفتر کا چنڑا سی جھتری سر پر تانے بارش میں سڑپ سڑپ سے لیے ڈگ بھرتا ہو پیٹ فارم کے آخری سرے سے نمودار ہوا۔ اور میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

”ہمارا بابو۔۔۔ صدیقی صاحب کے دفتر میں آپ کا فون آیا ہے، وہ بلاتے ہیں آپ کو۔“

”میرا فون۔؟“

میں حیرت سے بڑبڑایا۔ لیکن زیادہ سوال جواب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں اس کے پیچھے ہی چل پڑ۔ غفورے کو ہاتھ کے اشارے سے دُور لے سے سمجھایا کہ میرا فون آیا ہے۔ صدیقی صاحب کے دفتر تک پہنچتے پہنچتے میں پورا شرابور ہو چکا تھا۔ اس لیے دروازے کے باہر کمرے ہو کر ہاتھ خود کو جھڑنا پڑا۔

اندراغل ہوا تو دو چار ملقاتی یا شاید مسافر صدیقی صاحب کی میز کے گرد جمع تھے۔ صدیقی صاحب کے کمرے میں ایک سی نمبر کی دو لائینیں تھیں۔ ایک فون ان کی میز پر اور دوسرا سامنے بیٹھے ہیڈ کلرک میز پر رکھا تھا۔ زیادہ تر فون ان کا ہیڈ کلرک بشیر ہی وصول کرتا تھا۔ لیکن اس وقت دونوں ہی فون خاموش کر ڈیل پر پڑے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے بشیر کی طرف دیکھا۔ صدیقی صاحب نے فائلوں پر سے نظر اٹھائے بغیر مجھ سے کہا۔

”لائن لمبی ہوتی جا رہی تھی، میں نے دوبارہ کرنے کا کہا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی کال آتی ہی ہوگی۔“

میں وہیں ہیڈ کلرک کی میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بشیر نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”کسی لڑکی کا فون تھا۔“

میں نے چونک کر بشیر کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر ایک مصدوم مسکراہٹ کے علاوہ دیگر کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ کون سی لڑکی تھی جو



مجھے صدیقی صاحب کے نمبر پر فون کر رہی تھی؟

باہر موسلا دھار بارش مزید تیز ہو گئی تھی اور کمرے کی کھڑکی سے باہر جہاں تک اسٹیشن اور پلیٹ فارم دکھائی دیتا تھا وہاں ہر چیز جیسے دھل سی گئی تھی۔ کالی چھتریاں تانے لوگ ادھر ادھر تیزی سے چلتے ہوئے گزر رہے تھے، کچھ دُور اندیش جوج کے وقت موسم کے تیز دیکھ کر گھر سے نکلتے تھے اور وہ اپنی بی بی برساتیاں پہنے، کار اٹھائے دوسروں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھو ام جانے تھے کہ آج بارش ہوگی۔ اتنے میں اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں اپنے خیالات میں اس قدر مگن تھا کہ بس اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔ بشیر نے فون اٹھایا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی جی۔۔۔۔۔ یہ لیس بات کریں۔“

بشیر نے فون میری طرف بڑھایا، میں نے ریسپورکان کے ساتھ لگایا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ہما بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے ایک نازک اور ٹھنکی سی آواز ابھری۔

”جی۔۔۔۔۔ ہیلو۔۔۔۔۔“

”جی کون بول رہی ہیں۔“

”میں۔۔۔۔۔ میں حیا بول رہی ہوں۔“

میرے ہاتھ سے ریسپورگر کرتے کرتے ہچکا۔ حیا۔۔۔۔۔؟ فون پر۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔؟ اس وقت۔۔۔۔۔؟

”آپ۔۔۔۔۔ آپ کو یہ نمبر کیسے۔۔۔۔۔؟ میرا مطلب ہے، سب ٹھیک تو ہے نا۔“

حیا کچھ جلدی میں اور کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔

”جی۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ کیا آپ آج شام چار بجے بذاتی حویلی آ سکتے ہیں۔“

”بُذانی حویلی۔۔۔۔۔ جی ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“

”کوئی سول نہ پوچھیے گا، میں مساپوں کے ہاں سے بڑی مشکل سے فون کر رہی ہوں بس آپ تک ایمان آپی کا یہ پیغام پہنچانا تھا۔“

دیکھیں وقت پر آجائے گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ باقی بات وہیں ہوگی۔ آئیے گا ضرور۔ خدا حافظ۔

ایمان کا پیغام۔۔۔۔۔ یا خدا۔۔۔۔۔ یہ ٹرکی کیا کہہ رہی تھی۔ کیا ایمان بھی وہاں آنے والی تھی، میں نے فوراً اسے روکنے کے لیے کہا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ہیسو میری بات۔۔۔۔۔“

لیکن دوسری طرف سے لائن کٹ چکی تھی۔ باہر زور سے بادل گر جا اور پھوار کا ایک تیز ریلا ہوا کے ایک شدید جھونکے کے ساتھ کھڑکی سے آ کر ٹکرایا۔ کھڑکی کے پٹ کھل گئے اور پانی کی بوندیں اندر کمرے میں بہت کچھ بھگو گئیں۔ بشیر نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی بند کی۔ میں اب تک ویسے ہی گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ یہ حیا کیا کہہ گئی تھی۔ ایمان نے مجھے بُذانی حویلی پہنچنے کا پیغام کیوں دیا۔۔۔۔۔؟ کیا واقعی وہ خود بھی حویلی آ رہی

تھی۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تین ہفتوں کے بعد اس کی رخصتی ہونے والی ہے۔ وہ ایسے ہی گھر سے کیسے نکل سکتی ہے، تو پھر۔۔۔۔۔ حیانے مجھے حویلی یہ کہہ کر کیوں بلایا ہے کہ یہ ایمان کا پیغام ہے۔۔۔؟ ہو سکتا ہے ایمان نے میرے اس دن کے غالب والے شعروں کے بدلے میں کوئی پیغام دیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن کیا۔۔۔؟۔۔۔۔۔

کچھ دن سے صدیقی صاحب نے مجھے ایک چھوٹا سا لکڑی کا بنا ہوا ہٹ الاٹ کر دیا تھا جس کی چھت ٹین کی تھی۔ یہ اسٹیشن کے عقب میں درختوں بھری اک سڑک کے اختتام پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں ایسے بہت سے ہٹ ریلوے کے چمڑے اور کنوارے افسروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ جیسے ان ہٹس میں سے یہ ایک ہٹ خالی ہوا تو صدیقی صاحب نے عارضی طور پر میرے نام الاٹ کر دیا۔ ٹین بشیر کی میز سے فون بن کر گرم گرم سا تھا اور اپنے ہٹ میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹین کی چھت پر بارش کی بوندیں اپنا مخصوص جلتے رنگ بھاری تھیں۔ لگتا تھا آج آسمان نے بھی کھل کر برسنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں بارش اور اس ٹین کے چھت کے جلتے رنگ کا خوب لطف لیتا کیونکہ بچپن میں ٹین اور کامران ایسی بارش میں فوراً میری دادی ماس کی حویلی کے ٹین کے چھت والے کمرے میں بھاگ کر آ جاتے اور پھر ہم ٹین کی چھت پر گرنے والی بارش یا پھر اولوں سے پیدا ہونے والی آوازوں کو میز بجا کر مختلف دھنوں میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کرتے اور چیخ چیخ کر اپنے بچپن کے گانے گاتے تھے۔

لیکن اس وقت میرا سارا دھیان حیا کے فون کی طرف تھا۔ میری اپنی سوچوں میں دن کے تین بج گئے، میں اس وقت زور سے چونکا جب اسٹیشن کے بڑے گھڑیل نے تین بجے کا گھنٹہ بجایا۔ ٹن، ٹن، ٹن۔۔۔۔۔

اوہ۔۔۔۔۔ اس وقت تک تو مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ اتنی تیز بارش میں جانے کوئی سواری بھی ملتی ہے یا نہیں۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ ابراہیم میری اکلوتی پینٹ اور شرٹ حسب معمول دھلا کر اور ریلوے کے دھوپ کی سے استری کر دیا کر کے میں لگا گیا تھا۔ میں نے ہمدی سے کپڑے تبدیل کیے۔ لیکن پھر مجھے خود پر ہی ہنسی آ گئی۔ میں نے ایک بیگ جو اجو میری دردی کی صورت میں تھا، وہ تو اتار دیا تھا، لیکن میرے پاس بھلا کون سی چھتری تھی جو میں اس دوسرے جوڑے کو بھی بھیجنے سے بچا پاتا۔ بہر حال، اب یہ وقت چھتری ڈھونڈنے کا نہیں تھا۔ میں تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا پیٹ فارم جانے والی پٹری سے ہوتا ہوا پیٹ فارم تک جا پہنچا۔ بارش کی وجہ سے آس پاس کوئی دکھائی نہ دیا۔ میں نے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے باہر نکل کر کسی سواری کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ایک آدھ تاگہ اور ایک دو ٹیکسیاں وہاں سے گزریں لیکن سبھی میں سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ خیر دیکھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر وقت ضائع کرنے سے بہتر یہی سمجھا کہ میں پیدل ہی بڑی سڑک پر چل پڑوں۔ شاید راستے میں کوئی سواری مل ہی جائے۔ بارش میرے پورے وجود کو بار بار کسی چھتری کی طرح چھل رہی تھی۔ اسٹیشن سے کافی دور آنے کے باوجود مجھے ابھی تک کوئی سواری نہیں ملی تھی۔ اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں وقت پر نہانی حویلی نہیں پہنچ پائوں گا۔ کیونکہ ساڑھے تین تو مجھے یہاں شہر میں ہی ہو گئے تھے۔ مجھے خود پر شدید غصہ آنے لگا کہ میں پہلے ہی اسٹیشن سے کیوں نہیں نکل آیا تھا۔

پھر جیسے چاک ہی قدرت کو میری بے بسی اور محتلاہٹ پر رحم آ گیا۔ میں اس وقت ٹین روڈ کی بڑی سڑک سے ہوتا ہوا اچھوٹنی کے

علاقے میں داخل ہو چکا تھا اور اسٹاف کالج روڈ کے قریب پہنچنے والا تھا کہ اچانک ایک موٹر سے ایک خالی تانگہ جوشیدہ کسی فوجی سواری کو اسٹاف کالج چھوڑ کر واپس جا رہا تھا، نمودار ہوا۔ میں نے فوراً تانگے والے کو روکنے کا اشارہ کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی روپے ہاتھ میں آئے انہیں نے اسے تھمادیے اور اسے تیز اور جلدی پڑانی حویلی کی طرف چلنے کو کہا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور پکی دھلی سڑک پر تانگہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ آس پاس گھنے بادلوں اور کان گٹا کی وجہ سے گہری شام جیسا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ایسے میں جب بجلی زور سے جھکتی تو یوں لگتا کہ جیسے کسی نے پل بھر کے لیے تمام ماحول پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ بادل ویسے ہی زور زور سے گرج رہے تھے اور برقی بارش کی بو چھڑ میں بھاگتے ہوئے پانی سے شرابور گھوڑے کے نتھنوں سے ہر لپٹی سانس کے ساتھ گرم بھاپ کے مرغولے سے اٹھ رہے تھے۔ پکی سڑک سے تڑکڑا گھڑا گیلی بجتی زمین پر چھ پانی کے گڑحوں اور کچھڑ میں چھپ چھپ کر تانہ پڑانی حویلی کے راستے پر رواں دواں تھا۔

تانگے والے نے اپنے عواذ نے کا پورا حق ادا کیا اور مجھے ٹھیک چار بجے حویلی کے پھاٹک پر اتار دیا۔ وہں پہلے ہی سے ایک اور تانگہ بھی کھڑا تھا۔ لگتا تھا کوئی سواری آئی تھی جس نے موسم کے تہور دیکھ کر اسے واپسی کے لیے یہیں روک لیا تھا۔ میرے تانگے والے نے بھی مجھے پیش کش کی کہ نہیں اگر واپسی کا راہ رکھتا ہوں تو وہ یہیں انتظار کر لے گا۔ میں نے اسے بھی روکنے کا کہہ دیا۔ دونوں تانگے والے آہستہ میں خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ میں برقی بارش سے بھیگا لکڑی کا پھاٹک کھول کر حویلی میں داخل ہو گیا۔ ایک عجیب سا ناٹا اور ایک عجیب سی اُدسی چھٹی ہوئی تھی پورے ماحول پر۔

اچانک حویلی کا پڑا چوکیدار تھ بخش کسی جانب سے نمودار ہوا اور مجھے سلام کر کے بتانے لگا کہ محبت بی بی بھی بڑے گوس کرے کی طرف گئی ہیں۔ پڑانی حویلی کے یہ سارے سزا نے نوکر میرے بچپن کے گواہ تھے اور شاید سبھی میرے راز دار بھی۔ ان سبھی کو یہ بتا تھا کہ میں نے گھر چھوڑ دیا ہے اور نہیں شکر و نعمت وغیرہ سے ملنے یہاں آتا ہوں۔ سبھی یہ بھی جانتے تھے کہ میرے گھر والے میری یہاں آمد کے بارے میں ہر خبر نہیں تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے جا کر باہا یا ای کو میرے بارے میں خبر نہیں دی تھی۔ شاید اس طرح سے ان سب نے میرے گھر چھوڑنے کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی۔

میں چوکیدار سے مل کر آگے والا ان کی طرف بڑھ گیا جس کے سرے پر برآمدہ تھا جس کے سامنے گرمیوں میں ایک قطار سے لکڑی کی بڑی بڑی سے پٹکیں ڈلی رہتی تھیں۔ اس وقت بارش کی وجہ سے تمام پتوں کو گول سمیٹ کر اوپر بندھی برآمدے کی ڈوری سے باندھ دیا گیا تھا۔ برآمدے کی چھت پر بنے پرناؤں سے بارش کا شیل پانی پوری رفتار کے ساتھ نیچے گر رہا تھا اور اینٹوں سے بنے گمن میں غنی ہوئی چھوٹی مکی اینٹ کی نالیوں سے ہوتا ہوا مختلف کیاریوں میں گر رہا تھا۔ فضا میں صرف ایک ہی پانی گرنے اور بہنے کی آواز تھی باقی سب کچھ جیسے جامد تھا۔

جیسے ہی میں گول کرے والے برآمدے کی طرف مڑا۔ مجھے برآمدے کے کونے میں سفید چادر میں لپیٹی حیا دکھائی دی جو برآمدے کی چھت سے گرتے پانی کے ایک پرنا لے سے غنی پھوار کو اپنی پتیلی میں جذب کرنے کی کوشش میں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، اور جلدی سے مجھے سلام کیا۔ میں اس کی طرف چلا آیا۔

”آپ اس موسم میں یہاں تک کیسے پہنچ گئیں۔ سب خیریت تو ہے؟“  
 وہ ہلکے سے مسکائی۔

”ہم تو عام اور اچھے موسم میں بھی گھر سے نہیں نکل پاتے، لیکن آپ کی ان چار لائٹوں نے آنے پر مجبور کر دیا۔ آپ نے کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔“

مجھے اس کے جواب سے کچھ 'بھمن' سی ہوئی۔

”میں سمجھا نہیں۔۔۔ آپ۔“

پھر مجھے نور انکسیت کا خیال آیا۔

”گھبت کہو ہے۔ آپ کیلے یہاں کیا کر رہی ہیں۔“

اُس کی آنکھوں میں اب وہی مخصوص ی شرارت تھی۔ وہ سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”میں اکیلی نہیں ہوں، جائے مل لے۔۔۔۔۔“

میں اسی حیرت اور الجھن میں اس نازک اندام کو دیکھتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اگر محنت اندر کرے میں تمہی تو پھر وہ یہاں باہر

برآمدے میں برقی پارٹس میں کیوں کمزری تھی۔ بجلی بھی شاید پارٹس آتے ہی جا چکی تھی۔ اندر کرے میں دو چار ضعیف روشن تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا۔

تو چند لمحے تو مجھے اندھیرے میں کچھ نظری نہیں آیا۔ دفعتاً دل زور سے گرجا اور بجلی کی لپک نے بل بھر کے بے سب کچھ روشن کر دیا۔ اندر کمرے میں

دوبار کے ساتھ سٹری بیٹھی ہوئی ریشمی وجودی ایک تعزیری میں پل بھر کے لیے ایک جنبش ہوئی۔ اس کے ساتھ حلق پر رکھی موم حق کا شعلہ زور سے

پھر کا اور کسی کے ماتھے پر وہی اک مخصوص شرارتی سی لٹ لہرائگی۔ سارا کمرہ اس کی جھپکے نور سے روشن ہو گیا۔ وہ ایمان تھی۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہ

ایمان ہی تھی۔۔۔۔ مجھے جیسے سکتا ہو گیا تھا۔ میں وہیں دروازے کے پاس اس معجزے کے ہو جانے کا یقین کرنے کے لیے کھڑا کھڑا رہ گیا۔

شید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ شید نہیں۔۔۔۔۔ یقیناً کوئی خواب ہی تھا۔ میری تقدیر مجھ پر اتنی مہرباں تو اک زمانے سے نہ تھی۔

لیکن وہ ایمان یحییٰ۔ سر تا سر مجسم ایمان، اُس نے سادہ سا سفید لباس پہنا ہوا تھا اور ایک کالی شال میں ڈھکی ہوئی تھی۔ شاید ہر کھڑے

تاتلے میں ایمان اور حیدر وغیرہ بھی آئی تھیں۔ کیونکہ ایمان کے ماتھے پر اور بالوں میں ابھی تک برسی ہوندوں کے ستارے ٹھنڈے تھے۔ ماتھے کی

لٹ بھی بیٹگی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کو نے میں بیٹھی حسب معمول اپنے نازک پاؤں کے ناخنوں سے نیچے نیچے قلمین کو کرید رہی تھی۔ اُس نے دیرے

سے ویسے ہی سر جھکائے مجھے سلام کیا۔ چند لمحوں تو میں اسے کچھ بول ہی نہیں پایا، جیسے میری آواز ہی گنگ ہو گئی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے میری زبان

— 160 —

"آپ۔۔۔۔۔؟ یہاں۔۔۔۔۔؟ ظہر ہے۔۔۔۔۔ کچھ دیر لگے گی مجھے اپنی قسمت اور خوش نصیبی پر یقین کرنے میں۔"

پہلی مرتبہ میں نے ایمان کے چہرے پر حیا کی ایک نرغ لہر کو گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، وہ جانے

کیا کہنا چاہتی تھی لیکن مجھے یوں ہارش میں بھیجا ہوا دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔

”آپ۔۔۔۔۔ آپ تو بہت بیگ چکے ہیں۔ میں تجھت سے کہتی ہوں آپ کے لیے کوئی تولیہ وغیرہ۔۔۔۔۔“

اُس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلدی سے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ جیسے مجھے ڈرتا کہ اگر وہ اس کمرے سے نکل گئی تو میرا یہ زندگی کا سب سے خوب صورت خواب اُدھر اسی ٹوٹ جائے گا۔

”پلیز۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ آپ بیٹھی رہیں۔۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ کچھ دیر میں خود ہی سب خشک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ آپ کہیں نہ جائیں۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔“

میں جلدی سے دروازے سے بہت کر اُس کے قریب آ گیا۔ ایمان اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ اب وہ مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اتنے قریب۔۔۔۔۔ کہ میں اس کے وجود کی لرزش کو یہاں سے محسوس کر سکتا تھا۔ میں وہیں اس کے قریب بیٹھ گئی، اور بیٹھتے وقت میں نے اس زبردست جہاں کے حجاب بھرے سینے کے انداز کو بھی محسوس کیا۔ یہ لڑکی تھی، یا بھولوں بھری اک لگتی ڈال۔۔۔۔۔

چند لمبے ہم بونی خاموش بیٹھے رہے۔ وہ بونی سر جھکائے بیٹھی اپنے وجود کی لرزش پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور میں پکلیں جھپکے بنا اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پکلیں جھپکے کا وقت بھی اس وقت مجھے بے حد زرا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کو دیکھوں یا اس سے بات کروں۔ اتنی مشکل تو مجھے کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی بیچ کی خاموشی کا خلا صرف باہر برقی تیز بوندیں پورا کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ جیسے ہم دونوں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ہم دونوں کے لفظ ہی خاموش ہو گئے تھے۔ پھر اُس نے اپنے سر میں ہاتھ میں پکڑا وہ تہہ کیا ہوا کاغذ کا ٹکڑا نکالا، جس پر میں نے اس دن وہ چند شعر لکھے تھے میں جانتا تھا تجھت اس تک یہ کاغذ کسی نہ کسی طور ضرور پہنچائے گی۔

”آپ نے یہ کیا لکھ بھیجا تھا مجھے۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ میں نے تو آپ سے صرف اتنی درخواست کی ہے کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ مگر واپس چلے جائیں۔“ آپ میری بات مان کیوں نہیں لیتے۔“

ہوتے ہوئے اُس کی آواز ہلکی سی بھڑکی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے نازک سے ہاتھوں کی پشت پر نیلی نیلی ریگس نظر آ رہی تھیں اور چہرے پر بھی ایک جیلا پن سا تھا۔

”آپ تو مجھے بتا رہی ہیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

اُس نے مجھ پر اک نظر ڈالی۔ اک زخمی سی نظر جس میں نہ جانے کیا کچھ چھپا تھا۔

”میں یہاں آپ سے صرف یہ وعدہ لینے آئی ہوں کہ آپ اپنے آپ کو مزید سزا نہیں دیں گے اس دن۔ آپ نہیں جانتے اس دن آپ کو نیشن پر دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو کتنا ملامت کیا تھا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ نہ آپ مجھے دیکھتے اور نہ۔“

”خدا کے لیے ایسا مت کہیے۔۔۔۔۔ آپ کو دیکھنا میری زندگی کا سب سے حسین حادثہ تھا اور آپ کی محبت میری اس بے معنی زندگی کا سب سے حسین تجربہ ہے۔ اس محبت نے مجھے آپ سے ملوا دیا۔۔۔۔۔ ورنہ میں تو بنا خود کو پہچانے ہی اس دنیا سے چلا جاتا۔۔۔۔۔ اب مجھے اپنی

زندگی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ موت بھی آئی تو۔۔۔۔۔“

میری بات اس نے تڑپ کر کاٹ دی۔

”آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں، کیوں مجھے میری نظروں میں بار بار گراتے ہیں۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔“

وہ اپنی بات پوری کرنے سے پہلے ہی رو پڑی۔ دو مونے مونے آنسو اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے چھلکے اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی مٹی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی تھیلی پر انہیں سولیا۔ اور پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس جذبے کے عالم میں، مٹی نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے اس کے دونوں کوئلے جیسے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں قہم لیے۔ باہر بادل زور سے گرے اور بارش کی جھڑی اور تیز ہو گئی۔ باہر آسمان رو رہا تھا اور اندر ہم دونوں۔ جانے اس کے ہاتھ کبڑے ہی خود میرے اندر سے یہ آنسوؤں کا سیلاب کہاں سے باہر اُٹھ پڑا۔ بجائے اس کے کہ مٹی، اسے چپ کر داتا خود میری آنکھوں سے بھی آنسو پٹپٹ کرنے لگے۔ اس کے نرم ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے۔ وہ سر جھکائے تیغی تھی، کیا سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے لیے اس سے زیادہ حسین، اور کسی گھڑی کی تسمیہ کی جاسکتی تھی؟

ایمان نے نظر اٹھ کر بیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اس کے حسن کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی ستارہ جبین، بڑی بڑی کالی آنکھوں ستواں سی چھوٹی ناک اور لال زمرہ جیسے نازک سرخ لیوں کی پتھریوں، ٹھوڑی کاخم جیسے کسی مصدر نے بڑی ادا سے رنگوں کو ایک مخصوص زاویے پر اکرا کر موز دیا ہو۔ کہیں بھی تو کچھ کی نہیں تھی۔ اک جب سا نور تھا اس مہر رخ کے چہرے پر۔ مٹی نے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں سے اس کی آنکھوں کے پھیلے کنارے پر پونچھ ڈالے اس نے دیرے سے پھر کہا۔

”آپ میری بات، مٹی کے نام نہ دے۔“

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا نام مجھے اس قدر مقدس، اس قدر محترم اور اس قدر خوابناک محسوس ہوا کہ پہلی مرتبہ اس نے میرا نام پکارا تھا۔

”اگر تمہیں اس سے خوشی ملتی ہے تو میں تمہاری خاطر یہ بھی کرگزروں گا۔“ میرے منہ سے اپنے آپ اس کے لیے تم کل گیا۔ اس نے دیرے سے اپنے ہاتھ مجھ سے چھڑائے اور اپنے دوپٹے کے سر پر لگی گانتھ کھول کر نہ جانے کیا چیز تھیلی میں بھری، پھر اس نے تھیلی میرے سامنے کی اور کھول دی۔ اس کی تھیلی پر وہی دھوئی جلمکا رہا ہے تھے جو میں نے نکبت کے ہاتھ اُسے واپس بھجوائے تھے۔

”یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ کی جی ضد تھی تاکہ میں خود انہیں آپ کو واپس کروں۔ آج میں نے آپ کی یہ ضد بھی پوری کر دی۔ اب انہیں اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔“

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پھر چمک اٹھیں۔ اس نے جلدی سے اپنا سر گھٹنوں میں چھپالیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس گل اندام کو کیسے سنبھالوں۔۔۔۔۔ کیا تسلی دوں۔ یہ تو مجھ سے زیادہ مکالمات نظر آ رہی تھی۔ میں نے دونوں موتی اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں چوما اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

”ایمان۔۔۔۔۔ پلیز چپ ہو جاؤ۔ یہ دو موتی میرے لیے دو جہانوں کی تمام نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی مجھے کیا دے



گا۔ کچ کھوں تو آج مجھے اپنی محبت بُری لگ رہی ہے۔ اس نے مجھے تو رونا سکھایا دیا تھا۔ آج تمھاری آنکھوں میں بھی آنسو بھر دیے ہیں۔ واقعی۔۔۔ بہت بُرا ہوں میں۔۔۔ اور بہت بُری ہے میری محبت۔“

اُس نے تڑپ کر سر اٹھایا اور اضطرابی طور پر میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میری بات کا ناپا جاتی ہو۔ مجھے اپنی محبت کو بُرا بولنے سے روکنا چاہتی ہو۔  
 ”ایسے نہ کہیں، اگر کوئی بُرا ہے تو صرف میں ہوں۔۔۔ اگر کوئی قصور دار ہے تو صرف میں ہوں۔۔۔ میں آپ کی محبت کے بدلے کچھ نہیں دے پائی آپ کو۔۔۔ آپ نہیں جانتے حماد۔۔۔ میں کتنی مجبور ہوں۔۔۔ کتنی بے بس ہوں۔۔۔ ابانے ساری زندگی کسی خوشی کا منہ نہیں دیکھا۔ میں اور حیا ابھی بہت چھوٹے تھے جب ہمارے بڑے بھیا آٹا خانہ پکاری کا شکار ہو کر ہم سب سے منہ موڑ گئے۔ ابان کا غم ابھی تک دل سے نہیں نکال پائے۔ انہوں نے مجھے اور حیا کو دنیا کی ہر دولت لا کر دی جس کی کوئی اولاد خواہش کر سکتی ہے۔ خود چوہہ لگے کپڑے پہنتے رہے لیکن ہمیں کبھی کسی سخت وقت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بھیا کے بعد انہوں نے اپنی ساری تو تھاوت مجھ سے وابستہ کر لی تھی۔ تبھی انہوں نے گھر پر ہی مجھے دنیاوی اور دین کی ہر تعلیم سے آراستہ کیا۔ وہ مجھے ساری دنیا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئی کتابیں لا کر دیتے ہیں۔ مجھ سے مسائل پر بحث کرنے میں انہیں سب سے زیادہ مزہ آتا ہے۔ میں ہی ان کا سارا جہاں ہوں۔ میں ہی ان کا دن ہوں۔۔۔ میں ہی ان کی رات ہوں میرے سفید دامن پر ایک دھبہ ان کی جان سے لگے گا۔ وہ آپ کی طوفانی محبت سے بہت گھبرا گئے تھے۔ تبھی انہوں نے غلٹ میں میرا رشتہ بھی طے کر دیا ورنہ وہ ابھی مجھے مزید پڑھانا چاہتے تھے۔ میری۔۔۔ اے کا داغ لہ بھی بھیجا جا چکا تھا۔ لیکن آپ کی دیوانگی، آپ کے جنون کے آگے سب بہہ گیا۔“  
 میں چپ چاپ خاموش نہت بناس سنگ مرمر کے حسین مجسمے کے لبوں سے لفظوں کے موتی گرنا دیکھ رہا تھا۔  
 ”کیا تم بھی میری محبت، میرے عشق، میری دیوانگی، میرے جنون کو غلط سمجھتی ہو۔“

میرے ہاتھ پر ایمان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ مجھے لگا وہ میرے ہاتھوں کو تمام کر آج میری روح ہی کھینچ لے گی۔۔۔۔ ”شروع میں جب آپ نے غلٹ کے ذریعے مجھے اس حویلی میں بات کرنے کے لیے بلایا تھا تب مجھے واقعی بہت بُرا لگا تھا۔ میں بھی اب کی طرح ایسی باتوں کو نہایت بُرا سمجھتی تھی۔ مجھے بھی اُس وقت آپ کی وہ سب کوششیں کسی امیر زادے کا اپنا دل بہلانے کی ترکیب ہی لگیں۔ پھر جب ایک دن آپ کے گھر والوں نے اہا کے ساتھ بُرا سلوک کیا تو نہیں بہت روئی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کے قصور کی سزا ہمیں کیوں نہ دی۔ پھر غلٹ سے پتہ چلا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت میں نے اسے آپ کا ایک جذباتی فیصلہ سمجھا تھا اور یہی سوچتی تھی کہ دو چار دن میں آپ گھر واپس آ جائیں گے۔ لیکن پھر میں نے اہا کو دوبارہ بہت پریشان دیکھا۔ جس دن آپ ہمارے گھر میرا رشتہ مانگنے آئے تھے اس دن کے بعد سے میں نے آج تک اہا کو کبھی چین کی فینڈ سوتے نہیں دیکھا۔ ساری ساری رات ٹھیلے رہتے تھے۔ میری اماں ایک سیدھی سادھی عورت ہیں جو صرف رو کر ہی اپنے شوہر کا دکھ بانٹ سکتی ہیں۔ پھر عبد اللہ نے بتایا کہ آپ نے اہا کی مسجد میں آنا شروع کر دیا ہے۔ جانے کیوں۔۔۔۔۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی عبد اللہ نے جب بھی اور نہ ہی آج تک آپ کے بارے میں کوئی سخت لفظ استعمال کیے ہیں۔۔۔۔۔ میرا دل اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ کسی اجنبی کے لیے، جس سے آپ کی زندگی بھر میں دو مہا قاتلین بھی نہ ہوئی ہوں، اس کے لیے کوئی اس طرح ڈنڈا تیاگ سکتا ہے۔

لیکن پھر وہ ہو کر رہی رہا جسے میرا دل اس دن تک جھٹلاتا رہا تھا۔ اس دن آپ کو ریلوے اسٹیشن پر محدود کے حصے میں دیکھ کر ایک ہی لمحے میں میری ساری زندگی کا فخر، میری ساری زندگی کا غرور، میرے سب مان، پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو گئے۔ آپ کی محبت کسی بے لگام آنندگی کی طرح آئی اور ایک ہی جھٹکے میں میرے دل کے برسوں سے بند کواڑ توڑ کر اندر براعتان ہو گئی۔ میں کچھ بھی تو نہیں کر پائی۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ یہ محبت تو اس دن سے کہیں نہ کہیں میرے دل میں ہی پل رہی تھی جس دن آپ نے ہمیں اس حویلی کی لائبریری میں میرا رستہ روکا تھا۔ لیکن تب شاید میں اس جذبے سے اس قدر ناواقف تھی کہ اُسے پہچان نہیں پائی۔ لیکن اس دن اسٹیشن پر آپ نے مجھے مار ڈالا۔ تب سے اب تک مجھے ایک پل بھی قرار نہیں آیا۔ میری ہر وقت یہی سوچتی ہوں کہ یہ کیسا جذبہ ہے جو پل میں شہنشاہ کو فقیر اور فقیر کو شہنشاہ بنا دیتا ہے۔ یہ کیسا درد ہے جو دکھ کی تو نہیں دیتا لیکن ہر آنی جاتی سانس کے ساتھ دل کو چیرتا رہتا ہے۔ کتنا بے بس کر دیا ہے اس جذبے نے مجھے۔۔۔۔۔ کتنا مجبور۔۔۔

میں حیرت سے گنگ اس مہتاب کو سنتا رہا، اس کی پلکوں سے گرتے موتی چتر رہا۔ وہ اس وقت مجھے پریوں کی کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی جس کی ہاتھیں میرے لیے کسی الف لیوی داستان سے کم نہیں تھیں۔ ان چند لمحوں نے ہی میری بے توقیر محبت کو کس قدر محترماً بنا دیا تھا۔ میری اس لاحاصل جدوجہد کو کتنا عظیم اور کتنا معنی خیز بنا دیا تھا۔ وہ بولتی رہی۔

”اور پھر رہی سہی کسر اس دن آپ کے اُن دوا شعار نے پوری کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں آپ کو زندگی بھر کبھی اپنی حالت کی خبر نہ ہونے دوں گی۔ کبھی آپ سے نہیں ملوں گی کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔۔۔ اس دن ان دو لائٹوں نے میرا اندر ہاٹل چمٹ دیا۔ وہ شعر پڑھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس شخص کو بنا کچھ کہے چلے جانا اس کی اس لازواں محبت کی توجہ نہ ہوگی۔ شاید مجھے اسی طرح آپ سے ملنا تھا، چاہے یہی اور آخری مرتبہ ہی کسی۔“

ہا ہر زور سے بجلی کڑکی، ایک لمحے کے لیے کمرے میں اتنی روشنی ہو گئی کہ میں نے اس کے لرزتے لبوں پر جمی شبنم کے قطرے بھی دیکھ لیے۔ اُس نے بتایا کہ محبت سے ششیں، سڑکے کمرے کا فون نمبر معلوم کروانے کے بعد انہیں آج موقع ملا تھا کہ وہ حیا کے ذریعے پڑوس کے، سڑک حسب کے گھر سے فون کروائے کیونکہ مولوی صاحب دو دن کے لیے شہر سے باہر کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے۔ ایمان نے بتایا کہ یہاں تک پہنچنے میں اُسے کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے یہ صرف وہ ہی جانتی ہے اور اگر ایسے میں حیا اور محبت اس کی مدد نہ کرتیں تو اس کا مجھ سے یوں ملنا ناممکن تھا۔ جانے اتنے دنوں میں اس نازک اندام پر کیا کچھ گزر چکی تھی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ بات کرتے ہوئے بھی باقاعدہ اس کی سانس پھول ہی جاتی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا، اک سیدھی سادھی مصوم لڑکی کو میں نے یہ کس بُرے خاں راستے پر گھسیٹ دیا تھا۔ وہ جس کے کول قدم پھولوں کی پتھریوں پر پڑیں تب بھی ان کے چھل جانے کا ڈر ہو۔ اسے میں نے کانٹوں پر چلنے پر مجبور کر دیا تھا، محبت کا زہر اس کے رگ و رپ میں سرایت کر چکا تھا۔ ہاں۔۔۔۔۔ سارا قصور ہی محبت کا تھا۔ میں تو خود اس کی طرح، اس سے کہیں زیادہ بے بس تھا۔ اور پھر قصور وار صرف محبت کو ہی کیوں ٹھہرایا جائے؟۔۔۔۔۔ اصل قصور وار تو وہ تھا جس نے ہم دونوں کے دلوں میں اس محبت کا بیج بويا، اسے پروان چڑھایا اور اس زہریلی امرتیل کو اس قدر تیار کر دیا تھا کہ آج ہم دونوں اس کے زہر سے بے حال تھے۔ جاں لب دم تھے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ سارا قصور اُسی کا تھا،

جو ہم کمزور انسانوں کے دلوں میں یہ جذبہ پروان چڑھا کر پھر صرف تماشادیکھتا تھا۔  
ایمان اب تنگ سسک رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں آج میں نے اس محبت کا آپ کے سامنے اقرار کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید خدا مجھے اس محبت کے گناہ کے لیے بھی نہ بخشے کہ محبت جب کسی رشتے کے بنا ہو تو گناہ بن جاتی ہے۔ لیکن میرا خدا یہ بھی جانتا ہے کہ آپ سے ملے بنا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں آپ کو پنے لیے یوں برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج کے بعد میری ساری زندگی اپنے اس گناہ کی معافی مانگنے میں ہی گزرے گی۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آپ پنے آپ کو میری اس محبت کی وجہ سے مزید نہیں جلائیں گے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس پہلی اور آخری کوشش کو لا حاصل نہیں جانے دیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ آئندہ جب بھی زندگی میں آپ کا نام کسی حوالے سے سامنے آئے تو اس کے ساتھ یہ جوگ کی یہ خود کو جھاک کر رکھ کر دینے والی باتیں نہ ہوں۔ میں اپنی خوشی کے لیے آپ سے آپ کی خوشی مانگنے آئی ہوں۔"

میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"مجھ سے میری جان لگی ہوتی جس پر کم از کم میرا اختیار تو ہے، مجھ سے وہ نہ مانگو جو خود میرے بس میں نہیں ہے۔"

"کیوں۔۔۔ کیا زندگی اس ایک ملاقات کے سہارے نہیں کالی جاسکتی؟ کیا چند سالوں کا یہ محدود سفر صرف اسی ایک ملاقات کی یاد میں سر نہیں ہو سکتا؟۔۔۔ مجھے پورا یقین ہے۔۔۔ میں یہاں نہیں تو نہ سکی۔۔۔ پرواہ ان اگلے جہاں میں ضرور آپ کے ساتھ ہوں گی۔۔۔ بس اتنا وعدہ نہیں دے سکتے مجھے آپ۔"

اس کی باتوں نے اس نازک سی گل رخ کے اعتماد اور یقین نے مجھے لا جواب سا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کس کرب سے گزر رہی ہے، وہ بے چاری تو اتنی بے بس ہے کہ گناہ کے احساس کی وجہ سے اپنی محبت کا اعہار بھی کھل کر نہیں کر پاتی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ان محلوں میں مجھے گناہ و ثواب اور سزا و جزا کے اس تصور سے ہی شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ مجھے پھر وہی انگا کہ جیسے مذہب میری محبت پر ایک مرتبہ پھر ڈاکا مار رہا ہو۔ ہمارے تیز باز دشمنیت پر گرنے والی بوندوں کی مسلسل ٹپ ٹپ اور اندر بڑھتے اندھیرے میں غلطی شمعوں کے ریزتے سائے۔ ایسے میں اس پری رخ کا ساتھ وہ ویسے ہی کانتی ہوئی بے چین اور بے کھل سی گھٹنے جوڑے بیٹھی تھی۔ اس کی وہ شریٹ گیلی ہو کر پھر سے لٹک کر اس کے زخموں پر چوٹے لگی تھی۔ میں بے خودی میں اپنا ہاتھ روک نہیں سکا اور میں نے اپنی انگلیوں سے اس کی لٹ کو زخموں سے ہٹا کر ماتھے پر پرے کر دیا۔ اُس نے ایک دم گھبرا کر مجھے دیکھ اور شرم سے دوہری ہو گئی اور پھر جیسے ہی اس کی نظر دیوار پر لگے قدیم گھڑیاں پر پڑی تو ایک دم بوکھلا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"اف۔۔۔ اتنی دیر ہو گئی۔۔۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔ اندھیرا ہونے کو ہے۔ اہں گھر میں کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ہم لوگ کبھی گھر سے اتنی دیر تک باہر نہیں رہے۔ اب مجھے جانا ہوگا۔"

میرادل جیسے کسی نے آری سے کٹ کر رکھ دیا ہو۔ تو اس خواب کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ ایمان چارہ ہی تھی۔ میں نے اس سے کچھ دیر اور رکھنے کی التجا کی۔ جواب میں بے بسی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ نہیں رک سکتی تھی۔

کاش قدرت ہمیں وقت کو اپنی مرضی سے روکنے کا کوئی کلیہ بھی بتا دیتی۔ تو میں آج سات زمین اور آسمان کے خزانے دے کر بھی بدلے میں صرف چند پل اور سمیٹ بیٹا۔ اتنے میں باہر کسی کے چلنے کی دنگ ہوئی اور پھر کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ ایمان نے جلدی سے اپنی کالی شال سنبھالی۔ دروازے سے ٹکرت اور حیا کا چہرہ پل بھر کے لیے جھٹک دکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ بھی ہمیں اسی قاتل وقت کے گزر جانے کا احساس دمانے کے لیے آئی تھیں۔ ایمان نے بے چینی سے میری طرف دیکھا۔

”مجھے آپ کے وعدے کا انتظار ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“  
میں نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔

”گھر سے نکلتے وقت میں نے بھی اپنے آپ سے اور اپنے گھر والوں سے چند وعدے کیے تھے۔ مجھے ان کا بھرم بھی رکھنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کوئی میری محبت کی سچائی کو طعنہ دے۔ لیکن تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ تم جو چاہتی ہو۔ ویسا ہی ہوگا۔ بس مجھے کچھ وقت دے دو۔ کہیں میں اپنی نظروں میں ہی نہ گر جاؤں۔۔۔۔۔ ایمان نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”خدا نخواستہ۔۔۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“  
اس کے چہرے پر اب سکون کی پرچائیں تھیں۔

”نہیں جانتی ہوں، آپ میرا ان کبھی نہیں توڑیں گے۔“

وہ جانے کے لیے بھاگی، میرا دل چاہا کہ دوڑ کر اسے اپنی ہانہوں کے حصار میں لے لوں۔ ہمیشہ کے لیے، اور اُسے یہاں سے کبھی واپس نہ جانے دوں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پٹ کر مجھے دیکھا۔ سخت مضبوط کے باوجود اس کی بڑی بڑی کان آنکھوں میں آنسو بھری آئے تھے۔ ایک لمحے کو ہماری نظر ملی۔ اور وہ پٹ کر باہر چلی گئی۔ میں بے چین ہو کر اس کے پیچھے لپکا، برآمدے میں ٹکرت اور حیا سے لینے کے لیے کھڑی تھیں، ایمان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ دونوں بھی خود پر قابو نہیں رکھ پائیں اور وہ دونوں بھی بس رو پڑنے کے قریب تھیں۔ مجھ دیکھ کر دونوں نے جلدی سے دوپٹے سے پٹی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ حیا میرے بالکل سامنے ہی ایمان کے ساتھ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس اجنبی درانجانی سی لڑکی نے مجھ غم کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ آج میری ایمان کو میرے سامنے ڈاکڑا کیا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس کے جھٹکے سر کی طرف اٹھ گیا۔ اپنے سر پر میرے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور پھر مجھے اپنے سر پر ہاتھ رکھے دیکھ کر اس کا دس چٹک اٹھا اور وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں نے اس کا سراپے شانے سے لگا کر اسے تھپکا۔ شاید آج ساری کائنات ہی رورہی تھی۔ برآمدے سے باہر آسمان آنسو بہا رہا تھا اور یہاں برآمدے میں ٹکرت اور حیا کی آنکھیں چٹک چٹک کر مین بر ساری تھیں۔ باہر تانگے والے کا ہگل بجا، حیا اور ایمان جلدی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ ایمان جاتے جاتے پٹ پٹ کر میری طرف دیکھتی رہی۔ اس لمحے شاید اسے اپنی بڑی سی کالی شال بھی سنبھالنے کا دھیان نہیں تھا۔ اس کا مہتاب سا چہرہ بھٹکی آنکھوں کے ساتھ لکڑی کے پھاٹک پر آخری دفعہ میری کالی قسمت کے سیاہ آسمان پر چکا اور پھر ہمیشہ کے لیے بادلوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ میں وہیں ٹھنوس کے بل برآمدے میں ہی بیٹھ گیا۔ میرا دل اتنی زور سے چیخنے کو چاہ رہا تھا کہ جس سے آسمان وز میں پھٹ جائیں۔

☆☆

اُس دن ایمان کے چلے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ عشق میں پالینے کی کک تو اس کک اور تڑپ سے کہیں زیادہ بڑھ کر اور کہیں زیادہ دوسرا ہوتی ہے جو عشق میں نہ پانے کی صورت میں مجھے ہو رہی تھی۔ مجھے کسی کروٹ بھی تو چین نہیں تھا۔ سچ ہے جنون میں وصل جدائی سے زیادہ زہریلا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مل کر میرے سینے کی آگ بجھنے کی بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ جیسے یہ آگ سب کچھ جل کر رکھ رہی کر دے گی۔

منیں نے اس سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ میں اپنوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن کیسے۔۔۔؟ اس کے بارے میں منیں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ کبھی سوچتا تھا نگہت کے ذریعے اسے ایک جھوٹا پیغام بھجوا کر کہ میں گھر واپس چلا گیا ہوں، ہمیشہ کے لیے یہ شہر ہی چھوڑ دوں۔ اس کی تسلی اور تقدیر کا ذریعہ صرف نگہت ہی تھی اور نگہت میری خاطر یہ جھوٹ بولنے پر بھی تیار ہوئی جاتی۔ اور پھر شاید یہ ہمارا آخری جھوٹ ہی تو ثابت ہوتا۔ پھر جانے کیوں اس بات پر مجھے خود ہی، اپنے آپ پر شرم آ جاتی۔ اس مصحوم اور پری صفت لڑکی سے اتنا بڑا جھوٹ، جو صرف میری محبت کی لاج اور مجرم رکھنے کے لیے اپنی ساری زندگی کی کئی لاکھ کر میرے پاس چلی آئی تھی۔ صرف اس مجرم سے پر کہ منیں اس کی بات ضرور رکھوں گا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا جاتا تھا۔ وہ اس دن کہہ گئی تھی کہ کیا ساری زندگی بس اک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جاسکتی؟ اب منیں سوچتا تھا کہ ضرور کاٹی جاسکتی ہے۔ پر اس کے لیے مجھ جیسے کم ظرف کے لیے ایک اور شرط کا پورا ہونا بہت ضروری تھا۔ اور وہ یہ کہ مجھ سے اس ایک ملاقات کے بعد ہی میرے ہوش و حواس بھی ٹھیک لے جاتے۔ اُس سے ملنے کے بعد یہ کم بخت حافظ ہی تو میرا سب سے بڑا دشمن ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہفتہ بیت چکا تھا اُس سے ملاقات کیسے ہوئے لیکن میری آنکھوں کے سامنے اب بھی ہر مل و ملی ٹٹھکی رہتی تھی۔ میری سانسوں میں اب بھی اُسی کی وہ مالوس سی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میری ساعٹوں میں اب بھی اس کی وہ روح کو کھینچ لینے والی ملائم آواز اور چوڑیوں کی ٹھنک، رنچاؤں کی بکھیر رہی تھی۔ میرے لمس کو اب تک اُسی کے جانفزائس کی عادت سی پڑی ہوئی تھی۔ یہ کیسی عجیب ملاقات تھی؟ کہ میں ان چند گھنٹیوں کی ملاقات کے بعد اپنی اس سے پہلی گزاری ہوئی قلم عمری بھول گیا تھا۔ میں اس ملاقات سے پہلے کیا تھا؟ میری پسند ناپسند کیا تھی؟ قلم ڈالتے، تمام خوشبوئیں، قلم حسیات جیسے مٹ سی گئی تھیں۔ مجھ سے میرا سایہ تک جیسے چھن گیا تھا۔ بس ایمان اور صرف ایمان ہی باقی رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرا وجود اسی دن اس دنیا میں وارد ہوا تھا جس دن میری ایمان سے وہ آخری ملاقات ہوئی اور شاید اسی دن میں فنا بھی ہو گیا تھا۔

وہ شاید ایمان سے ملے ہوئے نواں دن تھا۔ اکتوبر شروع ہو چکا تھا، سورج اب جلدی ڈوبنے لگا تھا اور ڈوبنے سے پہلے اس کی سنہری دھوپ ہلکی سردی میں بہت بھلی لگتی تھی۔ جیسے جیسے سردی بڑھتی جا رہی تھی، دھوپ کا سنہرا پن بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ منیں پلیٹ فارم کے اس کونے پر جہاں سے سورج کو آخری وقت تک سامنے کے پہاڑ کے پیچھے ڈھونڈا دیکھا جاسکتا تھا۔ بہت دیر سے بیٹھا اپنے وجود پر دھوپ کے اس سونے کو جذب کر رہا تھا۔ کہ شکر مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ نکلا، جانے آج کل میں اپنے کسی بھی نہانے رشتے کو دیکھ کر آج میں ڈر رہا کیوں جاتا تھا۔ دوسرے دل میں گھر کرنے لگتے تھے۔ شاکر زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ وہ نگہت کا رقعہ مجھے دینے آیا تھا۔ میرے گھر والوں کے بارے میں اُس نے بتایا کہ اب مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہیں۔ کشنر صاحب سے ان کی اس موضوع پر کئی مرتبہ بحث ہو چکی ہے۔ وہ سب یہ بھی جان گئے ہیں کہ میں کراچی یا اسلام آباد اپنے کسی دوست کی طرف نہیں ہوں، نہ نہیں لندن کا مران کے پاس گیا تھا بلکہ میں سینیں اسی شہر میں کہیں رہ رہا ہوں۔ شاید آتے جاتے کسی جاننے والے



کی نظر مجھ پر پڑ گئی ہو۔ لیکن میرے گھر والے اس ریلوے اسٹیشن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل یا بڑے گیسٹ ہاؤسز میں ہی تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

شا کر اٹھتے ہوئے بولا۔

”حماد بابا۔۔۔۔۔ آپ نے پورے گھر کو اس پورے زمانے کو یہ یقین دلادیا ہے کہ آپ کے جذبے سے زیادہ بڑھ کر اس دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ آپ نے زمانے کو اپنی شوگر میں لا ڈالا ہے۔ اب میری صرف اتنی التجا ہے کہ اگر گھر والے آپ کو واپس بلانا چاہیں تو نکار مت کیجئے گا۔ گھٹ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی رخصتی بھی طے کر دی ہے اگلے مہینے۔ ہو سکے تو اس سے ملنے کے لیے ایک چکر لگا بیجئے گا۔ چلتا ہوں۔“

شا کر مجھے گلے لگا کر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے گھٹ کا بیجا ہوا غناؤ کھولا، لگتا تھا گھٹ نے بہت کرب کے عالم میں یہ خط لکھا تھا، ہر ہر لفظ سے درد فک رہا تھا۔

”بہیا۔۔۔۔۔ میں جانتی تھی کہ آپ کے جذباتوں کے سامنے کوئی نہیں ٹک پائے گا، بہت طاقت ہے آپ کی محبت میں، آپ کے جنون میں۔ آپ کی محبت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا، ایمان جیسی لڑکی نے بھی آپ کے جذبے کے گے سر جھکا ہی دیا، مجھے آپ پر ہمیشہ سے فخر تھا، اور ہمیشہ رہے گا، لیکن وہ بہت نازک، بہت مصحومی لڑکی ہے۔ آپ اس کے لیے دُعا ضرور کیجئے گا، کیونکہ میں جانتی ہوں کہ آپ کی دُعا میں رد نہیں ہوتیں۔ جس دن سے وہ آپ سے مل کر گئی ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے۔ دن رات بخار میں تپ رہی ہے۔ اس کی اماں کہتی ہیں کہ بارش میں بھیجنے کی وجہ سے اُسے سردی لگ گئی ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ اس جذبے کی شدت ہے جو آپ کی محبت نے اس کے دل میں جگایا ہے۔۔۔۔۔ پہلی مرتبہ۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ ایسے کسی بھی جذبے سے ہمیشہ انجان رہی ہے۔ میں آپ کو نہیں بتانا چاہتی تھی کیونکہ ایمان نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ لیکن حیا کے کہنے پر آپ سے دُعا کی التجا کرتی ہوں۔ خدا کرے کہ میری ساری خوشیاں آپ کو اور آپ کے سارے غم خدا مجھے دے دے۔“

یہ باتیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں وہ یہ نہیں جانتیں کہ ہم سب کو اپنے اپنے حصے کا عذاب کسی نہ کسی صورت بھگت کر ہی یہاں سے جانا ہے۔ میں گھٹ کا خط پڑھ کر بے حد فکر مند ہو گیا۔ جیہ مجھ سے دُعا کی امید کیے بیٹھی تھی۔ وہ بچی اتنا بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اگر میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج ایمان میری نہ ہوتی۔ میرا اس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح سے میرے پرنگ جائیں اور میں اُڑ کر ایمان کے پاس جا پہنچوں۔

مجھے خود پر بھی شدید غصہ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہی تو ہو رہا تھا۔ میں نے ہی اس نازک سی لڑکی کی رگوں میں عشق کا یہ نیگلوں زہر اتارا تھا اور لوگ مجھ سے ہی اس کے تریاق کی امید بھی کر رہے تھے۔ سچ ہے کہ محبت ایک نرم گلابی موسم کی طرح جسم پر اترتی ہے لیکن رفتہ رفتہ یہی گلابی موسم ایک دہکتی آگ میں بدل جاتا ہے۔ آس پاس نیلی تپتیاں پھلس کر مر جاتی ہیں۔ سب پھول ساری پتلیاں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اس نازنین کے کول وجود کو جلانے کے لیے تو مذہب کی کڑی دھوپ ہی کافی تھی۔ ایک نامحرم سے بات کرنے کا احساس بے جرم ہی



اس کو ساری زندگی تڑپانے کے لیے بہت تھا۔ ایسے میں اگر محبت کی آگ بھی اس پیش کو دو آتھ تو کرنے کے لیے موجود ہو تو پھر اس کی تڑپ کا اندازہ میں خوب کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا وجود اسی مذہب اور محبت کی جنگ کے بیچ چل رہا تھا۔ مذہب اسے مولوی عظیم کی طرف کھینچ رہا تھا اور محبت اسے میری طرف دھکیل رہی تھی۔ اور اس کھینچا تانی میں وہ ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ اس کا نازک بدن کٹ رہا تھا۔ روح تقسیم ہو رہی تھی۔ میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مذہب ایسی محبت کے خلاف کیوں ہے؟ اور اگر ایسی محبت جرم ہے تو یہ جرم اپنے ساتھ احساسِ مذمت، خوف اور افسوس کی بجائے خوشی و مسرت کیوں لے کر آتا ہے؟ کیوں یہ جرم بار بار کرنے کو بھی چاہتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر گناہ کے بعد انسان کو چند لمحے کے لیے ہی کیوں نہ سکی، پر تاسف ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ محبت کیسا گناہ ہے جو ہر روز گزرنے کے ساتھ ساتھ اور نیا اور حسین ہوتا جاتا ہے۔ یہ کیسا گناہ ہے جو دل کو نر دہ کرنے کی بجائے ہر لمحہ اس میں نئی روح پھونک رہا ہوتا ہے۔ تو پھر کیا میں سمجھ لوں کہ مذہب کا محبت کے بارے میں یہ کلیہ ہی ہمیشہ سے غلط تھا اور غلط ہے؟ مذہب اگر نفسوں سے، رشتوں سے، جانداروں سے، حتیٰ کہ پھول پھولوں اور نباتات و جمادات سے بھی محبت کرنے کا درس دیتا ہے تو پھر اس محبت کو غلط کیوں کہتا ہے۔ کیوں ایسی محبت کو بھی گناہ سمجھتا ہے جس میں سوائے ایک دوسرے کو دیکھنے اور بات کرنے کے اور کوئی مادی چاہ نہ ہو۔ پاک محبت بھی گناہ کے زمرے میں کیوں آتی ہے۔ صرف اس اندیشے کی بنیاد پر کہ آگے چل کر مواقع ملنے پر اور جنہاں میسر آنے پر یہ محبت بھی سبکی جذبات میں ڈھل جائے گی، اور اگر ایسا نہ ہو۔۔۔ اگر جسم کا حصول ہی اس محبت کی ترجیحات میں بھی شامل بھی نہ رہا ہو تب کیا ایسی محبت مذہب کے لیے قابلِ قبول ہو جاتی ہوگی۔۔۔؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں۔۔۔؟

مذہب کو تو صرف محبت سے پیدا ہونے والے گناہ کے جذبے سے روکنا چاہیے۔ محبت سے نہیں۔ میں تو مذہب کے اس فلسفے کو سمجھنے سے ہی قاصر تھا۔ میں تو اسی محبت کے وسیلے سے مذہب کے قریب ہوا تھا۔ اور اب جب کہ یہی مذہب مجھے محبت کرنے سے روک رہا تھا تو میں خود بخود اس مذہب سے زور ہوتا جا رہا تھا۔ بلکہ میں ایمان کی اس حالت کا ذمہ دار بھی براہِ راست اس مذہب کو ہی سمجھتا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مولوی عظیم کے قدموں میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ ان کے پاؤں پکڑ لوں کہ ہمارے درمیان یہ مذہب کی دیوار کھڑی نہ کریں۔ ہم دونوں کو مذہب کی ان زنجیروں سے نکال کر محبت کے حوالے کر دیں۔ ہمارا فیصلہ مذہب کو نہیں، بلکہ محبت کر کرنے دیں۔

لیکن میں کس قدر بے بس تھا سوائے ان خیالات کی یلغار کے، میرے پاس اڑنے کے لیے اور کوئی دوسرا میدان بھی تو نہیں بچ رہا تھا۔ دن تھے کہ بیٹے جا رہے تھے، ایمان کی رخصتی سر پر آ چکی تھی۔ بس دو دن ہی تو رہ گئے تھے میری سانسوں کو میری روح سے جدا ہونے میں۔ اگر ایمان مجھے مولوی صاحب کے سامنے گڑ گڑانے کی اجازت دے جاتی تو میں اسی مسجد کے سامنے خود کو سولی پر لٹکانے کے لیے بھی تیار تھا۔ کیا تب بھی ان کا دامن سم نہ ہوتا ؟

لیکن وہ ستم گرو تو مجھے مزید باندھ کر چلی گئی تھی۔ اُس نے اپنے اپنے جعبے دامن کی حرمت اور اپنے سفید پوش باپ کی مجبوریوں کا ذکر کر کے میرے جنون کو جیسے زنجیروں میں ہی تو جکڑ دیا تھا۔ ورنہ شاید میں اس کی بیماری کا سن کر باقاعدہ شکوک لے کر مولوی صاحب کے دروازے پر ہی جا بیٹھتا۔ اور تب تک ان کی چوکھٹ پر سر پٹختا رہتا جب تک وہ خود آ کر میرے لیے بلہاں سر کو قہا منہ لیتے۔۔۔ لیکن افسوس، میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ ایسی ہی اک اداس اکٹوبر کی آخری شاموں میں سے ایک شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سرخی میرے ارد گرد کے خون کی طرح نکھری ہوئی تھی، ہوا سرد تھی، غزاں نے پلیٹ فارم پر بھی ڈیرہ جمالیا تھا۔ شہوت کے پتے پہلے زرد اور پھر سرخ ہو کر خشک ٹھنڈوں سے کئی پتھلوں کی طرح گر رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ پلیٹ فارم پر کسی نے زردی مائل سرخ پتیوں کی کوئی چادری بچھا دی ہو۔ میں اسی چادر پر رکھے اپنے مخصوص بیچ پر بسپوسٹ کے نیچے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل ایمان کے ہاتھوں میں عبداللہ کے نام کی مہندی رچ جائے گی اور پرسوں 'سے گھر سے اس جاتی بہار کی طرح رخصت کر دیا جائے گا۔ گجرت نے مجھے بتایا تھا کہ شادی کے بعد مولوی صاحب نے انہیں مجھ اپنی بہن کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ عبداللہ کے لیے وہاں کسی چھوٹے موٹے کام کا بندوبست بھی کر آئے تھے۔ مجھ میں کوئلے کی بہت سی کانیں بھی تھیں۔ انہی کانوں کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی آباد تھیں جن میں ان کو کھانک کانوں کے کان کن رہتے تھے۔ ایسی ہی کسی ایک بستی کی مسجد کی امامت کے لیے انہوں نے عبداللہ کا نام منظور کروالیا تھا۔ پتہ نہیں مجھے، یا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ مولوی طیم نے یہ قدم بھی صرف اور صرف میری وجہ سے ہی اٹھایا تھا۔ ورنہ وہ ایمان کی ہدائی کہاں بردشت کر سکتے تھے۔ گجرت نے تو یہ فہرہ بھی طہر کیا تھا کہ ایمان کی رخصتی کے بعد مولوی صاحب بھی زیادہ عرصہ کوئٹہ میں نہیں ٹھکیں گے اور اندر ہی اندر انہوں نے خود بھی بیوی اور حیا سمیت یہاں سے مجھ منتقل ہونے کا پورا پروگرام بنا رکھا ہے۔ میرے ذہن میں بھر نطرت کے سارپ نے چمن پھیلے۔ مگر بھری محبت کو قتل کرنے کے بعد اس کی میت بھی یہاں دفن نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اُسے بھی مجھ سے ڈرے جانا چاہتا ہے۔

پھر مجھے عبد اللہ کا خیال آیا۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ، اُسے ایمان ملنے والی تھی۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں ان کی محبت مل جاتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت ایسے لوگوں کی ان کے دل کی، کیسی حالت ہوتی ہوگی جب وہ اپنی محبت کے اتنے قریب ہوتے ہوں گے۔ ان کے دل خوشی سے پھٹ کیوں نہیں جاتے اس لیے۔۔۔؟ نہیں اگر عبداللہ کی جگہ ہوتا تو یقیناً میں اس وصل محبت سے پہلے ہی خوشی سے مر جاتا۔

میری عبداللہ کے بارے میں سوچیں اس قدر رطافت ور ہوگئی تھیں کہ میں نے اُسے اپنے سامنے ہی پلیٹ فارم پر چلنے ہوئے، اپنی طرف دور سے بڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے سر جھٹک کر اس خیالات کی رو سے نکلنے کی کوشش کی لیکن عبداللہ کا وہ بیوا اب بھی میرے سامنے ہی بڑھا چلا آ رہا تھا میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو درحقیقت عبداللہ ہی تھا جو ان زرد اور سرخ خشک پتوں کی چادر کو روندتے ہوئے چہرے پر بے انتہا پریشانی سے میری جانب ہی بڑھا چلا آ رہا تھا۔ مجھ سے تو اتنا بھی نہیں ہوسکا کہ دو قدم چل کر میں خود اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا۔ بس ساکت کھڑا اسے اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ عبد اللہ میرے قریب آ گیا، اُس نے اپنی نکھری سانسوں کو سینے کی کوشش کیے بتائی براہ راست مجھے کہا۔

”آپ کو بھی اسی وقت میرے ساتھ چن ہوگا۔“

میں نے بوکھلا کر اُس کی طرف دیکھا۔

”ساتھ چننا ہوگا لیکن کہاں۔“

”ہمارے گھر زیادہ سوال نہ کیجئے گا، بس چلنے کی کریں۔“

اس وقت عبداللہ کی حالت ایسی تھی کہ میں واقعی کوئی دوسرا سوال نہ کر سکا۔ عبد اللہ پلٹا اور میں کسی معصوم کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کے تمام لیمپ پوسٹ اور گیس کے ہنڈولے جل چکے تھے۔ لیکن اکوبر کے آخری دنوں کی شدید دُھند اور کھرے ہادلوں نے سارے ماحول کو اس طرح سے پیٹ میں لے رکھا تھا کہ وہ سب روشنیاں صرف ٹٹھکتی تیاں اور دھیمے چراغ دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے گہرے سفید ہادلوں میں کسی نے بہت سے جگنو چھوڑ دیے ہوں۔

منیں اور عبداللہ اسی کھرے اور وحد کے بادل میں جیسے رستے بناتے ہوئے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے باہر نکلے، باہر سڑک بھی سنسان اور دُھند میں لپٹی پڑی تھی۔ جیسے کوئی سانولی بچہ سفید ساڑھی لپنے ابھی ابھی نہیں کر کے لپٹی ہو، میں اور عبداللہ اس کھرے میں مایوس سے کھڑے آس پاس کسی سواری کی تلاش میں نظریں دوڑاتے رہے۔ عبداللہ کی حالت بالکل ایسی تھی جیسی جل بن مچھلی کی ہوتی ہے۔ وہ بار بار بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا جیسے وقت اس کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا ہو۔ جانے اُسے کس بات کی اتنی جلدی تھی۔ اتنے میں خیر و کسی رحمت کے فرشتے کی طرح کسی سواری کو چھوڑ کر واپس آنا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے اُسے آواز دی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے ہم خیر و کے سبک تانگے میں پڑنے لگے کی طرف روانہ تھے۔ لیکن راستے کی شدید دُھند اور کھرے کی وجہ سے خیر و کا گھوڑا ابھی جیسے پھوٹک پھوٹک کر فضا میں قدم رکھ رہا تھا۔ خیر و نے احتیاطاً تانگے کے اگلے ہانسوں کے ساتھ لگے گیس کے دونوں ہنڈولوں کو بھی جلد یا بدھ تا کہ راستہ کچھ تو واضح نظر آئے لیکن اس سے بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے گھوڑے کے نعتوں میں سے ہر بار بھپ کی شکل میں آتی جاتی سانس کا نشان مل رہا تھا۔ ہم اندھیری سڑکوں پر ڈور ڈور لگے سپ پوسٹوں کی کمزور پٹی روشنیوں کے دائرے سے ہوتے گئے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمیں دور سے ٹپن روڈ کے دور دراز گھنے درختوں کی قطاروں سے اس سبھی نما تانگے میں اس وحد اور کھرے میں کہیں جاتے دیکھتا تو اُسے ضرور شراک ہو مڑکی ظلموں کے ایسے بہت سے منظر یاد آ جاتے۔

بالآخر تانگہ پڑانے لگے کے گیٹ سے اندر داخل ہوا، محلہ سنسان پڑا تھا، میں اور عبداللہ جلدی سے تانگے سے نیچے نرے۔ عبداللہ تیزی سے گھر کی طرف بڑھا۔ میں دفعتاً ٹھٹک کر رک گیا، یہ نہیں کہاں آ گیا تھا، یہ گلی، یہ کوچہ، یہ گھر تو میرے لیے منوع تھا۔ میرے تو یہاں آنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ میں مولوی عظیم کی تو کسی پابندی کا بھی پابند نہیں رہا تھا، لیکن یہ پابندی تو میری زندگی، میری سانسوں کی اس مالک کی لگائی ہوئی تھی۔ جس کا اب میری ہر آتی جاتی سانس پر اختیار تھا۔

عبداللہ کو جب احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ قدم نہیں بڑھا رہا ہوں تو وہ فوراً چلتا۔

”آپ ڈرک کیوں گئے، جلدی چلئے۔۔۔“

”میں۔۔۔۔ میں تمہارے اندر نہیں آ سکتا، مجھے ایمان نے منع کیا تھا۔“

منیں نے ناگہی میں ایمان کا نام تو لے لیا لیکن پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میں جلد بازی میں ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے ایمان کا راز افشاں کر بیٹھا ہوں۔ میں نے گھبرا کر بات چلنے کی کوشش کی۔

”میرا مطلب ہے کہ مولوی صاحب۔۔۔۔ انہیں میرا ایمان آتا۔۔۔۔“ عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا اُس کی آنکھیں بھیگ

رہی تھیں۔

”انہیں شاید اب اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ اندر آئیں، وقت زیادہ نہیں ہے۔“  
 میں پھر بھی پٹی جگہ جم رہا، میں ایمان سے کیا وعدہ نہیں توڑ سکتا تھا۔  
 ”لیکن ایمان۔۔۔۔۔“

”میں ایمان ہی کے کہنے پر آپ کو اسٹیشن لینے کے لیے آیا تھا۔ آئیے۔۔۔۔۔ وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی ہے۔“

عبداللہ مجھے گم صدم اور سکتے میں چھوڑ کر دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھانا پڑے۔ مگن کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ محلے کی بجلی گئی ہوئی تھی، ایمان کا گھر بھی دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگن کا جھولا ہوا کے زور سے یوں آہستہ آہستہ جھول رہا تھا جیسے ابھی بھی ایمان یہاں سے اٹھ کر گئی ہو۔ گھر پر ایک عجیب سا سکوت اور سناٹا طاری تھا۔ اچانک آہٹ سن کر اندر سے گھٹ برآمد ہوئی۔ میں اس وقت گھٹ کو یہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ برآمدے کے چھوٹے چھوٹے سے طاقوں میں رکھی شمعیں جھللا رہی تھیں جن کی ہلکی روشنی میں گھٹ کی آنکھوں میں چھپے آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دھند کو چیرتی ہوئی تیزی سے میری طرف دوڑتی ہوئی آئی اور میرے سینے سے لگ کر سسک سی پڑی۔ میں ابھی تک حیران و پریشان سا دوں کھڑا تھا۔ عبداللہ نے میرا ہاتھ تھاما اور برآمدے میں اس حصے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں زنا نہ تھا۔ یہ کیا، عبداللہ مجھے گھر کے زانے حصے کی طرف کیوں لے کر جا رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اگر مجھے اپنے گھر میں یوں آزادی سے چلتے پھرتے دیکھ لیا تو غضب ہی تو ہو جائے گا۔ لیکن عبداللہ مجھے ہاتھ کچھ کہنے کا موقع دے کر زبردستی کھینچتا ہوا اس کمرے میں لے گیا جو برآمدے کے سرے پر بنا ہوا تھا۔ گھٹ بھی میری کنبی سے پٹی میرے ساتھ ہی کمرے میں چلی آئی۔

کمرے کی مٹکی روشنی میں جس پہلے شخص کے چہرے پر میری نظر پڑی وہ خود مولوی عظیم ہی تھے۔ میں ٹھنک کر رک گیا، مولوی عظیم کے چہرے پر اک عجیب بے بسی تھی۔ ایسی بے بسی صرف اس شخص کے چہرے پر ہو سکتی ہے جو ایک لمبی جنگ کے بعد اس وقت ہار گیا ہو جب اسے اپنی جیت کا پورا یقین ہو چکا ہو۔ ان کے ساتھ ہی پیچھے حیا موجود تھی۔ اور ایک پُر نور چہرے والی عورت چادر لپیٹے کمرے کے وسط میں پڑے پٹنگ کی پاکیتی سے گل بیٹھی تھی۔ وہ سب خاموش سے کیوں تھے؟ پھر میری نظر کمرے کے ملنے والے اندھیرے نما اجالے سے چسپی ہانوس ہوئی تو مجھے لگا کہ پٹنگ پر کوئی بین ہو ہے جس کے ماتھے پر شانہ شندی پٹیاں رکھنے کے لیے حیا اور اس کی اماں پٹنگ کے دونوں اطراف کی پاکیتی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سلور کا بڑا سا تسل پڑا تھا جس میں کچھ سفید پٹیاں۔ تیرہ ہی تھیں۔ ایک دم سے میرے ذہن میں کوئی جھماکا سا ہوا۔ میں جیسے فیند کے عالم سے یک نیت جاگ گیا تھا۔ پٹنگ پر کوئی اور نہیں ایمان ہی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے شدید تھابت سی ہلک ری تھی لیکن چہرے کے گردور کا گلابی سا ہال اب بھی ویسے ہی قائم تھا۔ اس کی سانس زک زک کر چل رہی تھی اور وہ آنکھیں موندھے کسی سنودھانت کی طرح کسی لمبی اور گہری نیند میں دکھائی دے رہی تھی۔

چند منٹ کے لیے مولوی عظیم کی مجھ سے نظریں ملیں اور پھر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ عبداللہ مجھے یوں دروازے پر ہی سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھ کر آہستہ سے کھٹکارا اور اس نے گھٹ کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا۔ گھٹ میرا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہو گئی اور میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ آیا۔ عبداللہ ایمان کے بیروں کی جانب بیٹھ گیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔

”ایمان۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔۔۔ دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے۔“

ایمان کی غیندیا بے ہوشی اب بھی نہیں ٹوٹی۔ حیانے دھیرے سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں، اور جانے اس کے کان میں آہستہ سے کیا کہا۔۔۔۔۔ ایمان کے وجود میں ہلکی سی جھنجھٹ ہوئی اور اس نے رفتہ رفتہ اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔ وہی جان لیو دو بڑی بڑی کالی آنکھیں۔۔۔۔۔ پھر اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔۔۔۔۔ وہی روح کھینچ لینے والی نظر، وہ چند لمبے پلکیں جھپکاتے بناتے مجھے دیکھتی رہی۔ جیسے میری ہنسی کو اپنی آنکھوں کے پردے میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔ نقاہت اور بیماری نے اُس کے خُسن پر ذرا سا بھی فرق نہیں ڈالا تھا۔ بلکہ آج مجھے وہ تھکا تھکا سا خُسن پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی اکھڑی اکھڑی سانسیں بتا رہی تھیں کہ محبت کا قاتل ذرا اس کی رگوں میں پوری طرح پھیل چکا ہے۔ اُس محبت نے ایک جیتی جاگتی، ہنستی کھلکھلاتی لڑکی کا کیا حال کر ڈالا تھا۔

یا خدا۔۔۔۔۔ ایہ کیا عجیب دن تھا، کیسی کیسی انہونیاں ہونے کو جا رہی تھیں۔ مولوی عظیم کی موجودگی میں میں ان کی بیمار بیٹی کے کمرے میں موجود تھا۔ ان کا سارا گھرانہ بشمول ان کے ہونے والے داماد کے، سب ہی تو یہاں موجود تھے لیکن آج مولوی عظیم کی زبان پر تارا پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے پھٹکے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں اتنا ارتعاش تھا کہ وہ ٹھیک سے تسبیح بھی نہیں پھیر رہے تھے۔ محبت بھی کیسے کیسے بھڑے دکھاتی ہے، اس کا احساس مجھے اس دن مولوی عظیم کی خاموشی دیکھ کر ہوا تھا۔

ایمان کے لب ذرا سے ہے، لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ مولوی صاحب تڑپ کر آگے بڑھے اور ایمان کے ماتھے پر ہوسہ دیا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ ان کی بیوی کی آنکھوں سے زار و قطار ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جھری بہہ رہی تھی لیکن وہ اتنی خاموشی سے رو رہی تھیں کہ جب تک کوئی انہیں دیکھ نہ اسے پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میری نظریں بس ایمان پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ اور پھر ایک اور جھڑوا ہوا، مولوی عظیم آگے بڑھے اور میرا ہاتھ خود ہی تھام کر مجھے ایمان کے سر ہانے تک لے آئے۔ حیانے اُنھ کو میرے کمرے ہونے کی جگہ خالی کر دی۔ ایمان نے ایک لمحہ مجھے دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر وہی ہلکی سی کائنات کو زندگی بخش دینے والی جانفزا سی مسکراہٹ ابھری جو اس کے گالوں میں جھلکے سے گڑھے ڈال دیتی تھی۔ اس کی نظر نے ایک لمحے میں ہی میری نظر سے مل کر ساری کائنات کو تسخیر کر لیا، کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ ”محبت فاتح عالم“ اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں کچھ دیر تک اُسے ساکت دیکھتا رہا کہ کب وہ دوبارہ آنکھیں کھولے اور کہیں مجھ سے اس کی کوئی نظر چوک نہ جائے۔ لیکن اس نازنین کی غیندیاں ہوتی گئی اور پھر مجھے کہیں دُور خدا میں سے مولوی عظیم کی آواز آتی سنائی دی۔

”اللہ وانا ایدہ راجعون۔“

کیا۔۔۔۔۔؟ کیا آس پاس کسی کی موت ہوگئی ہے جو مولوی صاحب اس وقت بے موقع یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ انہیں یوں سکون سے سوئی ہوئی اس شہزادی کے سر ہانے اب کچھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ بدشگونی بھی تو ہو سکتی ہے نا۔ میں نے غصے اور ناگواری سے مولوی صاحب کی طرف دیکھا، لیکن وہاں تو حیا اور نکمت بھی ایک دوسرے سے لپٹی سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے، میں نے عبد اللہ سے مدد لینے کے لیے اس کی طرف دیکھا کہ اس سے کہوں کہ ان دو بے وقوف لڑکیوں کو ایمان کے سر ہانے سے دُور لے جائے۔ ابھی تو وہ نازنین تھک کر ذرا سوئی ہے۔ جائے کب کی جاگی ہوئی تھی۔ اب ان دونوں کا یہ بین ہی کہیں اس کو نہ جگا دے۔۔۔۔۔ لیکن یہ کیا، عبد اللہ تو خود گھٹنوں میں منہ چھپائے ہڑک



خدا اور محبت



دل جو اس کے نازک دل کے ساتھ دھڑکنے کا دعوے دار تھا، وہ اس کے دل کی دھڑکنے کے ساتھ ہی پھٹ کیوں نہیں گیا۔ میں تو اس کے سارے کو بھی کسی کو دینے کا روادار نہ تھا، پھر کوئی میرے سامنے اس کے کول وجود سے روح کیسے چھین لے گیا۔

یعنی میرے سارے دعوے ہی جھوٹے نکلے، میرے اندر سے چیخوں کا ایک طوفان اُبل اُبل کر باہر آنے کے لیے تیار تھا لیکن میری مجبوری تو دیکھئے کہ اس ماہِ رخ کی حرمت کا خیال مجھے کل کر ماتم کرنے سے بھی روک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے آنسو بھی خشک ہونے لگے، اور اس دن مجھے بنا آنسوؤں کے رونے کا مطلب بھی سمجھ آ گیا۔ مولوی صاحب نے میری ہچکیوں کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے کچھ ہی دیر میں اپنے حواس کا دامن چھوڑنا ہی پڑا۔ بے سہم ہونے سے پہلے میں نے آخری مرتبہ ایمان کی ادب کو اس کا ماتھا چوستے اور چہرے پر چادر ڈالتے دیکھا اور پھر مجھے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں رہا، میں وہیں مولوی صاحب کے گلے لگے لگے ہی ان کی ہانپوں میں جھوس گیا۔

☆☆

اُس دن کے بعد شاید جب پہلی مرتبہ میں اپنے حواس میں واپس آیا تو پندرہ دن کا وقفہ بیت چکا تھا۔ میں صدیقی صاحب کے گھر میں ہی اُسی کمرے میں ڈرہیں اور باروؤں میں کُھسے کیوں لا رہا اور سرنجوں سے لدا پسند اسی بستر پر پڑا تھا۔ بعد میں صدیقی صاحب نے بتایا کہ ریلوے کے ہسپتال میں چھ دن رکھنے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے گھر ہی منتقل کر دیا تھا کیونکہ ریلوے ہسپتال میں اتنی سہولیات بھی نہیں تھیں اور شہر کے جس پرائیویٹ ڈاکٹر کو انہوں نے میرے علاج کے لیے طلب کیا تھا اس کا اور اس کی پوری ٹیم کا ریلوے ہسپتال میں روز آنا جانا ممکن نہ تھا۔ پہلے چند دن تو میری یادداشت نے ہی میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں حیرت سے ان اجنبی چہروں اور لوگوں کو دیکھتا رہا جو میرے آس پاس آتے جاتے، ٹہکتے، مجھے اُنکھین وغیرہ لگاتے اور میرا بخار چیک کرتے رہتے۔

صدیقی صاحب بتا رہے تھے کہ پھر مجبوراً ڈاکٹر نے فیصلہ کر ہی لیا کہ مجھے شہر کے بڑے ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے کیونکہ ہمارا تو میری حالت ٹھیک ہو رہی تھی لیکن میرے ذہن کا اور میری یادداشت کا میرے جسم کا ساتھ نہ دینا انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ میں بڑے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ دن گزارتے گئے اب میری جسمانی حالت دیرے دیرے سدھرنے لگی تھی۔ بخار کا وقفہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی نرس اگر دلیہ وغیرہ میرے حلق سے اتارنے میں ناکام ہو بھی جاتی تو صدیقی صاحب آکر ضد سے اور پیار سے مجھے کچھ مائع غذا کھلا جاتے۔ شاید اس دماغی بے ہوشی کے عالم میں بھی میں صدیقی صاحب کے احسانوں کی کیفیت تلے دبا ہوا تھا۔ اب دیرے دیرے مجھے ایک ذہنی چیز پر شام کے وقت ہسپتال کے بڑے سے والن میں ایک طرف کو بنی چھوٹی سی جھیل تک یا گھاس کے میدان میں ٹھلانے کے لیے بھی بجایا جانے لگا۔

لیکن میرے دماغ پر بھی دھند کسی طور پر کم نہیں ہو پا رہی تھی۔ شاید یہ میرے ہوش و حواس کی آخری رات کی وہ دھند تھی جو میرے ذہن سے لپٹ کر ہی رہ گئی تھی۔ میں چہروں کو دیکھتا اور انہیں پہچاننے کی کوشش بھی کرتا، لیکن سب ایک خواب کے عام میں ہو رہا تھا۔ شاید ان دنوں میں مولوی عظیم، عبداللہ، شاکر، خیر و غفور اور جانے کون کون مجھ سے ملنے اور مجھے وہاں دیکھنے آتا ہوگا لیکن میں ان مانوس چہروں کو بھی اجنبیت سے دیکھتا رہا ہوں گا۔

ڈاکٹروں کی رائے میں میرا دماغ اُن کی دی ہوئی ادویات کی تحصیل نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ میرے جسم نے ان کے علاج کی ہر ممکن قیصل کی

تھی۔ اب ڈاکٹروں کے بقول مجھے مزید ہسپتال میں رہنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے صدیقی صاحب کی درخواست پر مجھے ان کے ساتھ واپس گھر جانے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ بے حد احتیاط کی تلقین بھی کی تھی۔

شاید وہ بڑے ہسپتال میں میری آخری شام تھی کیونکہ اگلے دن مجھے صدیقی صاحب واپس اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے والے تھے۔ کہ چانک ہسپتال کی راہداریوں میں بڑی لوگ سی کھڑی تھی۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس وینکلی چیئر پر بیٹھا خالی نظروں سے باہر کا منظر تک رہا تھا۔ وہیں سے میں نے چند لمحے پہلے دو بڑی عرصہ یز گاڑیاں ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوتی بھی دیکھی تھیں۔ کچھ دیر میں ہی رہداری کا دوسرا شور میرے دروازے کے قریب آ کر ختم گیا۔ دروازہ کھلا اور اس میں سب سے پہلے ایک مانوس عورت کا چہرہ اندر آتے ہوئے نظر آیا۔ وہ عورت چند لمحے تو کچھ میں لگ سی کھڑکی مجھے دیکھتی رہی اور پھر پتہ نہیں اُسے کیا ہوا، وہ رو رہے ہوئے دوڑ کر آئی اور میرے گلے لگ گئی۔ اس عورت کے پیچھے ہی ایک بچی عمر کا باوقار سا مرد جس نے بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا اور دو اور لڑکے بھی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے چھوٹا لڑکا جو عمر میں مجھ سے ایک دو سال ہی کم ہو گا اس عورت کی طرح رونے لگا اور کبھی میرے چہرے اور کبھی میرے بالوں کو چھونے لگا۔ مجھے بڑی الجھن محسوس ہوئی۔ پھر نہ جانے ڈاکٹر نے اندر آ کر اس عورت سے کیا سرگوشی کی اور اس باوقار مرد سے کیا کہا کہ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور اس عورت کو کچل کر کھڑا کر دیا اور اُسے چُپ رہنے کو کہا۔ وہ سب لوگ رات دیر تک میرے ہی کمرے میں موجود رہے۔ پھر مجھے نیند آنے لگی تو نرس نے ہیلپر کی مدد سے مجھے بستر تک پہنچا دیا۔ سونے سے پہلے ایک عجیب سی بات ہوئی، اس باوقار مرد نے آگے بڑھ کر میرے گال پر زور سے جھکی دی۔ مجھے یہاں کہ جیسے بہت پہلے بچپن میں بھی جب میں سونے لگتا تھا تو کوئی جاتے جاتے میرے گال کو اسی طرح تھپک کر جاتا تھا۔

اگلے دن سو کر اٹھا تو میرے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ وہ سب لوگ جو کل میرے کمرے میں گھس آئے تھے وہ بھی وہیں موجود تھے لیکن وہ عورت اور وہ مرد ڈاکٹر سے نہ جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر شاید انہیں کچھ اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر ہند تھے لیکن ڈاکٹر انہیں کہہ رہا تھا کہ بہتر ہے کہ مجھے مکمل ٹھیک ہونے تک صدیقی صاحب کے ساتھ ہی جانے دیا جائے۔ اور یہ بات تو یہی ہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جانے کیوں ان سب کو دیکھتے ہی دماغ پرک عجیب سا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ پھر جیسے مرد اور عورت کو ڈاکٹر کی بات سمجھ میں آ گئی کیونکہ انہوں نے شاید میرے چہرے پر اپنے بے ناگواری کی ہر دیکھ لی تھی۔ میں صدیقی صاحب کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سب لوگ اور گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ ہی وہاں تک آئیں۔ پھر تو یہ روز کا معمول ہی بن گیا۔ وہ سب لوگ روز ہی صدیقی صاحب کے گھر چلے آتے جہاں میں برآمدے یا مچن والے باغیچے میں وینکلی چیئر پر بیٹھا کسی بچوں کسی دیوار کو تکیہ رہا ہوتا۔ پھر ایک دن ایک عجیب سی بات ہوئی۔ ایک شخص جو رانا نیو کی دردی میں ملیں تھا ایک جوان لڑکی کے ساتھ صدیقی صاحب کے گھر آیا۔ دونوں ہی جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ لڑکی تو نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ پھر اس دردی والے ڈرائیور اور صدیقی صاحب نے اُسے بمشکل چُپ کر دیا۔ پھر اُس لڑکی نے صدیقی صاحب سے میرے کپڑوں اور دیگر چیزوں کے بارے میں پوچھا۔ صدیقی صاحب جانے کہاں سے ایک آدھ ہنٹ شرت اور فلیو کی وردی اٹھا لائے۔ وہ لڑکی تیزی سے اس شرت اور وردی کے جیب ٹٹولنے لگی۔ پھر جانے ان کپڑوں کی کس جیب سے دو سو فی نقل کر برآمدے کے فرش پر گرے، وہیں اسی لڑکی کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ہی وہ دو سو فی

کپڑوں سے نکل کر فرش پر پھٹے تھے۔ میرے ہاتھ بے اختیار میس ان موتیوں کو سنبھالنے کے لیے اٹھ گئے جیسے میری کوئی بہت ہی قیمتی اور اہم چیز زمین پر گر کر رہی ہو۔ پھر جانے کیا ہوا، ان موتیوں کے گرنے کی آواز کا ارتعاش جیسے ہی میرے کانوں سے ٹکرایا۔ میرے اندر نہ جانے کتنا کچھ جھنجھٹا گیا۔ موتی گرنے کے بعد دوبارہ اُچھلے اور پھر زمین سے ٹکرائے میرے اندر پھر ایک جھٹکار سی پیدا ہوئی۔ زور بیٹھے مجھے یہ سب کچھ ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی فلم کو سوسائٹن میں چلا دیا جائے۔ تیسری بار موتی زمین پر ٹکرانے سے پہلے ہی میرے دہن میں ایک دم جھماکے سے ہونے لگے۔ میرے ذہن پر جی برف پھینسی گئی۔ یہ موتی تو مجھے ایمان نے دیے تھے۔ ہاں ہاں۔۔۔ یہ تو وہی دو موتی تھے، لیکن یہ یہاں۔۔۔ اور یہ لڑکی۔۔۔ یہ تو کھت تھی جو دردی میں بیوس شا کر کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھی۔ اور یہ صدیقی صاحب۔۔۔ پھر اچانک مجھے اس کالی رات سے لے کر اب تک کا ہر واقعہ ہر چہرہ صاف نظر آتا گیا۔ ہسپتال میں کوئی اور نہیں بلکہ شا کر کے ساتھ کشن صاحب امی اور باقی گھروالے آئے تھے۔ ایمان چلی گئی تھی اور کتنے افسوس اور شرم کی بات تھی کہ میں اب تک زندہ تھا۔ میرے سر میں شدید درد سا اٹھا۔ ڈاکٹرز نے بعد میں مجھے بتایا کہ میں شدیدہ صدے سے اسی رات عارضی طور پر اپنا دماغی کنٹرول کھو بیٹھا تھا۔ میڈیکل کی زبان میں اسے شاید نپیری ایمنیو یا کہتے تھے۔ یہ واقعات میں آج تک سینما کے پردے پر دیکھتا رہا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی بھی ایک ایسے دور سے گزرنے والی تھی۔

آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ کشن صاحب اور امی نے صدیقی صاحب کے گھر کے بہت چکر لگائے تاکہ میں ان کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔ صدیقی صاحب بھی ان کے حامی تھے لیکن جس دن میں نے ان کو یہ کہہ دیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے بھی کہیں اور چلا جاؤں تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ اس دن کے بعد انہوں نے مجھ سے گھر جانے کا بھی نہیں کہا۔ کشن صاحب اور امی، اب بھی، عہدہ کی سب اپنے کیے پر بے حد شرمندہ تھے۔ لیکن اب مجھے ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ جس کے لیے میں جی رہا تھا جب وہی نہیں رہی تو آگے کی زندگی کے ماہ و سال کہاں اور کس حال میں گزرنے لگے۔ اس سے مجھے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ عہدہ البتہ روز شام کو مجھ سے اسٹیشن پر آ کر مل جاتا تھا۔ اب سب ہی یہ جان چکے تھے کہ میں ریٹائرڈ کشن امجد رضا کا بیٹا اور ایک رئیس زادہ ہوں۔ لیکن میرے دوست اب بھی وہیں رہنے لوگ تھے۔ خیر اور غور اب بھی میرا اسی طرح خیال رکھتے تھے۔ لیکن ہوش و حواس واپس ملنے کے بعد بھی میرے لفظ مجھے واپس نہیں مل سکے۔ میرا بونا چلنا ہلکل ہی شتم ہو چکا تھا۔ میں گھنٹوں ایک ہی جگہ بنا کسی سے کوئی بات کیے چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی ہاتھ سے پکڑ کر کہیں زبردستی لے جاتا تو چل پڑتا اور نہ وہیں بیٹھا خلا میں کھتا رہتا۔ میں اب تک وہی طور پر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پایا تھا کہ ایمان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مجھے اس ساری دنیا سے ہی بے زاری محسوس ہوتی تھی جس میں میں خواہ مخواہ ہی جیے جا رہا تھا۔ مجھے اس مذہب سے چڑھ گئی تھی جس نے مجھ سے میری ایمان کو چھین لیا تھا۔ وہ معصوم لڑکی مذہب و محبت کے درمیان کی اس جنگ میں پس گئی تھی۔ اس کا تازک دل اور سیدھا سادہ دماغ اس جنگ کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پایا اور اس نے اپنی زندگی ہار دی۔ محبت مذہب کی بھیجٹ چڑھ گئی تھی۔ محبت مذہب پر قربان ہو گئی تھی۔

درمیان میں ایک آدم مرتبہ عبداللہ بھی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ بس ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہتے اور پھر وہ الوداع کہہ کر چل دیتا۔ اس کا غم، میرے دکھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ہم انھوں کی بولی سے زیادہ آپس میں خاموشی کی زبان زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی یہ لفظ بھی احساسات اور جذبات کو کس قدر بے توقیر کر دیتے ہیں۔ ان کی عزت اور وقار کم کر دیتے ہیں۔ ان کی شدت کو بیان نہیں کر

پاستے۔ صبح مایے تو لفظ کبھی کبھی ہمارے محسوسات اور جذباتوں کو بے عزت کر دیتے ہیں شاید اسی لیے میں اور عبداللہ آپس میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ بس خاموش رہ کر ایک دوسرے کا کرب محسوس کرتے تھے۔

واپس ہوش میں آنے کے بعد جب پہلی مرتبہ نگہت سے ملاقات ہوئی تو اس نے مولوی علیم کی اس گایا پٹ کے بارے میں بتایا جب مجھے پتہ چلا کہ ایمان اس آخری رات سے دو راتیں پہلے ہی اس جان کنی کے عالم میں تھی، ایسا لگتا تھا کہ اس کی روح نکلنے کے لیے بے چین ہے لیکن کسی کے انتظار میں نکل نہیں پاتی۔ ڈاکٹروں نے تو تین دن پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی دعاؤں پر دواؤں سے زیادہ بھروسہ تھا لیکن تیسرے دن وہ بھی نوٹ گئے۔ عبداللہ نے ان کے بیروں پر اپنا سر رکھ دیا کہ آخری بار وہ ان سب کی بات مان لیں۔ جیو جاتی تھی کہ ایمان کو کس کا انتظار ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایمان ساری عمر بھی چاہے ایسے ہی کیوں نہ نہرتی رہے لیکن اس کے اندر کی ایمان اسے کبھی لب نہیں کھولنے دے گی۔ جیانیے بھی عبداللہ کو مجھے بولانے کے لیے کہتا تھا۔ عبداللہ نے حیا سے اس بارے میں دوسرا کوئی سوال ہی نہیں کیا اور براہ راست مولوی صاحب کی عدالت میں عرضی لگا دی تھی۔ مولوی صاحب پہلی رات تو بہت جریز ہوئے اور انہوں نے عبداللہ کو سخت سسٹ بھی ستادی تھیں۔ لیکن پھر دوسری رات اور پھر آخری رات جیسے جیسے ایمان کی حالت بگڑتی گئی ان کے اندر کا سخت گیر خد ہی باپ ٹوٹا گیا، حتیٰ کہ تیسری شام جب عبداللہ ان کے سامنے رو پڑ تو ان سے بھی برداشت نہ ہو سکا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے کسی نامرغ کو اپنے گھر کی نہ صرف دلہیز بلکہ زانے کی حد عبور کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ شاید وہ اسی عہد اندر سے نوٹ گئے تھے جب انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ ایمان بھی میری محبت میں اتنی ہی جلتا تھی جتنی نہیں۔۔۔۔۔ شاید ان کے لیے یہ تصور ہی محال تھا کہ ایمان صرف ان کی تابعداری میں اس رشتے کے لیے رضا مند ہوئی ہے۔ وہ اپنے تصور کی آخری حد تک جا کر بھی یہ گمان نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی کے دل میں یوں چور دروازے سے کوئی اندر بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ان کے اندر کے مذہبی نسان کے لیے یہ بہت بڑا تازیانہ تھا۔ دوسری طرف ان کے اندر بے ایک پیار کرنے والے باپ کے لیے یہ بہت اذیت ناک تھا کہ ان کی جان سے پیاری بیٹی نے اپنی زندگی ان کی خوشی کے لیے قربان کر دی لیکن انہیں اپنے دل کی حالت کے بارے میں احساس تک نہیں ہونے دیا۔ شاید اس رات عبداللہ کو مجھے جالانے کی اجازت دینے والا شخص مولوی علیم الدین نہیں بلکہ صرف ایک باپ ہی تھا۔ لیکن اس باپ نے بہت دیر کر دی تھی، جب تک اُسے ہوش آیا وہ اپنی بیٹی کو چمکا تھا۔

مجھے نگہت نے ایک بند لفاظ بھی دیا تھا جسے میں روزانہ کھولنے کی ہمت کرتا اور روزی ہار کر واپس سنبھال کر رکھ دیتا تھا۔ نگہت نے بتایا تھا کہ یہ لفظ ایمان نے اُسے اپنی بیماری کے دوران دیا تھا کہ اُس کی شادی کے بعد نگہت وہ لفظ مجھ تک پہنچاؤ اسے اس مازنین کو کیا خبر تھی کہ قدرت نے اس کی سانسیں ہی گن رکھی ہیں۔

پتہ نہیں میں ایمان کے اس آخری خط کو کھولنے سے اس قدر کیوں ہچکچاتا تھا۔ میں ایک مقدس تحریر کی طرح اس بند لفظ کو روزانہ اٹھاتا، چومتا، آنکھوں اور ماتھے سے لگاتا اور پھر واپس اسی دراز میں رکھ دیتا جہاں سے میں نے اُسے اٹھا یا تھا۔ شاید میں اپنے اندر اس احساس کو چاوداں رکھنا چاہتا تھا کہ ایمان اب بھی اپنی اُس ان پڑھی تحریر کی صورت میں میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اُس کی ان کچی باتوں کو اپنے صبح وشام کے تھیز کی صورت میں زندگی گزرنے کا اک بہانہ بنانا چاہتا تھا۔

لیکن پھر ایک دن مجھے اس عذاب سے بھی گزرنا پڑا۔ رحیم کو صدیقی صاحب نے جانے کون سا کاغذ مانے کے لیے دفتر سے دن کے وقت فون کیا۔ وہ گھر پر کھانا بنا رہا تھا۔ وہ جانے کیا سمجھ اور میری دراز سے ایمان کا وہ بند خط اٹھا لایا اور لا کر صدیقی صاحب کو دے دیا۔ صدیقی صاحب بھی جانے کس دھن میں تھے کہ یہ فکھول بیٹھے اور پھر کاغذ پر نظر پڑتے ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں اس وقت پیٹ فارم کے ایک سنان گوٹے میں بیٹھا دو دروں کو مال گاڑی سے سارے اُتارتے دیکھ رہا تھا۔ نظر بٹکی تو صدیقی صاحب کو اپنے سامنے کھڑا پایا، میں سٹپ چ کر کھڑا ہو گیا۔

”معافی چاہتا ہوں میں۔۔۔۔۔ رحیم کو کوئی کاغذ گھر سے لانے کے لیے کہا تھا۔ وہ جلدی میں تمہاری کوئی ذاتی تحریر اٹھا لیا۔ اور میں بھی بے خیالی میں اسے کھول بیٹھا، لیکن اطمینان رکھو، اس تحریر کے سارے لفظ ویسے ہی ان چھوئے ہیں جیسے بند لگانے میں تھے۔“

صدیقی صاحب ایمان کا خط کھلے لگانے کی صورت میں میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں تھا کہ وہ اس چپے گئے۔ میری حالت ایک لمحے میں کسی برسوں کے چار جیسی ہو گئی تھی۔ ناگوں میں سے جیسے کسی نے ایک لخت ہی جان نکال دی ہو۔ گھبرا کر وہیں بیٹھ گیا۔ دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے میری نظروں کے سامنے ایمان کا خط نہیں بلکہ وہ خود موجود ہو۔ کتنے دن سے یہ خط میرے پاس بند پڑا ہوا تھا لیکن اُسے کھول کر پڑھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی، اور آج جب صدیقی صاحب نے غلطی سے اُسے کھول لیا تھا تو میرا دل اُسے پڑھنے کے لیے بے تابی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ایمان سے ہات کرتے ہوئے اس دل میں اٹھل پھل ہوتی تھی، بالکل وہی کیفیت تھی اس وقت میری۔ آخر کار میں نے کانپتی لکٹیوں سے خط کی جھین کھول ہی دیں۔ اس گل رُخ کی وہی دل میں سیدھی اُتر جانے والی تحریر میری نظروں کے سامنے تھی اور آنسو خود بخود میری آنکھوں سے رواں ہو گئے۔

”میں جانتی ہوں آپ ابھی تک گھر واپس نہیں گئے ہوں گے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا۔۔۔۔۔ محبت میں ضد نہیں ہوتی۔ محبت تو ہتھیار ڈال دینے کا نام ہے۔ جیت کر بھی ہتھیار ڈال دینا صرف محبت کرنے والوں کا ہی تو شیوہ ہے۔ سب بھی جیت چکے ہیں حماد۔۔۔۔۔ بس اب میری خاطر ہتھیار ڈال دیں۔۔۔۔۔“

اور پھر محبت صرف پائینے کا ہی تو نام نہیں ہوتا۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ زندہ رہنے کے لیے کبھی کبھی بس ایک طاقت ہی کافی ہوتی ہے۔ زندگی اس کی یاد کے سہارے آرام سے کافی جاسکتی ہے۔ میں آپ سے یہاں نہیں مل پائی تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ اس ابدی زندگی میں ساتھ رہنے کی دعا تو سدا میرے ساتھ رہے گی نا۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں آپ کو دوسری کے لیے بہت سے بھرم تو ڈنا پڑیں گے اپنے اندر کے آئینے سے لڑنا بھی پڑے گا۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

اپنا بہت خیال رکھیے گا درمیں خوش رہیے گا۔“

☆☆



جانے میں نے اس عشق طراز کا یہ خط کتنی بار پڑھا اور جانے میں کتنی دیر سے چکیاں لے لے کر روتا رہا۔ پھر کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا، وہ عبداللہ تھا۔ پتہ نہیں کب سے وہ یہاں کھڑا تھا۔ عبداللہ نے میرے گالوں پر ہچکے آتے ہوئے پوچھا کہ میری آنکھوں میں جھانکا۔

”کب تک آپ ہم سب کو راتے رہیں گے۔ دیکھیں۔۔۔ آج آپ سے ملنے کون کون آیا ہے۔“

میں نے حیرت سے عبداللہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور ہلکلا کر کھڑا ہو گیا۔ لگتا تھا پلٹ فارم میرے اور شا کر کے گھر والوں سے ہی بھرا ہوا تھا۔ امی، عباد، بھائی، عہد، بھابی، عباد، سنی، شا کر اور تجت کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی کشف صاحبہ اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سب سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار آنے میں بہت وقت لگا۔ مولوی عظیم الدین آنکھوں میں آنسو لیے، سب سے آگے کشف صاحبہ کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ شہر کا سب سے دیگ، ریٹائرڈ کشف ایک غریب مولوی کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی سدا کی مغرور آنکھوں میں نفرت کے بجائے شرمندگی تھی اور اس کی ہمیشہ سے اکڑی ہوئی کمر جلی ہوئی تھی۔ وہ سب وہیں کھڑے رہے، بس مولوی صاحبہ میری طرف بڑھے میری نظریں خود بخود جھک گئیں، وہ قریب آگئے اور میرے شانوں پر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

”تم جیت گئے ہو تم وہاں، تمہاری محبت جیت گئی ہے۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ محبت جی ہو تو وہ سارے زمانے کو اپنے آگے جھکا سکتی ہے۔ ہم سب اندر سے ٹوٹ چکے ہیں۔ سب تم سے بے حد شرمندہ ہیں۔ کشف صاحبہ خود چل کر میرے گھر آئے تھے۔ انہوں نے اور تیمم صاحبہ نے اور سب نے اپنی غلطی کی تلافی کر دی ہے۔ معاف کر دیے میں ہی عظمت ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ سب سے پہلے مجھے اور پھر اس کے بعد اپنے گھر والوں کو بھی معاف کر دو۔ ہم سب تمہاری محبت کی عظمت کے سامنے بہت چھوٹے ہیں۔ اور چھوٹوں کو سزا نہیں دی جاتی۔ درگزر کیا جاتا ہے، تم بھی درگزر کر دو۔۔۔۔۔“

مولوی عظیم نے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرنا چاہی لیکن میں نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور ہم دونوں کی آنکھوں میں چھپے سیلاب بہہ نکلے۔ وہ مجھے چمکتے رہے لیکن خود کو بھی رونے سے نذر دک پائے۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے چند قدم دُور کھڑے کشف صاحبہ کے پاس آئے۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ انہوں نے بچپن کی طرح میرے گال کو زور سے سہلایا۔ اچانک میرے سامنے سے ریٹائرڈ کشف احمد رضا غائب ہو گئے، اور میرے بچپن والے بابا آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی ہانہیں پھیلائیں اور میں ان کے سینے میں منہ چسپا کر سسک پڑا، وہ بھی مجھے گلے لگائے روتے رہے۔ برسوں کے بعد ایک باپ نے ایک بیٹے کو گلے لگایا تھا۔ پھر تو کیا تھا، لگتا تھا کہ سارا اسٹیشن ہی وہاں اٹھ آیا ہے۔ امی، عباد، عباد، بھائی، شا کر، تجت سب ہی مجھے اپنے جگٹھے میں لیے ہوئے چھو رہے تھے، پیار کر رہے تھے، ارد رہے تھے، یہ آنسو بھی جذباتوں کے اظہار کا کیسہ دُور دُور ہوتے ہیں۔ یہ اُسی کے لیے آنکھوں سے نچکتے ہیں جو آپ کے اپنے ہوتے ہیں، آپ کو پیارے ہوتے ہیں۔ درباب کو تو میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ غمور اچھی دُور خیر و اور دیگر مزدوروں کے ساتھ کھڑا رہا رکنا دھم پر



پڑے رومال سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ آج ان سب کے چہروں پر بھی اک عجیب سی خوشی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اندر سے اُداس بھی تھے۔ شاید وہ جان چکے تھے کہ اب میرا ان سے رخصت ہونے کا وقت قریب آچکا ہے۔ لیکن میرا وجود چاہے ان سے دور جا رہا ہو۔ پر میری روح تو ہمیشہ انہی رشتوں کے درمیان موجود رہے گی۔ کچھ رشتے ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنتے ہیں۔ غمخوار اور خیر و غیرہ کمشنر صاحب کے رعب کی وجہ سے قریب نہیں آ پار ہے تھے۔ وہاں نے انہیں دُور سے میری طرف ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر خود ان کی طرف چلے آئے۔ میں نے ان سب کا وہاں سے اسی طرح تعارف کر دیا جس طرح میں بچپن میں اپنے دوستوں سے ان کا تعارف کر داتا تھا۔ وہاں بھی آج بالکل وہی بچپن داے بابا بن گئے تھے۔ سب سے فردا فردا ہاتھ ملایا اور ان سب کا میرا اتنا خیال رکھنے پر سب کا شکریہ بھی ادا کیا۔ صدیقی صاحب بھی حتی دیر میں وہاں آچکے تھے۔ وہاں نے بہت دیر تک انہیں گلے سے لگائے رکھا۔ شیدائش کر انہیں صدیقی صاحب اور ان سب کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتا چکا تھا۔

مجھے ان سب نے اسٹیشن سے اس طرح رخصت کیا جیسے میری بارات وہاں سے نکل رہی ہو۔ ہاں۔۔۔۔۔ سچ ہی تو ہے، میرے ساتھ ایمان کی یادوں کی بارات ہی تو تھی۔ وہ مجھ سے جدا کب تھی۔ ہر لمحہ میرے ساتھ ہی تو رہتی تھی۔ مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ میرا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ تنہائی میں میرے آنسو پونچھتی تھی۔ میرے ہاتھ تھم کر اپنی آنکھوں سے لگاتی تھی۔

گھر واپس آ کر میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ پایا۔ میں نے خود بابا سے کہہ کر لندن میں یونیورسٹی میں داخلے کے فارم منگوا لیے۔ اگلے مہینے ہی یونیورسٹی سے بلاوا آ گیا اور میں نو مہر کی ایک سردشام ایمان کے شہر سے اس کی گلابی یادوں سے رخصت ہو گیا۔

”تمہیں جب بھی ملیں فرمیں

میرے دل سے یہ بوجھ اتار دو

میں بہت دلوں سے اُداس ہوں

مجھے کوئی شام اُدھار دو۔۔۔۔

کسی اور کو میرے حال سے

بے غرض ہے نہ کوئی واسطہ

میں بکھر گیا ہوں

سمیٹ لو۔۔۔۔

میں بگڑ گیا ہوں،

سنو اورو۔۔۔۔“

## خواتین کے مقبول ترین ناول

دو حصے

چاند کے قیدی

قیمت فی حصہ: 300

سیما غزل

☆☆☆

## یادوں کی بارات

ایمان چلی گئی اور میں اُس کے جانے کے بعد ندن آ گیا۔ شاید میں بھی کہیں نہ کہیں اپنے ذہن میں اس نظریے کی غلط فہمی کا شکار تھا کہ شاید اس کا شہر چھوڑ دینے کے بعد میرے درد میں کچھ کی واقع ہو جائے گی لیکن اب کچھ نہیں ہوا۔ اُس کی یاد وہ فخر تھا جو ہمیشہ میرے دل کے عین بیچ گزرا رہا۔ جب تک لوگ اُس پاس ہوتے، ذہن کچھ بنا رہتا، لیکن تنہائی ملتے ہی مجھے اس کی وہ دو بڑی بڑی آنکھیں گھیر لیتیں۔۔۔۔۔ اس کے دیے ہوئے وہ دونوں موتی اور اس کا آخری خط میرے ساتھی بن جاتے اور گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کی یاد کے آنے سے میری تنہائی ہی میری سب سے بڑی محفل بن جاتی اور لوگوں کے بیچ میں اکڑتا رہتا۔ جیسے ہی لوگ میرے پاس آتے میں تنہا ہو جاتا تھا۔ پھر گھنٹوں بیٹھا بیٹھ چھپنے کا انتظار کرتا تا کہ لوگ جائیں، مجھے تنہائی ملے اور پھر سے اٹنی محفل جاسکوں۔ صرف ایک کامران میرے دوستوں میں سے ایسا تھا جسے میرے دل کی حالت کا علم تھا۔ جب گزشتہ دنوں میں نے اُسے ایمان کے چلے جانے کے بارے میں پہلی مرتبہ کھل کر بتایا تو بہت دیر تک تو وہ سکتے کی کیفیت سے ہی نہیں نکل پایا۔ اُنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرتے رہے۔ آج تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ایمان کی شادی کہیں اور ہو گئی ہوگی، کیونکہ پچھلے دو سال سے نہ وہ پاکستان آیا تھا اور نہ ہی میں نے اسٹیشن پر ملازمت کے بعد اور لندن آنے سے پہلے تک اس سے کوئی رابطہ رکھا تھا۔ کامران اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ مجبوراً مجھے اُسے خواب آور دوا دے کر اس رات سلا بنا دیا تھا۔ بہت دنوں تک وہ مجھ سے بھی رو دھا رو دھا رہا کہ میں نے اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اُسے خبر کیوں نہ کی۔ اسے میرے آہنی اعصاب پر بھی حیرت تھی کہ میں اب تک جاں بچا کیسے رہا تھا۔۔۔۔۔ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہی تو اصل شرمندگی کی بات تھی۔ کاش میرے حواس بھی ایمان کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے چمے جاتے۔ لیکن مجھے تو وہ جاتے جاتے جینے کی سزا مل گئی تھی۔ اور میں تھا کہ سزا کے طور پر جے جا رہا تھا۔۔۔۔۔

ربیکا بھی مجھ سے ہمیشہ یہی گدگداتی تھی کہ میں سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب کے بیچ نہیں ہوتا۔ جانے کہاں بھٹکتا رہتا ہوں۔ اہستہ آہستہ آج اس کی ناراضگی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ دراصل اُسے میں نے سچ ہی بتایا تھا کہ میں سارہ کے گھر رات کھانے پر مدعو تھا۔ ربیکا رات بھر کی برف ہاری کے بعد نہر کے ساتھ جمی برف سے استونین بنانے کی کوششوں میں مصروف تھی اور اس کوشش میں اس کے سفید ہاتھ پہلے سرخ اور اب سردی سے نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ یہ بات سنتے ہی وہ برف کا ڈیر چھوڑ پھاڑ کر تیزی سے میری جانب لگی۔

”کیا کیا۔۔۔ سارہ کے گھر کھانے پر گئے تھے۔ رات کو۔۔۔ اور مجھے ابھی بتا رہے ہو، یہ بھلا کیا بات ہوئی؟“

”اس نے دوپہر ساڑھے تین بجے مجھے یہ خبر کی تھی تب تک تم جا چکی تھیں۔ شام کو نہیں لائبریری کھانا کھا رہا اور اب جب تم ملی ہو تو بتا رہا ہوں۔“

ربیکا جانے کیوں رو دہائی ہی ہو گئی۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

”جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے تمہیں سارہ کے ساتھ دیکھ کر۔ غلطی میری ہی ہے، ایک ہی شخص ہر کسی کے لیے ایک سا دون نہیں سکتا۔“

اس کے وجود کی غلطی ہوئیں بھی پر یکساں نہیں برس سکتیں۔ لیکن مجھے کوئی ٹھکر نہیں ہے۔ میرے لیے تمہارے وجود کا صحرا ہی غنیمت ہے۔ میں اپنے اس مقدر پر بھی بہت خوش ہوں۔۔۔۔۔“

ابھی ربیکا کی بات مکمل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اچانک ہی سامنے سے سارہ آتی دکھائی دی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے گہرے سرخ کی بند گلی کی سوئیر اور کافی جنز ہارن رکھی تھی۔ برف سے بچاؤ کے لیے بند جوتے پہنے وہ ہماری طرف بڑھی چلی آئی۔ اس کے کاندھوں پر وہی جیکٹ تھی جو رت سردی سے بچاؤ کے لیے میں اس کے کاندھوں پر ڈال آیا تھا۔ ربیکا میری جیکٹ کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اُس نے غور سے آتی سارہ کو دیکھا اور پھر سے اپنے برف کے ادھ بنے پتلے کی طرف بڑھ گئی۔ سارہ نے قریب آ کر جیکٹ میرے حوالے کی۔

”یہ وہی تمہاری مانت۔۔۔۔۔ رات کو میرا دھیان مٹانے کے لیے بہت بہت شکریہ۔“ ”سرا نرک نے کہیں بعد میں میری جیبوں کی تلاشی تو نہیں لی کیسے میں۔“ سارہ زور سے ہنس پڑی۔

”اب ایسے بھی نہیں ہیں میرے پاپ۔۔۔۔۔ رات کو بھی انہوں نے تمہارے جانے کے بعد خود مجھ سے سوئی کہا تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ واقعی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“

ربیکا نے برف سے گیسے اپنے ہاتھ جھارے اور پلٹ کر بولی۔

”بھئی میں تو اندر کیپس میں جا رہی ہوں۔ ورنہ میرے ہاتھ یہیں کٹ کر گر جائیں گے۔“

سارہ اُسے روکتی ہی رو گئی لیکن ربیکا نے پٹ کر نہیں دیکھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کر جیسے اگر وہ مز کر دیکھتی تو اس کی ہیکلی آنکھیں بھی سارہ کو نظر آ جاتیں۔ سارہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”اسے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ ہے مسٹر صاحب۔۔۔۔۔ تم نے میری سب سے پیاری کینلی کو اتنا آداس کیوں کر دیا ہے۔ یہ ایسی تو کبھی بھی نہ تھی؟“

”شاید آداسی میرے آس پاس بکھری رہتی ہے، جو بھی میرے ساتھ رہتا ہے وہ اس آداسی کے گہرے میں ڈوب جاتا ہے۔“

سارہ نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”تم باتیں بہت خوبصورت کرتے ہو۔ ربیکا بھی تمہاری انہی باتوں سے گھل کر ہوتی نظر آ رہی ہے۔ کچھ بات تو ہے تم میں؟“

مجھے اس کے سوالیہ انداز پر ہنسی آ گئی۔

”یہ سواں ہے یا کوئی فیصلہ۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے اپنے پاپا کو کل رات سے زیادہ پریشان اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ وہ بہت مضبوط انسان ہیں۔ زندگی کی ہر بڑی سختی کو انہوں نے مسکراتے ہوئے جھیل لیا ہے، اسی لیے وہ ہمیشہ سے میرے آئیڈیل بھی رہے ہیں۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔۔۔ جب سے تم اس یونیورسٹی میں آئے ہو، میں نے انہیں تمہاری جانب سے کسی نہ کسی الجھن میں ہی جتلا پایا ہے۔ کل رات بھی میری پاپ سے اسی بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کیا وہ مجھے یا میرے عقیدے کو اتنا کمزور سمجھتے ہیں کہ میں اس سے پلٹ جاؤں گی۔ ہمیں بچپن سے یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم عظیم ہیں اور عظیم رہیں گے۔۔۔۔۔ تو کیا ہماری عظمت کسی ایک لڑکے کے انکار کرنے سے کیا کم ہو جائے گی۔ کیا

ہمارا عقیدہ اتنا کمزور ہے کہ کسی ورکا ایمان اس میں دراڑیں ڈال دے گا۔۔۔۔۔؟“

”میں چپ کر کے اس پر اعتنا لڑکی کی بات سنتا ہوں۔“

”پھر تمہارے پاپا نے تمہیں کیا جواب دیا۔“

”مجھے حیرت اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے رواجی باپ کے رویے سے کام لیا۔ جو دیل اور داجک کی بجائے پنا

تھر پر اور خدشات اپنے بچے کے ذہن میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اندر کے خوف سے اسے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم نے اس دن کہا تھا کہ اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔ اگر یہ اندھیرا ہے تو میں خود بھی اس اندھیرے کا ایک حصہ ہوں۔۔۔۔۔ پھر مجھے تم سے تمہارے عقیدے سے

خوف محسوس کیوں نہیں ہوتا؟“

سارہ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ سر آئزک کے رویے نے اسے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں اس کی باتیں سن کر یہ سوچتا رہا کہ مغرب اور

مشرق کے رویوں میں کس قدر فرق ہے۔ یہاں مغرب میں ایک مٹی باپ سے اپنے غلط یا صحیح ہونے پر باقاعدہ کسی ملامت کی طرح جرح کر سکتی تھی۔ اس سے لڑ سکتی تھی، روٹھ کر ناراض ہو سکتی تھی جب کہ مشرق میں کسی جوان لڑکی کا باپ کے سامنے یوں کھڑا ہونا بھی محال تھا۔ چہ جائیکہ وہ اپنے باپ سے کوئی سوال کر سکے۔ جانے کیوں مجھے اس لئے ایمان بہت شدت سے یاد آئی۔ سارہ اپنی رو میں نہ جانے کیا کچھ بولی رہی۔ پھر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کہاں کھوجا جاتے ہو یوں پلے بھر میں۔“

آج اس نے بھی اچانک وہی سوال پوچھ لیا تھا جو بچہ اس سے پہلے کئی مرتبہ پوچھ چکی تھی۔

”کہیں نہیں۔۔۔۔۔ بس تمہاری بات سن رہا تھا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تم میری بات سننے ہوئے بھی یہاں نہیں تھے، تم کبھی بھی ہم لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتے۔ میں نے آج تک کسی کی

آنکھوں میں اُداسی کے اتنے پھنور ایک جگہ اکٹھے نہیں دیکھے۔ اگر کوئی بہت ذاتی بات نہ ہو تو تم مجھ پر اعتنا کر سکتے ہو۔“

اب میں اس مصوم لڑکی کو کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کتنے غم میرے ابدی ساتھی ہیں۔ میں اسے یہ سب بتا کر افسردہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”داستان اتنی لمبی ہے کہ تم سن سن کر اکتا جاؤ گی۔ ہاں البتہ یہ یقین رکھو کہ اس میں کچھ ایسا ذاتی نہیں ہے جسے تم سے چھپایا جائے۔ جب

کبھی ہمیں فرصت ہوئی اور ہم دونوں ساتھ ہوئے تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“

وہ خوش ہو گئی اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

”ودعو۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”اٹھاؤ۔“

پھر وہی دوپٹے سے گڑھے اس کے چہرے کا نور بڑھا گئے۔ کلاس کی گھنٹی تیسری بار بج چکی تھی۔ ہم دونوں ہی وہاں سے چل دیے۔۔۔۔۔

☆☆☆

## خوف

پھر ایک عجیب بات ہوئی، یونیورسٹی انتظامیہ نے اچانک اعلان کر دیا کہ اس سال پیپے کی طرح طالب علم اپنا پرچہ درحقیق ہمیشہ کی طرح کھلے ہال میں تمام یونیورسٹی کے سامنے نہیں پڑھیں گے۔ بلکہ تمام اسٹوڈنٹس پہلے اپنا ٹرم پیپر لائبریری میں جمع کروائیں گے اور انتظامیہ اس کی جانچ اور تحقیق کے بعد چند منتخب شدہ پرچوں کو عام طلباء کے سامنے تقریب میں پڑھنے کی اجازت دے گی۔

سارہ اس بات سے بھی شدید جھلائی ہوئی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اصل میں معاملہ کیا تھا۔ سر آئزک نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنی تحقیق کسی بھی صورت میں دوسروں تک پہنچاؤں۔ وہ اس نئی نسل کو "ہالوکاسٹ" کا وہی زرخ دکھانا چاہتے تھے اور اسی یقین میں زندہ رکھنا چاہتے تھے جو برسوں سے اس نسل تک پہنچایا جا تا رہا تھا۔ مجھے پہلی بار ایک عجیب سا طمانیت بھرا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ خود کو عظیم کہنے والے اصل میں مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ میرے عقیدے سے خوف زدہ ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خود کو عظیم کہلانے کا حق اگر کسی کو ہے تو اصل میں وہ ہم ہیں۔ لیکن ہماری عظمت ہم خود اپنے ہاتھوں سے گنوا چکے ہیں۔ اور ان یہودیوں کو یہ ذرہ کہیں ہم پھر سے اپنی اس عظمت گم گشتہ کو پان لیں۔

بہت دنوں کے بعد سر آئزک آج کلاس میں بے سکون دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ان کے سر سے بہت بڑا بوجھ مل گیا تھا۔ ربیکا پیپے ہی جلی جی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹے ہی سر آئزک سے پوچھ لیا کہ اس مرتبہ اتنے سالوں بعد یونیورسٹی نے ٹرم پیپر سے متعلق اپنا اصول کیوں بدل لیا ہے۔ سر آئزک نے بڑی خوبصورتی سے اسے انتظامیہ کا اندرونی معاملہ کہہ کر نا ل دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہر سال کچھ معیاری پرچوں کے ساتھ ساتھ بہت سے غیر معیاری پرچے بھی آ جاتے تھے۔ اس لیے اس مرتبہ منتخب شدہ پرچوں کو ہی منظر عام پر لایا جائے گا۔ ربیکا نے کانڈ کی چٹ پر لکھ کر چٹ میری طرف کھسکائی، اس نے چٹ پر لکھا تھا کہ کیا وہ سر آئزک سے برا اور است پوچھ لے کہ کہیں یہ پابندی میرے ٹرم پیپر کے موضوع کی وجہ سے تو نہیں لگائی گئی۔۔۔۔۔ ہمیں نے آنکھیں لکال کر اسے گھورا تب کہیں جا کر وہ باز آئی ورنہ اس سے کوئی جید بھی نہ تھی کہ وہ یہ سوال بھی سر آئزک سے کر ہی نہ سکتی۔

اتفاق سے سارہ کے ٹرم پیپر کا تعلق بھی "ہالوکاسٹ" سے ہی تھا۔ وہ دراصل فریڈ ہیچ کیلور، نامی ایک یہودی مصنف کی تحقیق پر مبنی تھا مقالہ لکھ رہی تھی جس نے "ہالوکاسٹ" کے حق میں اپنی تصنیف (روزناموں) میں مختلف دلائل دیے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بہت سی کتابوں انٹرویوز اور مختلف حوالوں سے اس مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

سارہ نے مجھ سے کبھی اپنی تحقیق چھپائی نہیں تھی بلکہ وہ مسکرا مسکرا کر مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں اپنی روزانہ کی پیش رفت کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ ربیکا پر وہ بے بہت گراں گزرتے تھے جب سارہ میرے ساتھ کسی بحث میں مصروف ہوتی۔

پھر ایک ایسے ہی آبلے دن جب پوری یونیورسٹی دھوپ سینکنے کے چکر میں چھٹی منانے کے موڈ میں تھی۔ میں نے ربیکا کو ہاتھ سے پکڑ کر

اپنے ساتھ نہر کنارے اپنی مخصوص بیچ پر بیٹھا لیا۔ آج میں نے اس سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ وہ آج میرے اس انداز پر خاصی حیران بھی تھی۔

”بیٹھو یہاں۔۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اس نے حیرت سے اپنے ہاتھ میں پھنسے میرے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ہنس دی۔

”ہے میڈی۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔ آج کہیں مجھے پر پوز کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔“ کاش میں اتنا خوش نصیب ہوتا۔ تمہارے ساتھ پانے والے دونوں جہاں پائے گا۔“ ربیکا کی آنکھوں میں بیک وقت بہت سے شرارے لپکے۔

”واقعی۔۔۔ کیا تم ایسا سمجھتے ہو۔۔۔۔ مجھ میں تو ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ تمہارے وجود میں اور تمہاری اس خوبصورت روح میں وہ سب کچھ موجود ہے جو دنیا کے کسی بھی نوجوان کے خوابوں کی تمنا ہو سکتی ہے۔ تم جس راستے سے گزر جاتی ہو، لوگ گھنٹوں وہاں سہو بیٹھے رہتے ہیں۔ تمہاری ایک جھلک پانے کے لیے تم سے دو گھنٹی بات کرنے کے لیے میں نے یہیں اسی پونہ سو بیٹھی میں جانے کتنوں کو دن رات پریشان دیکھا ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ تم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

میں نے اس بے باک مغربی خن کے چہرے پر پہلی مرتبہ شرم کی سرخی دیکھی۔ عورت دنیا کے کسی خطے کی بھی ہو۔ اس کے اندر کہیں نہ کہیں یہ وصف ضرور موجود ہوتا ہے۔ وہ اس کر بولی ”ہاں۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ خاص بات تو ضرور ہوگی تبھی یہ سب آہیں بھرتے ہیں۔۔۔۔ لیکن وہ خاص بات نہیں جو اس کے پھر دس کہو م کر دے۔ جس کو میں بکھلانا چاہتی ہوں۔ پھر یہ سب کچھ میرے کس کام کا۔“

تو آج ربیکا نے بھی دل کی بات کھل کر کہنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

ہمارے سامنے ٹیز سے ٹپکی اس نہر کا برف جیسا پانی نہایت خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ پانی میں جی برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی حیرت سے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ ایک ایسے ہی برف کے چھوٹے سے سفید سنگ مرمر کی سل نماونے پر پرندوں کا ایک جوتا بیٹھا ہمارے سامنے سے گزرا جو برف میں پھنسی گھاس کے ٹکڑے نکالنے میں مشغول تھا۔ دھوپ سیدھی ربیکا کے سنہری رنگ پر پڑ رہی تھی اور اس کا چہرہ مزید کندہ ہو گیا تھا۔ بلیک سکرٹ اور بلیک ٹاپ میں وہ اس وقت بالکل کالے لٹفل میں لپٹی سونے کی ایک گڑیا لگ رہی تھی۔

ربیکا اپنی بات کہہ کر چپ چاپ بیٹھ کر نہر میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھینکنے لگی۔ اس نے ٹکڑے پھینکنے کے لیے ہاتھ ہوا میں اٹھایا تو میں نے وہیں اس کی گلائی تمام لی۔

”کیا ضروری ہے کہ سب جذبے، ساری خوشیاں، ہر خواہش کسی ایک شخص سے ہی متصل کر دی جائے؟ ہو سکتا ہے وہ بد نصیب اس انعام کا حق دار ہی نہ ہو؟۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حصے کے سارے رنگ، ساری قوس و قزح پہلے ہی کہیں بھرا چکا ہو؟“

ربیکا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اسکی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے۔ ”اگر وہ اپنے حصے کی قوس و قزح پہلے ہی کسی اور کی آنکھوں میں ڈھونڈ چکا ہے تو پھر یوں سمجھو کہ میری زندگی میں بھی ہر رنگ سے میرا حق ہر رنگے بنائی چھن چکا ہے۔ میری محبت بھی ہمیشہ بے نور ہی رہے گی۔“



یا خدا۔۔۔ اس لڑکی کو تنہا مشکل باتیں بھی آتی ہوں گی۔۔۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ شاید یہ محبت ہی ہوتی ہے جو ہمیں ایسی کششیں بولیں سکھا جاتی ہے۔ ربیکا کا دل بھی ضد پراڑ گیا تھا۔ محبت پھر سے اپنا سمیوں دانا کھیل کھیل رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عاشق اور محبوب کی جگہ اور نام بدل گئے تھے۔ باقی ساری چیزیں، ساری کاٹ، سارے گھاؤ وہی تھے۔ کاش ہم انسانوں کو اتنا تو اختیار دیتا ہوتا خدا نے کہ گریہ خود کو نہیں، تو کم از کم دوسروں کو تو اس آگ سے بھرے گڑھے میں گرنے سے روک سکتے۔ لیکن قدرت کو تو خود یہ تماشا دیکھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں میں سے کسی ایک کے دل میں دوسرے کے لیے یہ آگ بھڑکا کر اسے عمر بھر کے لیے سکستا اور تڑپا ہوا دیکھنا پسند کرتی ہے۔ قدرت تو اس کھیل کی ازل سے سب سے بڑی کھلاڑی ہے۔ وہ ابد تک ہم انسانوں کو یونہی تڑپاتی سکتی رہے گی۔ جیسے وہ اس وقت ربیکا کو تڑپا رہی تھی میرے لیے۔ وہ ربیکا جیسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ میری رُوح تو جانے کب کی ایمان کے ساتھ ہی پرواز کر چکی تھی۔ یہ سانس دیتا جسم تو خود اک چلتی پھرتی لاش تھا، محبت کا وہ زہر جو آج اس کی رگوں میں دھیرے دھیرے اتر رہا تھا۔ بہت پہلے میری جان لے چکا تھا۔

ربیکا سر جھکائے بیٹھی اپنے آنسو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی بند کی۔ اس کی جھیل جیسی نمی آنکھوں میں جانے کتنے سمندر چھلنے کو تیار تھے۔

”نہیں۔۔۔ تم نہیں روؤ گی۔۔۔ بہت زلایا اس محبت نے ہم جیسے بے بس انسانوں کو۔ بہت کھیل آیا ہے اس نے ہمارے جذبات کے ساتھ۔ بہت گھونگا جگلی یہ محبت بہت چر کے سہ لیے ہم نے اس کے چٹائے ہوئے اندھے تیروں کے۔۔۔ نہیں ربیکا۔۔۔ تم نہیں روؤ گی۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب اور نہیں۔“

میں اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتا جا رہا تھا اور اسے رونے سے منع کرتا جا رہا تھا لیکن جس رفتار سے میں اس کے آنسو پونچھ رہا تھا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے مزید آنسو اُڑتے آ رہے تھے۔ ربیکا بار بار مجھ سے معذرت کرتی اور نہ رونے کا وعدہ کر رہی تھی لیکن اس کے اندر کا سیلاب آج پوری طرح بہ جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے زور چلی گئی۔ میں اُسے زور جاتے دیکھتا رہا۔ نہر پر راج انوس کے ایک جوڑے نے پانی کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور تیزی سے بڑھ بڑھ کر پانی کے اوپر آ کر بیٹھ گیا۔ ہنسی سے ہنس سے پوچھا۔ ”وہ راج ہنسی رو کیوں رہی تھی۔ اس کا ہنس کہاں ہے؟ ہنس نے ایک لمبی اڑان بھری اور پھر سے ہنسی کے سر پر منڈل کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”یہ انسانوں کی دنیا بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ اس ہنسی کا ہنس تو کہیں زور زور تک نظر نہیں آیا۔ اک ہنس وہاں نہر کنارے بیٹھا تو ہے لیکن اس کی تو اپنی ہنسی کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہ کیسے بے جوڑے ہمارے کھے ہیں تقدیر نے ان انسانوں کے زمین پر۔ ان سے تو ہم ہمارے دشمن پر حیرتے راج ہنس ہی بھلے۔ ہم میں سے ہر اک کا اپنا جوڑا تو ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ بھی ہے۔ ہنسی نے اک دکھ بھری نظر زور بھرتی ربیکا پر اور پھر مجھ پر ڈان اور پھر اپنے ہنس کے ساتھ ایک لمبی اڑان بھر گئی۔ میں وہیں اکیلا، تنہا بیٹھا رہ گیا۔۔۔۔۔

☆☆☆

## گریز محبت

اُس دن کے بعد ربیکا بہت دن تک میرے سامنے آنے سے گریزاں رہی۔ شروع کے دو تین دن تو وہ یونیورسٹی ہی نہیں آئی۔ میں نے اُس کے فون پر اور گھر پر رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سب نمبر بند ملتے تھے۔ پھر جب وہ یونیورسٹی آئی بھی تو بہت بکھری بکھری سی تھی، اور مجھ سے نظریں چراتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن مجھے ہومینئرنگ کی کلاس میں ایک موقع مل ہی گیا۔ اس دن کا موضوع تھا "پاپینے اور کھودینے کا احساس۔" مجھ سے جب سر آئزک نے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے کہا تو میں نے اک اپنی سی نگاہ ربیکا پر ڈالی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ میں نے اصل میں اسی کو مخاطب کیا۔

"احساس اگر محبت کا ہو تو انسان اس میں کبھی کچھ کھوتا نہیں ہے۔ صرف پاتا ہی ہے۔ محبت چاہے یک طرفہ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ آپ کو اک خوبصورت احساس دے کر ہی جاتی ہے۔ چاہے دوسری طرف کا جذبہ اس کے ہم چلے نہ ہو جب بھی۔۔۔۔۔ محبت کسی سوداگر کا سودا تو نہیں کہ دونوں جانب کے پلاڑے ہمیشہ برابر ہی ہوں، دوسرے کا وزن کم ہونے سے ہمارا وزن تو بڑھتا ہی ہے نا۔ اُس کے محبت نہ کرنے سے ہماری محبت پر کیا فرق پڑتا ہے؟ محبت کسی حصے کی توقع میں نہیں کی جاتی۔ ہاں اگر دوسری طرف سے بھی وہی شدت موجود ہو تو سمجھیں کہ احساں دوگنا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر دوسرے کی کم نصیبی سے وہ اس جذبے سے محروم ہے تو پھر بھی اس بات سے اپنے حصے کا احساں نہیں گنوا یا جاسکتا۔ زندگی بتانے کے لیے اک اپنے حصے کا یہ احساس یہ احساں ہی کافی ہے۔ لیکن یاد رہے، محبت کا یہ سفر ننگے پاؤں ایک جلتے اور پتے صحرا میں سدا کے لیے نکلے ہوئے سورج تلے چلنے کا سفر ہے۔ پاؤں کے چھالے گھسنے کے لیے بیٹھ جانے والے اپنی منزل کا نشان کھودتے ہیں۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔"

میں اپنی بات ختم کر کے بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک تب بھی کلاس میں گہرا سکوت سا چھایا رہا۔ ربیکا کی آنکھیں جھلکے کو تیرا تھیں۔ وہ تو بھدا ہو اس گھٹی کا جو کلاس ختم ہونے کی نشانی کے طور پر بج گئی ورنہ آج ساری کلاس ہی ربیکا کے راز سے واقف ہو جاتی۔ ہم سب کلاس سے رفتہ رفتہ نکل گئے۔ میں اپنے خیالوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے پکارتی جوزف کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ تیسری بار اس نے پکارا تو میں چونکا۔ وہ میرے پیچھے ہی تیزی سے چلا آ رہا تھا۔

"ہے مسٹر جادو۔۔۔۔۔ کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہو۔۔۔۔۔؟"

جوزف نے میرا ہاتھ تھاما اور جلدی سے مجھے لے کر یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی اہم بات بتانا چاہتا ہے جس کے لیے اسے تہائی کی ضرورت ہے۔ باہر کل فضا میں کچھتے ہی اُس نے براہ راست مجھ سے پوچھا۔

"اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ تم "بالوکاسٹ" پر اپنے نرم ہیکر یا اس یونیورسٹی میں اپنے داخلے کے خاتمے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب

کرلو، تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟

”آپ میرا جواب اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں قدم رکھ کر چپے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”میں جانتا تھا تو پھر ذہنی طور پر تیار ہو۔ یونورسٹی انتظامیہ نے تم سے ہمیشہ کے لیے ہٹکار پانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید وہ مجھے بھی اس اجلاس میں نہ بلاتے جو گورننگ باڈی نے کل طلب کیا تھا، لیکن ان کی نظر میں میری وقفا داریاں ابھی تک غیر مشکوک ہیں۔ اور پھر شاید اس لیے بھی کہ انہیں آخر میں کہیں نہ کہیں اس فیصلے پر تمام نیچرز کے ساتھ میرے دستخط بھی چاہیے ہوں گے۔“

”لیکن اب مجھ پر کیا الزام ہے؟ نرم ہچہ کو طلباء تک نہ پہنچنے دینے کا تو انہوں نے پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ پھر کیا وجہ ہوگی اس اجلاس بلانے کی؟“

”تم دو تین دن پہلے پارک اسکو اترایو غو کی لائبریری میں گئے تھے؟“

”ہاں گیا تھا۔“

مجھے یاد تھا، یہ اُسی دن کی بات ہے جس رات میں سارہ کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔

”وہاں تمہاری لائبریرین پیئر تھا مس سے کچھ بحث بھی ہوئی تھی۔“

”اُسے بحث تو نہیں کہا جاسکتا۔ بس وہ مجھے چند کتابیں دینے میں پس و پیش کر رہا تھا جو کہ لائبریری کی فہرست (Catalog) کے حساب سے لائبریری میں ہی موجود ہونی چاہئیں تھیں۔ لیکن یہ واقعہ تو یونورسٹی سے باہر کا ہے۔ اس سے انتظامیہ کا کیا تعلق۔“

”شاید تم نہیں جانتے۔ پیئر خود بھی رومی نٹراویہودی ہے۔ اُس نے یونورسٹی انتظامیہ کو اس دن کے حوالے سے جب تم لائبریری گئے تھے۔ ایک درخواست دی ہے کہ تم نے اُسے کتہیں نہ دینے پر دھمکیاں دی ہیں اور مذہبی طور پر ہراساں بھی کیا ہے۔ اس بچے تمہارے خلاف کارروائی کرنے کی درخواست کی ہے۔“

مجھے شدید غصہ آ گیا۔

”یہ سب فضول بکواس ہے۔ نہ تو میں نے اُسے کوئی دھمکی دی تھی اور نہ ہی کسی بھی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ یہ سب جھوٹ ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ لیکن تم جانتے ہو کہ انتظامیہ کسی بہانے کی تلاش میں تھی۔۔۔۔۔ اور وہ بہانہ تم نے انہیں فراہم کر دیا ہے۔“

جوزف کے چہرے پر بھی پریشانی کی لکیریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو میں اس لائبریری میں گیا تھا۔ مجھے فرانسیسی مصنف رابرٹ فوری سن کے دو طویل مقالے چاہیے تھے۔ جو انہوں نے جنوری 1979 و دسمبر 1978ء میں لکھے تھے۔

جس میں انہوں نے واضح ثبوت دے کر ثابت کیا تھا کہ یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ہلاک کرنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن لائبریرین

پیئر نے پہلے تو ان مقالوں کی موجودگی سے ہی انکار کر دیا۔ پھر میں نے اُسے لائبریری کی فہرست دکھائی جس میں باقاعدہ ان دو مقالوں کا اندراج تھا

اور فہرست درج ذیل بھی ظاہر کر رہے تھے کہ پچھلے کئی سالوں سے ان مقالوں کو کسی قاری کو اشوبھی نہیں کیا گیا تھا تو اس کا موڈ آف ہو گیا اور اُس نے

اور فہرست درج ذیل بھی ظاہر کر رہے تھے کہ پچھلے کئی سالوں سے ان مقالوں کو کسی قاری کو اشوبھی نہیں کیا گیا تھا تو اس کا موڈ آف ہو گیا اور اُس نے

اور فہرست درج ذیل بھی ظاہر کر رہے تھے کہ پچھلے کئی سالوں سے ان مقالوں کو کسی قاری کو اشوبھی نہیں کیا گیا تھا تو اس کا موڈ آف ہو گیا اور اُس نے

اور فہرست درج ذیل بھی ظاہر کر رہے تھے کہ پچھلے کئی سالوں سے ان مقالوں کو کسی قاری کو اشوبھی نہیں کیا گیا تھا تو اس کا موڈ آف ہو گیا اور اُس نے

اور فہرست درج ذیل بھی ظاہر کر رہے تھے کہ پچھلے کئی سالوں سے ان مقالوں کو کسی قاری کو اشوبھی نہیں کیا گیا تھا تو اس کا موڈ آف ہو گیا اور اُس نے

مجھ سے کہا کہ میں کل یا پرسوں چکر لگاؤں کیونکہ آج وہ کچھ معروف ہے۔ اب جب کہ جوزف نے مجھے لائبریرین پتھر کی قومیت کے بارے میں بتایا تو مجھے اس کے رویے کی سمجھ آ رہی تھی۔ اُس کے انکار کے بعد میں نے ذرا سختی سے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں لائبریری کی اعلیٰ انتظامیہ یا منڈن میٹر آفس میں لائبریری شعبے میں اس کے سنسٹ رویے کی شکایت کر دوں، اس پر اُس نے منہ ہٹاتے ہوئے ان دو میں سے ایک مقالہ مجھے کہیں اندر سے نکال کر دے دیا۔ دوسرے کے بارے میں اُس نے غمزہ پیش کیا کہ وہ ایک وقت میں دونوں مجھے جاری نہیں کر سکتا لہذا پہلا پڑھنے کے بعد وہ واپسی پر مجھے دوسرا دے گا۔ اور میں چپ چاپ ایک ہی مقالہ لے کر واپس چلا آیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی، نہ تو میں نے اُس لائبریرین کو کوئی دھمکی دی تھی، نہ ہی اس سے اونچی آواز میں بات ہی کی تھی۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اُسے میری یونیورسٹی کا پتہ کیسے چلا اور وہ یہاں تک کیسے پہنچی گیا تھا۔ ابھی میرے ذہن میں ڈی کارڈ کا خاکہ سر اُبھرا۔ اوہ۔۔۔ تو اس نے کتاب جاری کرتے وقت میری یونیورسٹی سے جاری شدہ میرا آئی۔ ڈی (شناختی نمبر) لوٹ کر لیا تھا۔ ب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میرے گرد گھیراٹک ہوتا جا رہا تھا۔

جوزف کے بتانے کے بعد میں شام تک بیٹھا اپنے نرم ہچک کو حتمی شکل دیتا رہا۔ اب میں جہد از جہد اُسے ختم کر کے پیش کر دینا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں مجھے یہاں کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب چوبیس بجے شام یونیورسٹی کے لائبریرین نے بتایا کہ لائبریری بند کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، باہر واقعی اندھیرا مچا چکا تھا۔ باہر نکلا تو سرد ہوا کے پہلے تھمڑے نے میرا بھرپور استقبال کیا۔ آسمان سرخ نگارہ ہو رہا تھا، برف باری کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ گیٹ سے باہر نکلا تو دور دور تک کسی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے اگلے ہلکے ہلکے میٹرو کی تلاش میں پیدل چلنے کا ہی فیصلہ کر لیا، ڈور لندن شہر کی روشنیاں اب پوری طرح جگمگانے لگی تھیں۔ اونچے اونچے نیون سائن زمین پر اترے ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اچانک میرے اور کوٹ کی جیب میں رکھا فون بج اُٹھا۔ دوسری طرف سارہ تھی۔ اُس کی ماتم آواز فون پر ابھری۔

”ہے مسٹر جی۔۔۔۔۔ کبھی ہم یہودیوں کے خلاف مواد اکٹھا کرنے سے باز بھی آ جایا کرو۔ کیا کر رہے ہو؟“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”پیدل چلنے کی پریکٹس کر رہا ہوں، موسم کا طائفہ ہے، دل جوان ہے اور دست طویل ہے۔ سو چلا جا رہا ہوں اپنی دھن میں تم۔“

سارہ ابھی میری بات سن کر فون دی۔

”میرے پاس لبرٹ ہاں میں ہونے والے اسٹیج تھیٹر کے دو ٹکٹ ہیں۔ ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پاپا کو تم نے ہزار غموں میں جتلا کر رکھا ہے۔ چلو گے میرے ساتھ تھیٹر دیکھنے کے لیے؟“

”ایک خوبصورت لڑکی جب کسی نوجوان کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانا چاہتی ہو تو اس کے عقل مند ماں باپ کو اسی طرح کے بہانے کر

بیتے جاتے ہیں۔“

سارہ کی ہنسی فون پر ابھری۔

”کہاں ہو اس وقت؟“

میں نے اسے اس سڑک کا پتہ بتایا جس پر میں اس وقت منزلت کر رہا تھا۔ چند ہی منٹوں میں سارہ کی سفید پٹل کار نمودار ہوئی۔ اس نے میروں کھرکی اونچے گلے والی سوٹر، بلیک اسکرٹ کے ساتھ ہنسی ہوئی تھی اور بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ آج میں نے پہلی مرتبہ اسے پوری طرح بچے سنوڑے ہوئے دیکھا تھا۔ درندہ عام طور پر وہ میک اپ وغیرہ سے بے نیاز سادہ سی رہتی تھی۔ اس نے گاڑی میرے قریب ل کر روکی۔

”یوں سردشموں میں ایک جوان پر دیسی لڑکے کا لندن کی سڑکوں پر تہہ گھومنا کچھ ٹھیک نہیں۔ جدی سے میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں تمہیں تمہاری منزل پر پہنچا دوں گی۔“

میں مسکراتا ہوا اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں ہم مضامین سے گزرتے ہوئے جاگتے ہوئے جگمگاتے لندن پہنچ گئے۔ چمکتی ہوئی شے جیسی دکانیں، دونوں اطراف کھلی ہر گزرتے راہی کی توجہ کھینچ رہی تھیں۔ سنٹرل لندن کے بڑے بڑے کسبوز (جوئے خانے) شام ہوتے ہی کھل گئے تھے اور باہر کھڑی نیم عریاں لڑکیاں لوگوں کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ یہ سب کئی کئی منزلہ کسبوز تھے۔ جن کے اندر جانے کے لیے بڑے بڑے ڈرائیوے بے ہوئے تھے۔ آپ اپنی گاڑی سمیت اندرونی عمارت جا سکتے تھے، نئی لگنے والی فلموں کے بڑے بڑے بورڈز جل بکھر رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا بورڈ نئی فلم کنگ کا تھا۔ اصل میں بورڈ کیا تھا، کئی منزلہ بہت بڑا کنگ کا ٹکڑا ہی تھا جو کبلی کی روشنیوں سے بن رہا تھا، بجھ رہا تھا۔ مجھے کنگ کا ٹکڑا کا بورڈ دیکھ کر کتنی یاد آ گیا۔ اُسے یہ فلم بے حد پسند تھی۔ لیکن وہاں کے سینماؤں میں ابھی کنگ کا ٹکڑا نہیں لگی تھی۔ اب ہم بڑے ہل کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ ہل کے گرد بڑی بڑی جہازی ساز کی جہلی روشنیوں نے دن کا سماں ہاندھ رکھا تھا۔ سنگل بند تھا، شاید کوئی اسٹیمر نیچے سے گزر رہا تھا، خود کار ہل درمیان میں سے طے ہو کر اوپر اٹھ چکا تھا۔ بحری جہاز بھونہو بھونہو اہل کے درمیان سے گزر گیا۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے لوگوں نے اپنے شہر کے باسیوں کو دیکھ کر خوشی سے نعرے لگائے۔ ہاتھ ہوا کر وعدہ کیا کہ الوداع سے شہروں کے شہرندن۔ ہم چند دن کے لیے تم سے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وعدہ رہا کہ ہم پھر میں گے، اور بہت جلد ملیں گے۔ تب تک اپنی اس رنگینی اور جگمگاہوں میں کمی نہ دینا۔ کچھ ہے دنیا کے ہر خطے کے باسیوں کو اپنا شہر ہی دنیا کا سب سے خوبصورت شہر لگتا ہے۔ مجھے اپنا کوئی بھی اسی طرح اور اتنا ہی پیار تھا۔ اس شہر کی فضا میں میری ایمان کی مہک بسی ہوئی تھی۔ اس کی دھبہ کی شاموں میں بھی ابھی تک کپکپے کوئلے کے جلنے کی میری پسندیدہ خوشبو موجود تھی، جو بچپن سے ہی میری روح کو کھینچ لیتی ہے۔ یہ شہر بھی میں کس طرح خود سے ہاندھ بیٹے ہیں۔ جیسے کوئی خون کا رشتہ ہو ان سے۔

سارہ گاڑی بے حد تیز چلا رہی تھی۔ ہل جڑتے ہی تھوڑی دیر میں ہم البرٹ ہال کی پارکنگ میں موجود تھے۔ ہال میں بہت بھیر تھی۔ ضرور کوئی خاص تہیہ تھا۔ ہماری نشستیں دوسری رد میں ہی تھیں۔ ہمارے بیٹھے کے کچھ دیر بعد ہی ہال کی روشنیاں بجھ دی گئیں۔ سامنے اسٹیج کا پردہ اٹھا دیا گیا۔ محبت کی کوئی کہانی تھی۔ کہانی محبت کی ہی ہو سکتی ہے۔ محبت ہی تو ایسی لاکھوں کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ اسٹیج پر ہیرو، ہیروئن سے وداع لے کر رخصت ہو رہا تھا کیونکہ اسے اپنے قصبے سے کہیں دور ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن ہیرو نہیں جانتا کہ راستے میں جو گھٹنا جنگل پڑتا ہے وہاں جیسے ٹیرے اس

کی زندگی کی تاک میں ہیں۔ وہاں ہیروئن کی سوتیلی ماں اسے بحری جہاز کے ذریعے مزدوری کے لیے دور دراز کے شہر لندن بھیج رہی ہے۔ ہیروئن اس بات سے بے خبر ہے کہ اصل میں اس کی اچھی سوتیلی ماں نے بحری قزاقوں کے ہاتھ اس کا سودا کر دیا ہے۔ جو اسی بحری جہاز پر موجود ہیں جس میں اسے سمندر پار جانا ہے۔ اسٹیج کا منظر لڑکے اور لڑکی کی آخری ملاقات کا منظر تھا۔ جس میں دونوں ہی اس بات سے بے خبر ہیں کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک سال کے بعد کی ملاقات کے وعدے کر رہے ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو جھونٹے داسے دے رہے ہیں۔ منظر میں جان بھرنے کے لیے دونوں اداکار جم کر اداکاری کر رہے تھے۔ ہدایت کاری اور مکالمے بھی زبردست تھے۔ پورے ہال پر سناسا چھایا ہوا تھا۔ ہیرو جنگل سے گزر رہا ہے۔ پس منظر میں ولیم ورڈزور تھ کی مشہور نظم ”یک برٹلی شام میں جنگل میں رکنا“ کے مکالمے گونج رہے ہیں۔

”یہ کتنا جنگل

یہ برٹلی شام

سب کس قدر غریب ہیں

لیکن مجھے تو اپنے وعدوں کا بھروسہ ہے

اور سونے سے پیسے

میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔۔۔۔

اور سونے سے پیسے۔۔۔۔ میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔“

منیں نے شاید ساتویں جماعت میں ولیم ورڈزور تھ کی ”Stopping by woods in a snowy evening“ پڑھی تھی۔ آج اپنی آنکھوں کے سامنے پھر سے اُس منظر کو حقیقت بننے دیکھ رہا تھا۔ یہاں ٹیرے ہیرو پر حسد آور ہوتے ہیں۔۔۔۔ وہاں بحری قزاق لڑکی پر بحری سفر کے دوران جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں ہیرو دے سینے میں خنجر گھونپ دیا جاتا ہے وہاں لڑکی قزاقوں سے بچنے کے لیے سمندر میں کود جاتی ہے۔ یہاں ہیرو مرتے مرتے ٹیروں سے اٹھا کرتا ہے کہ اس کی موت کے بارے میں لڑکی کو نہ بتایا جائے ورنہ وہ بھی مر جائے گی۔ وہاں لڑکی سمندر میں ڈوبنے سے پہلے قزاقوں سے چلا کر زاری کرتی ہے کہ لڑکے کو اس کی موت کی اطلاع نہ دی جائے ورنہ وہ بھی خودکشی کر لے گا۔ دو محبت کرنے والے ایک دہر پھر فنا ہو جاتے ہیں۔ ہال میں بیٹھے تقریباً سبھی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ عورتوں کی تو باقاعدہ سسکیاں سنائے میں سنائی دے رہی تھیں۔ پردہ کرنے کے بعد بھی بہت دیر تک سب لوگ مبہوت سے بیٹھے رہے۔ اور پھر اچانک ہی ہال تالیوں کی بے پناہ گونج سے دھل سا جاتا ہے۔ میں نے سارہ کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں کے گوشے بھی پٹکے ہوئے تھے۔

میں اور سارہ جب ہال سے باہر نکلے تو لندن برف کی سفید غللی چادر سے ڈھک چکا تھا۔ پارک میں کھڑی سارہ کی سفید فوسکی (نیل) زمیں پر پڑی برف کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔ جیسے شریں بچوں نے سنو مین کی جگہ برف کی گاڑی بنا ڈالی ہو۔ جب تک ہم البرٹ ہال کی قریبی

خواتین کے مقبول ترین ناول

کیا اسیری کیا رہائی

قیمت: 250

فائزہ افتخار



گلیوں سے نکل کر بڑی شاہراہ پر آئے تب تک لندن کی رات سوچتی تھی۔ سارے شہر پر جیسے کسی نے سفید نرودہ چھڑک کر اس پر چادو کر ڈالا ہو۔ دُور کہیں ٹریفک لگرا سکواڑ کے گھنٹہ گھرنے رات کے بارہ بجے کی نوید سنائی۔

ہماری گاڑی برف سے بھری سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھی۔ سارہ ابھی تک قمیض کے اثر میں تھی اور پچپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دُور سکرین سے باہر دیکھ رہی تھی، میں خود بھی کھویا کھویا سا تھا، پھر سارہ نے ہلکے سے کہا۔

”مجھے ابھی محبتوں کا انجام ہمیشہ سے بہت اناں کر دیتا ہے۔ پھر میں گھٹنوں پر خمی گم سمی رہتی ہوں۔“

”محبتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔“ میرا جواب سن کر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”تم محبتوں کے بارے میں اتنی گہرائی سے کیسے جانتے ہو۔ اس دن تم نے محبت کے پہروں کو جب بیان کیا تھا تو میں بہت دن تک ماما سے

تمہارے محبت کے بارے میں خیالات پر بات کرتی رہی۔ پھر اس دن تم نے ایک طرف محبت کی بات بھی کی اور اُسی کو محبت کی شام بنا لینے کا مشورہ بھی

دیا۔ کوئی محبت کے بارے میں اتنی تفصیل سے کیسے جان سکتا ہے۔۔۔۔۔ اس کے لیے تو اے ہزار محبتوں کے مذہب جھیلنا بھی کم پڑے ہوں گے۔“

”بکھی بکھی ایک محبت ہی ہزار محبتوں پر بھاری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ہزار محبتوں جیسا درد، ہزار محبتوں جیسی خوشی اور تجربہ دے جاتی ہے۔“

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”گویا تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟“

”جانے کیوں بکھی بکھی یہ غلط محبت مجھے بہت نا کافی معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ بکھی بکھی حسیں ایسا نہیں لگتا کہ ہمارے لفظوں کی وسعت اور

دیکھ بھری بہت محدود ہے۔ ہماری زبان، ہمارے لفظ اور ہماری لغت صرف ظاہری اور اوپری احساسات کو ہی بیان کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ بات صرف محبت،

مشق اور جنون پر ہی۔۔۔۔۔ کر کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ جو جذبہ جنون اور دیوانگی سے بھی بڑھ جائے۔ اُس کے لیے کوئی دوسرا نام کیوں نہیں ہوتا ہمارے پاس؟

سارہ غور سے میری بات سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر عقیدت سی تھی۔ کچھ ضبط جیسے اندر ہی اندر کچھ مارنے کی کچھ دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”کیا نہیں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ خوش نصیب جس کے لیے تمہارے جذبات، تمہارے لفظ کم پڑ جاتے ہیں، اس وقت کہاں ہے؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔۔۔۔۔“

سارہ کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ چھوٹے چھوٹے چپا، گاڑی برقی سڑک پر زور سے لہرائی سارہ مزید بولکھا گئی۔ میں نے سینٹ کے ساتھ لگی

ہینڈ بریک کھینچ دی۔ گاڑی اپنے ہی زور پر گھومی اور کچھ دیر گھسٹی ہوئی ڈورنٹ پاتھ کے ساتھ لگ کر رک گئی۔ سارہ نے پناہ اسٹیرنگ پر رکھ دیا۔

میں نے جلدی سے اُسے ہلایا۔

”تم ٹھیک ہو۔۔۔۔۔ معذرت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ مجھے حسیں اس طرح سے نہیں بتانا چاہیے تھا یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ غلطی میری ہی ہے۔“

سارہ نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں ہی تمہاری باتوں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اپنا اختیار کھو بیٹھی۔“

”تم کہو تو باقی راستہ میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔“

سارہ نے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ اسٹیرنگ سائڈ سے آتر کر میری طرف آگئی۔ میں بھی دروازہ کھول کر اس کی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سارہ ابھی تک گم صدمی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ سامنے دنگ مسکرین میں سے باہر دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

”اتنا بڑا درد میں رکھ کر تم کیسے مسکرا لیتے ہو۔۔۔۔۔ کبھی کسی کو اپنے اندر کے زخم جھانک کر دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔۔ تم سب سے الگ ہو۔۔۔۔۔ سب سے جدا ہو۔۔۔۔۔ اس دنیا کے نہیں ہو۔۔۔۔۔“

میں چپ چاپ گاڑی چلا رہا تھا۔ ویسٹ مسٹر برج سے کچھ پہلے پکاڈلی سے تیسری سڑک کے قریب سارہ نے مجھے گاڑی ایک بہت ہی کشادہ لیکن انجینی سی سڑک پر موڑنے کا کہا۔ میں نے بناء کچھ پوچھے گاڑی اس لمبی چوڑی سمنان سی سڑک پر موڑ دی۔ کچھ دور چل کر سڑک کے پتھوں بچ ایک بہت بڑا سا چوراہا تھا، اتنا بڑا کہ اس کے گرد گھومنے کے لیے گاڑی کا پورا اسٹیرنگ گھمانا پڑتا تھا، یہیں سے سڑک چار حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ چوراہے کے اندر ایک بہت بڑا فوارہ لگا ہوا تھا جس میں سے پانی کی دھاریں سردی کی وجہ سے ٹپکتے ٹپکتے جم گئیں تھیں۔ چوراہے سے نڑتے ہی سڑک کے آخر میں بتا یہودیوں کا ایک بہت ہی قدیم سفید حجر سے بنا ایک عظیم الشان چرچ سامنے آ گیا۔ چرچ کی سفید عمارت اس وقت برف سے اتنی ہوئی کسی پری کا مثل لگ رہی تھی۔

میں نے گاڑی چرچ کے سامنے لے جا کر روک دی۔ چرچ کے دیو پیکل چوبلی دروازے پر حضرت موسیٰ کی ایک عظیم بنی ہوئی تھی اور دروازے کے دونوں اطراف بڑی بڑی سے مشعلیں جل رہی تھیں۔ سارہ گاڑی سے اتر گئی۔۔۔۔۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ سارہ نے میری جانب دیکھا۔ ”یہ میری پسندیدہ عبادت گاہ ہے۔۔۔۔۔ میں صرف خاص موقعوں پر یہاں آتی ہوں۔ آج یوں دمگی رات کو یہاں آنے کا مقصد بھی بہت خاص ہے۔۔۔۔۔ میں تمہاری محبت کے لیے دعا کرنے آئی ہوں، وہ ہستی جو آج تمہارے لفظوں میں تمہاری یادوں میں، اور تمہارے احساس میں زندہ ہے میں اس کے لیے یہاں دعا کرنے آئی ہوں۔“

میں گنگ سا دھپ کھڑا رہ گیا۔ سارہ نے قدم بڑھائے، پھر وہ پلٹ کر بولی۔

”تم اگر چاہو تو یہیں کچھ دیر میرا انتظار کر سکتے ہو، میں جلد ہی آ جاؤں گی۔“

سارہ میرے زکے قدم دیکھ کر یہ بھیجی تھی کہ شاید میں یہودیوں کے چرچ کے اندر آنے سے ہچکچا رہا ہوں۔ سارہ آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے برف پر بنے اس کے قدموں کے نشانات پر چلا ہوا اس چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ چرچ کے اندر اونچی اونچی دیواروں کے اندر بنے ہوئے طاقوں میں بکلی بکلی سی روشنیاں جل رہی تھیں۔ چرچ میں مدہم سی ایک خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ڈائس پر جہاں پادری کھڑا ہوتا ہے، وہاں لکڑی کے چوہارے پر بہت سی موسمی تیلوں رکھی جل رہی تھیں۔ سارہ لکڑی کے چوبی فرش پر چلتی ہوئی ایک خاص جگہ پر آ کر رک گئی۔ اور زرب توریہ کی کچھ سیٹیں پڑھنے لگی۔ میں چپ چاپ دونوں اطراف پر لگی ہوئی لمبی لمبی سیٹوں میں سے ایک پر کونے میں بیٹھ گیا۔ چرچ میں عجیب سا سکوت طاری

تھا، اتنی خاموشی تھی کہ موسمِ تیسوں کے جلتے سے پیدا ہونے والی آواز کی سرسراہٹ بھی گونج رہی تھی۔ سارہ ایک جذبے کے عالم میں کھڑی اپنے دُعا کیے کلمات پڑھ رہی تھی۔ ایک انجانی لڑکی ایمان کے لیے ہزاروں میل دور اس تجارت میں بھٹکی چلی گئی۔

میں کچھ دیر یونہی سارہ کو سینے پر ہاتھ رکھنے دُعا کرتا دیکھتا رہا۔ پھر یکایک جانے کیوں مجھے ایمان کی بے حد کی محسوس ہوئی۔ اس احساس نے میرے دل کو جیسے ایک خنجر سے چیرنا شروع کر دیا کہ اب میں اس زندگی میں کبھی اس سے نہیں مل پاؤں گا۔ اور جانے کس وقت میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکن شروع ہو گئے اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا، سارہ دُعا ختم کر کے میری طرف ہلکی اور اس کی نظر میری برقی آنکھوں پر پڑ گئی۔

”ہے سارا۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔؟“

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی میری طرف بڑھی اور میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر اس نے اپنی نازک انگلیوں سے میرے آنسو پونچھ دیے۔ اور شاید یہی سحران آسٹوڈ کے سیلاب کے بند کو توڑنے کا آخری بہانہ بن گیا۔ پھر میرا خود پر اختیار ہی نہیں رہا اور جانے کتنی دیر تک یہ ٹسکین پانی اس کی نازک انگلیوں کو بھگوتا رہا۔ مجھے تسلیں دیتے دیتے وہ خود بھی غمِ حال سی ہو گئی۔ پھر جیسے اُس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ ان تمام آنسوؤں کو بہہ جانے دے گی۔ اس نے میرا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور میری ہلکوں سے گرتی شبنم اپنی آنکھوں میں سوتی رہی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو اپنے دل کا غبار اس کے سامنے بیان کر دوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ میرے درد کو اپنا ہی درد سمجھتی ہے اور درد کا دارماں ہننا چاہتی ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک تمام فسانہ سارہ کو سنایا۔ وہ چپ کر کے خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ مجھے حقیقتی رہی۔ کئی مقام پر مجھے ایسا لگا کہ وہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی لیکن اس بہادر لڑکی نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ شاید اُسے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ اگر اس مرحلے پر اُس نے ذرا سی بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو پھر مجھے نونے سے بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ میری بات ختم ہونے کے بعد وہ بہت دیر تک خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ اس کو دل اور پھول کی جھگڑی سی نازک لڑکی کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ لیکن اُس نے مجھ پر اپنے اندر کے طوفان کا ہر نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی لفظوں سے زیادہ وہ انسانوں کے بچ کی خاموشی، مضبوط اور زود اثر مرہم ثابت ہوتی ہے۔ اُس وقت وہی خاموشی ہم دونوں کے درمیان، باتوں کا کام دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ میرا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی اور اپنے لفظ اپنا مرہم، اپنے نرم مس کے ذریعے میرے ہاتھوں میں در میری روح میں منتقل کرتی رہی۔ چرچ کے بڑے بڑے روشن دانوں اور کھڑکیوں سے صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تھی اور جب ہم چرچ سے باہر نکلے، سحر کے سپیدے اور برف کی چادر کی سفیدی نے ہماری آنکھیں چند حیا سی دیں۔ برف پر ابھی تک میرے اور سارہ کے اندر جاتے قدموں کے نشان واضح تھے۔ رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیسا جادو ہوتا ہے۔ شاید اسی سحر کے زور میں، میں نے رات کو سارہ کے سامنے پناہ دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اب صبح ہوتے ہی میں اپنی رات کی حالت پر اس کے سامنے شرمندہ سا تھا۔ کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن سارہ نے جیسے اس دن میرا ہر بھرم قائم رکھنے کی قسم کھ رکھی تھی۔ اس نے میری طرف دانستہ دیکھنے سے گریز کیا۔ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتی رہی۔ پہلے اُس نے مجھے میرے اپارٹمنٹ پر ڈراپ کیا۔ لندن ابھی تک بے خبر سو رہا تھا، میں گاڑی سے اتر تو میرے قریب سے گزرتے دودھ کی بوتلیں پہنچانے والے کی سائیکل تھمتی بجاتی گزری۔ اُس نے اپنی ہلکی پلٹ کر چلتے چلتے مجھے انگریزی سلام کیا۔ اور مسکرا کر سارہ

کی طرف دیکھا۔ سارہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر جھینپ سی گئی۔

”میں نے سارہ کی طرف دیکھا وہ ابھی تک اسٹیزنگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میں نے سائڈ والی کھڑکی میں جھک کر اسے کہا۔

”میں شکریہ جیسے چھوٹے لفظ، وا کر کے تمہارے انمول احساسات کی توجہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس رات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

سارہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ادا کرنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں۔۔۔۔۔ یقین جانو۔۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ ہی تمہیں دوسروں سے بہت مختلف سمجھا ہے۔۔۔۔۔

اور گزری ہوئی رات کے بعد تمہاری عزت میرے دل میں اپنی آخری حد تک بڑھ گئی ہے۔۔۔۔۔ یاد رکھو۔۔۔۔۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت

ہوگی۔۔۔۔۔ تم ہمیشہ آواز دینے سے پہلے مجھے اپنے سامنے پاؤ گے۔“

”میں جانتا ہوں ایسا ہی ہوگا۔ اور یہ احساس میرے لیے ہمیشہ بہت قیمتی رہے گا۔“ مجھے سارہ نے شام کو لائبریری سے واپسی پر آتے

ہوئے تھیز کے لیے لیا تھا۔ میرا بیگ جس میں میرے نوٹس تھے اب بھی اس کی گاڑی کی کچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے کل شام ہی اپنا نرم ہینچر مکمل

کر لیا تھا۔ میں نے بیگ سے اپنے نرم ہینچر کے تمام نوٹس نکالے جس پر میری دو مہینے کی محنت میری حقیقی لفظوں کی صورت میں نکھری ہوئی تھی۔ میں

نے نرم ہینچر کی پوری فائل سارہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

یہ میرا نرم ہینچر ہے۔ اس میں میری تمام حقیقی موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنے پاس رکھو۔ اور اگر کسی وجہ سے میں اسے

یونیورسٹی میں جمع نہ کروا سکوں تو میری جگہ تم اسے لائبریری ریکارڈ کا حصہ بنوانے کے لیے جمع کروا دینا۔“

سارہ نے حیرت سے فائل کے صلے پلٹے۔

”تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ مجھے اسے اپنے پاس رکھنے میں کوئی ہنگامہ نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں سے خود چل کر جمع

کروائیں گے۔ بلکہ میں پاپا کو اس بات کے لیے بھی مجبور کروں گی کہ وہ تمہیں تمام نرم ہینچر پوری یونیورسٹی کے سامنے فائل تقریب میں خود پڑھنے

دیں۔ تمہیں اپنا نظریہ سب کے سامنے پیش کرنے کا پورا حق ہے۔“

میں نے اس موقع پر اسے پتہ والی بات بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ہلکے سے اس کے ریشمی بال نکھیر دیے۔

وہ مسکرا دی۔ میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ بلایا اور سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں اپنی سنسان گل کے آخری کوٹنے تک اس کی گاڑی کو مڑتے ہوئے

دیکھنے کے لیے کھڑا رہا۔ اوپر آتا تو کامران جاگ چکا تھا اور اپنے کاروبار پر جانے کی تیاری میں تھا۔ اس نے کافی کلنگ میرے ہاتھ میں پکڑا۔

”آگیا میرا شہر دو ساری رات آوارہ گردی کرنے کے بعد۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا تاکہ اس یہودی حسینہ سے دور رہی رہتا۔ لیکن

لگتا ہے میرے مشورے کا لٹا اثر ہو رہا ہے۔ پہلے تو صرف دن ہی اس کی زخموں تلے بسر ہوتا تھا۔ اب راتیں بھی فنی کے ساتھ مزاحمت کرتے

ہوئے گزرتی ہیں۔ یاد میڈی۔۔۔۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ اس کا باپ بڑا اکائیاں آدمی ہے۔ جانے اب تک تمہیں یونیورسٹی میں کس دس سے

برداشت کر رہا ہے؟“

شاید کامران نے کھڑکی سے مجھے سارہ کی کار سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے اسے کل یونیورسٹی میں جوزف کی طرف سے دی ہوئی پیڑ والی شکایت کی خبر سن لی۔ کامران نے زیر لب ان یہودیوں کی شان میں کچھ کہا اور پھر مجھ پر بھی بگڑتے ہوئے کہنے لگا۔

”اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ان لوگوں سے بچنا لینا۔ تم یہاں کے قانون سے خود اچھی طرح واقف ہو۔ اس ہیریرین پیڑ کی شکایت پر تمہیں انگلینڈ سے ڈی۔ پورٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کی ہر بڑی انٹرنیٹ میسنجی یہودیوں کا پیسہ لگا ہوا ہے۔ قانون بھی انہی کا ساتھ دے گا۔ اور پھر 9/11 نائن الیون کے بعد تو ہر مسلمان پہلے ہی ان کی نظر میں ایک دہشت گرد ہے۔ صرف کسی شکایت کی ضرورت ہے۔ انہیں نیبل چسپاں کرنے میں ڈرا دی نہیں لگتی۔ جانے کتنے تو گوں کو تو یہ صرف شے میں ہی ملک بدر کر چکے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا اس نرم چہرے کی آفرائشی کیا اہمیت ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ”ہالوکاسٹ“ کا واقعہ ہوا تھا تو کہنے دو۔ ہماری بلا سے تمہیں کون سے میڈل مل جائیں گے اس حقیقت سے انکار کرنے پر۔ اور پھر سینے والے تو خود وہ ہیں جنہوں نے یہ مفروضہ گھڑا ہوا ہے۔ کون تمہارے نرم چہرے پر اور تمہاری تحقیق پر یقین کرے گا؟“

میں نے کامران کی طرف دیکھا۔

”کوئی اور یقین کرے نہ کرے۔۔۔۔۔ مجھے خود تو یقین ہے اپنی بات پر، اپنے جج پر، اور پھر وہ سب بھی جانتے ہیں کہ جج کیا ہے۔ بس کسی نے ہمت نہیں کی آج تک ان کے سامنے جج بولنے کی، لیکن میں یہ جج ان کے سامنے لا کر رہوں گا پوری یونیورسٹی میں اگر ایک بھی طالب علم نے میری بات کا یقین کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اور میری محنت رنگ لے آئی۔ چاہے اس کے بعد وہ لوگ میرا نرم چہرہ جھادیں اور مجھے اس ملک سے ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیں۔“

کامران جھنجھلا سا گیا۔

”لیکن اس جدوجہد کا فائدہ۔۔۔۔۔ یہ سب تم کس کے لیے کر رہے ہو۔ اس تحقیق کا اور تمہارے اس جج کا کوئی مقصد بھی تو ہونا چاہیے۔“

مجھے کامران کی بات پر غصہ آ گیا۔

”تو کیا جو کچھ نہیں نے ابھی تمہیں بتایا، تمہیں اس میں کوئی مقصدیت نظر نہیں آتی؟ اور اگر اس جج کا تمہیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا کہ یہ نئی نسل ان یہودیوں کے اس جھوٹ کو جان لے تو پھر میرا ایک اور مقصد بھی سن لو۔ جو اس مقصد سے کہیں بڑا ہے۔“ ہالوکاسٹ“ کا یہ تمام پروپیگنڈا یہودیوں نے صرف اور صرف فلسطین کی سرزمین پر اپنی ایک آزاد ریاست بنانے کا خواب پورا کرنے کے لیے کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی اس ڈرامے کو سٹیج کرنے کی پوری تیاری کرنی گئی تھی۔ اس وقت چندہ جمع کرنے کی عظیم الشان مہم شروع کر دی گئی تھی۔ امریکہ، برطانیہ، ورسوں نے جرمن قوم کو برباد کرنے کے لیے یہودیوں کو غداری پر آمادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ذمہ خوردہ جرمن قوم پلٹ کر ان پر دامن در کرے گی۔ وہ جرمنوں کو، ٹلر کی قیادت میں یکجا ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور ہٹلر کے عزائم بھی اس کی جنگی تیاریوں سے بالکل واضح تھے۔ اسی لیے انہوں نے یہودیوں کو قبلہ آؤں پر قبضے کا خواب دکھایا اور اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ان کی پوری مدد کرنے کا یقین بھی دلایا۔ ”ہالوکاسٹ“ کا الزام تو ہٹلر اور جرمنوں پر دوسری جنگ عظیم کے بعد لگایا گیا تھا۔ لیکن اس کی قیمت فلسطین کے مسلمانوں نے یہودی بستیوں اور پھر اسرائیل کی صورت میں چکانی۔ گر ہٹلر ”ہالوکاسٹ“ کا ذمہ دار تھا بھی تو یہودی اس بہانے فلسطین کے مسلمانوں پر کیوں ٹوٹ پڑے۔۔۔؟ اور جج یہی ہے کہ ”ہالوکاسٹ“ میں پچاس



لاکھ سے ساٹھ لاکھ تک یہودیوں کے مارے جانے کی کہانی صرف اور صرف مغربہ سی ہے۔ اتنے بڑے اور اتنے وسیع پیمانے پر گیس چیمبرز کا بنانا جانا ہی ممکن نہیں تھا۔ جن گیس چیمبرز پر یہودی "یہودی قاتل گیس چیمبرز" ہونے کا الزام لگاتے ہیں وہ صرف جرمن فوجیوں کی راشوں کو جنگ کے دوران ٹھکانے لگانے کے لیے بنائے گئے تھے اور پھر تو یہ ہے کہ ان چیمبرز کو بھی ٹھیک طرح سے چلانے کے لیے جرمنوں کے پاس پورا ایندھن موجود نہیں ہوتا تھا۔ جرمن پہلے ہی اپنا سب کچھ جنگ میں جموٹک چکے تھے۔ ان گیس چیمبرز میں جموٹکنے کے لیے ان کے پاس کوئلہ تک کافی مقدار میں نہیں بچا تھا۔ یہ صرف اور صرف ایک مہیوتی تحریک ہے جس کا مقصد اپنے مفاد کے لیے ہلاکتوں کی تعداد میں زبردست مبالغہ چاہتی ہے۔ تاکہ خود کو مظلوم ثابت کرنے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جاسکیں۔ یاد رکھو، جس قدر یہ لوگ اس مبالغہ آرائی میں کامیاب ہوں گے، فلسطین کے مسلمان اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت چکانیں گے۔ یہ تحریک صرف معاشی فائدہ اور مسلمانوں کی زمین حاصل کرنے کے لیے چلائی گئی تھی اور یہودی اس تحریک میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ لوگ ان کے جموٹ کو بھٹکتے ہیں اور ہمارا راج بھی انہیں جموٹ لگتا ہے۔ "خرکی کو تو ہاں کرنی ہی تھی۔ یاد رکھو، ہمارا زوال اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن ہم نے خود کو صرف مسلمان سمجھنے کے بجائے فلسطینی، مصری عرب اور پاکستانی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ آخراً اس دنیا کے کسی بھی کو نے میں ہونے والا یہودی کا فائدہ، دنیا کے دوسرے کو نے میں بیٹھے کسی بھی یہودی کا فائدہ ہو سکتا ہے تو پھر دنیا کے کسی بھی مسلمان کا نقصان میرا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ تمہارا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔؟"

کامران پپ چاپ یک ہی جگہ کھڑا میری ساری تقریر سن رہا تھا۔۔۔۔۔ میں بھی تھک کر وہیں صوفے پر ڈھیرے سا گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے کانڈھے پر کامران کے ہاتھ کا دبانا محسوس ہوا، میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، اس نے میرا بازو کھینچ کر مجھے کھڑا کر دیا اور گلے سے لگایا۔ "ہر دفعہ ہر بازی تم اکیلے ہی کیوں مار جاتے ہو۔۔۔۔۔ بھین سے ہر مرتبہ تم سے ہارتا آیا ہوں۔ لیکن جتنا مزہ آج اس بار میں آیا ہے۔ پہلے کبھی نہیں آیا، اگر مقصد اتنا بڑا ہے اور کوشش ہر مسلمان کے دل میں اس نقصان کے احساس کو جگانا ہے تو پھر اس کے لیے کوئی بھی قربانی بہت ہی چھوٹی ہوگی۔ میری نا سمجھ سوچ اتنی آگے کہاں سوچ سکتی تھی۔"

"میں کبھی بھی اپنے ایمان کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکا۔ نہ ہی کبھی میں نے کامل مومن ہونے کا کبھی پہنا ہی دیکھا ہے۔ لیکن یہ نہیں کیوں ان یہودیوں کے پیچ کر رہ کر مجھے احساس ہوا کہ ضرور ہم میں کوئی خاص بات ہے۔ یہ آخر ہم سے اس قدر خوف زدہ، اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔ اسی اپنی خاص بات کی کھوج نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ ذرا کرتا کہ میرے قدم آگے نہیں اڑ کر اترتے جائیں۔ نہیں بارش کا پہلا قطرہ ہی سہی۔۔۔۔۔ لیکن برسوں کا ضرور۔۔۔۔۔ شاید میرے بعد ہی سہی۔۔۔۔۔ کچھ قطرے اور برس جائیں۔۔۔۔۔ شاید چند ہفتے ہی سہی۔۔۔۔۔ پر ہمارے دلوں پر صدیوں کا لگاؤ کچھ حد تک ہی دھل جائے۔"

کامران نے مجھے تھکتے ہوئے کہا اور اس کی آواز دھند سی گئی تھی۔  
"ضرور دھلے گا یہ رنگ۔ کیسے نہیں دھلے گا ہمارے دلوں پر لگا یہ رنگ۔۔۔۔۔"

جب برسنے والی ہفتے ایسے آب زم زم کی ہوں گی۔ کون سا رنگ ہے جو اس آب حیات کے آگے ٹھہر سکے۔  
کامران مجھے چمکاتا رہا۔۔۔۔۔ ہم دونوں نے ہمیشہ زندگی بہت لائبرالی انداز میں گزاری تھی۔ لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ کہیں نہ کہیں



آج کوئی بات ہم دونوں ہی کے دلوں کو نہو گئی ہے۔ شاید زندگی ایسے ہی موڑ بدلتی ہے۔ شاید دلوں کے انقلاب اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔ شاید ہم کبھی کے دلوں پر لگا یہ دنگ کسی آپ زم زم کی تلاش میں بھاڑتا ہے۔ شاید ہم سب کے دل ہی بہت زمانے سے قلعی چاہتے ہیں۔ کبھی سب کچھ سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی غنڈ بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ دل کے ہر دنگ پر وقتی طور کے لیے پردہ ڈال دیتی ہے۔ انسان کو خود سے بھی نظر ہڑانے کا ایک موقع فراہم کر دیتی ہے۔

☆☆☆

## قلمکار کلب پاکستان

- ☆ اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟
- ☆ آپ اپنی تحریریں ہمیں روانہ کریں! ہم ان کی ٹوک پلک سنوا دیں گے۔
- ☆ آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟
- ☆ ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔
- ☆ آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟
- ☆ ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ و زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
- ☆ آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشہیر کے خواہشمند ہیں؟
- ☆ ہم آپ کی کتابوں کی تشہیر مختلف جرائد و رسائل میں تبصرہ اور ترجمہ کروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
- ☆ اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟
- ☆ تو ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔
- ☆ مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

قلمکار کلب پاکستان

0333 222 1689

qalamkar\_club@yahoo.com

## پہلی بازی

دوسرے دن صبح جب میں یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تبھی مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ آج فضا کچھ بدلی بدلی سی ہے۔ سب سے پہلے مجھے جم (Jim) نظر آیا، مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں قلم کر بولا۔

”ہے میڈی۔۔۔ تم فکر مت کرنا میں Man۔۔۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ پوری یونیورسٹی کو ہل کر رکھ دیں گے۔“

کچھ دیر میں ہی کلاس کے باقی طلبہ بھی میرے گرد بھینڑی صورت میں جمع ہو گئے، سب ہی اپنی اپنی بھانت بھانت کی بوسیاں بول رہے تھے۔ ابھی میرے ساتھ ہونے کا اور ساتھ دینے کا وعدہ کر رہے تھے۔ میں کچھ سمجھا اور کچھ نہیں پایا۔ اتنی دیر میں میرا نام اہلکار پر پکارا جانے لگا۔ ڈین آئزک کے کمرے میں میری جلی کی جارہی تھی۔ میں آئزک کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر کمرے میں گھبتے ہی سب سے پہلے میری نظر سنٹرل اسکوائر کی لائبریری کے انچارج پیئر پر پڑی۔ جس کے ہونٹوں پر مجھے دیکھتے ہی ایک طعنیہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اس وقت صرف سر آئزک ہی موجود تھے۔

”آؤ خدا۔۔۔ مجھے اُمید ہے تم نے آج یونیورسٹی آنے کے بعد نوٹس بورڈ پر لگا اپنے خلاف نوٹس سب سے پہلے پڑھا ہوگا۔“

اُدھ۔ تو یہ بھینڑ جو ہر میرے گرد جمع تھی وہ اس نوٹس کی وجہ سے تھی۔

”نہیں سر۔۔۔ میں ابھی پہنچا ہی ہوں۔۔۔ آپ ہی مجھے کچھ بتائیے اس نوٹس کے بارے میں۔“

”اس سے پہلے میں تم سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہوں گا۔ اگر تم کسی تعلیمی ادارے کے انتظامی سربراہ ہوتے اور تمہارے علم میں یہ بات آتی کہ تمہارے زیر انتظام تعلیمی ادارے میں کچھ طالب علم مذہبی سیاست کو ہوا دینے کا باعث بن رہے ہیں، جس کی وجہ سے شہر میں بھی بے چینی پھیل رہی ہے۔ تو تم ایسی صورت میں کیا کرتے۔“

”میں پوری چھان بین کرتا اور میرٹ اور حق پر فیصلہ کرتا۔ آپ سے بھی مجھے انصاف ہی کی توقع ہے کیونکہ آپ کو بحیثیت سربراہ پوری تحقیق کا فرض بھی سونپا گیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ ایک فرض شناس استاد بھی ہیں۔ آپ کا فرض انصاف ہے۔“ سر آئزک نے فوراً سے میری طرف دیکھا جیسے میرے چہرے پر طنز یا تحقیر کی کوئی جھلک ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔

”کیا تم مسٹر پیئر سے پہلے بھی مل چکے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ اگر سنٹرل اسکوائر کی لائبریری جاتا ہوں۔ وہاں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔“

”کیا تم 13 جنوری کی شام بھی سنٹرل اسکوائر لائبریری گئے تھے؟“

”جی ہاں۔۔۔ مجھے دو مقالے چاہیے تھے جن سے میرے مزمعہ کی تکمیل میں مجھے کافی مدد مل سکتی تھی میں وہی لینے گیا تھا۔“

”مسٹر پیٹر نے تمہارے خلاف تحریری شکایت جمع کروائی ہے کہ 13 جنوری کی شام تم نے انہیں کچھ خام کتابیں جاری نہ کرنے پر مذہبی طور پر ہراساں کیا تھا اور انہیں بتائے جھگڑتے دھمکیاں بھی دیں جس کی وجہ سے یہ اپنی زندگی خطرے میں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ازراہ کرم ابھی تک لندن پولیس اور انتظامیہ کو اس واقعے سے آگاہ نہیں کیا کیونکہ یہ یونیورسٹی کی بدنامی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے یہ پہلے میرے پاس آئے ہیں تاکہ انہیں انصاف فراہم کیا جائے۔ تمہارا اس بارے میں کیا کہنا ہے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے انہیں کبھی ہراساں نہیں کیا نہ ہی کبھی دھمکانے کی کوشش کی ہے۔“

”تمہارے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت ہے۔“

”بے گناہی کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ثبوت الزام لگانے والے کو دینا پڑتے ہیں سر۔۔۔۔۔“

”سر نرنگ نے میری بات سُن کر اپنی عینک کے باریک شیشوں کے پیچھے سے مجھے غور سے جھانکا۔ جیسے وہ میرے احماد کا جائزہ لینا چاہتے ہوں۔“  
”ٹھیک ہے، تمہاری بات میں وزن ہے۔ لیکن آخر مسٹر پیٹر کی تم سے کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔ آخر وہ بددعا یا الزام کیوں لگائیں گے تم پر۔۔۔۔۔؟“

”میں تو میں بھی جانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت بھی پیش کریں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم اپنا تحریری جواب بھی جمع کروادو۔۔۔۔۔ اور یاد رکھو کہ یہ معاملہ پولیس تک جانا نہیں چاہیے۔ یونیورسٹی انتظامیہ اس سے پہلے ہی معاملہ صاف کرنا چاہتی ہے۔ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق کسی بھی طالب علم کے کسی پولیس کیس میں ملوث ہونے کی صورت میں اُسے ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اسی قانون کی ایک شق یہ بھی ہے کہ پہلے طالب علم پر کیس ثابت ہونا بھی ضروری ہے۔ میں، اپنا جواب جمع کروادوں گا۔ شکریہ۔“

میں کمرے سے باہر نکل آیا اور سب سے پہلی نظر میری سارہ پر پڑی۔ وہ تیزی سے ذین کی کمرے کی طرف ہی آرہی تھی۔ شاید وہ ابھی یونیورسٹی آئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔

”حماد۔۔۔۔۔ یہ سب نہیں کیا سن رہی ہوں۔۔۔۔۔ یہ کون سا نیا ذرا مر چاہا ہے یونیورسٹی والوں نے۔“

”میں نے اُسے مختصر اپنی شکایت اور لائبریری کے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔۔۔۔۔ وہ حیرت سے میری ساری بات سنتی رہی۔ پھر چونک کر اُس نے مجھ سے جلدی سے پوچھا۔“ تم نے لائبریرین کا کیا نام بتایا۔“

”پیٹر۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ پیٹر۔۔۔۔۔ پیٹر گورین تھا مس یہ تو پاپا کا بہت بُرا ناواقف ہے۔۔۔۔۔ کئی سائوں سے تہواروں پر اس کا ہمارے گھر آنا جانا ہے۔“

میرے ذہن میں ایک ساتھ ہی کئی جھماکے ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ سرتراک ابھی تک جم والے معاملے میں میرے ہاتھوں ہونے والی ہزیمت کو بھولے نہیں تھے۔ یہ سارا منصوبہ انہی کا بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک تیرے دو شکار کیے تھے۔ میری شخصیت کو بھی انتظامیہ کے لیے متنازعہ بنادیا تھا اور میرے یونیورسٹی سے نکالے جانے کی صورت میں میرا ٹرم پیپر جو پہلے دن سے ان کے دل میں کلک رہا تھا۔ اس سے بھی ان کی جان ہمیشہ کے لیے محفوظ جاتی، سارا بھی ساری صورت حال سمجھ چکی تھی۔ وہ دانت چستی ہوئی سرتراک کے کمرے کی طرف بڑھی، لیکن میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”نہیں۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک بار پھر میری وجہ سے ایک بچی، ایک باپ کے سامنے کھڑی ہو جائے۔ اس سے ان کی انا کو مزید چوٹ لگے گی۔“

سارہ نے حیرت اور غصے سے میری طرف دیکھا۔

”تم بہ بھی انہی کی انا اور انہی کے رشتوں کے بارے میں سوچ رہے ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمہیں اس یونیورسٹی سے اور شاید اس شہر سے بھی بدر کرنے کی تاک میں ہیں۔“

”نہیں جانتا ہوں۔۔۔ اس بار ان کا وار۔۔۔ بڑا گھائل کر دینے والا ہے۔ لیکن میں شدید زخمی ہو کر بھی دشمن پر غلط وار کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ مقل اور تہریک جنگ قانونی طریقے سے لڑ رہے ہیں۔ میں بھی ان سے ان کے ہی انداز میں لڑوں گا۔“

سارہ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”صرف تم نہیں۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم دونوں مل کر یہ جنگ لڑیں گے۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”راستہ بہت طویل، ٹھن، اور کانٹوں بھرا ہے۔“

”میں پاؤں کے چھالے گننے سے نہیں ڈرتی، ویسے بھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ گفتی پر نظر رکھنے والے سوداگر ہوتے ہیں اور میں نے سود کرنا نہیں سیکھا۔“

اس وقت اس کے لمبے میں اور آنکھوں میں ایک ایسا عزم تھا کہ جس کے آگے پہاڑ بھی ٹکھڑ کر رہے ہو جاتے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سینے سے سنورے ہال بکھیر دیے۔ وہ مسکرا دی۔ اسی لمحے سرتراک پینز کو الوداع کہنے کے لیے دروازے میں آئے اور انہوں نے سارہ کے ٹکھڑے ہال اور اس کا میری طرف دیکھ کر مسکراتا دیکھا۔ اک لمحے کو ان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا لیکن انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانا خوب سیکھ رکھا تھا۔ انہوں نے پینز کو الوداع کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر سارہ سے نظر اٹا کر دوسری جانب سے نکل گیا۔

اگر ہا پاکو پڑ چلا کہ میرے غم پیچھے نے پورے لندن کے یہودیوں کو کس مشکل میں ڈال دیا ہے تو جانے وہ کیا سوچتے۔ ہمارے گھر میں مذہب کو بھی اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ ہمارے گھر میں پانچ وقت کی نماز تو دور کی بات ہے جمعہ اور عید پر بھی برائے نام وردکھا دے کے لیے عید گاہ جانے کا رواج تھا۔ قرآن کو ہمارے ہاں صرف اونچے حلق پر سجا کر رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا تھا۔ آخری مرتبہ شاید اسے میری بڑی بہن کی رخصتی

کے وقت اس کے سر پر رکھنے کے لیے اس طاق سے اُسے اتارا گیا تھا۔

مجھے اپنے لڑکپن کی ایک بات ہمیشہ یاد ہے گی۔ جب میں پندرہ سولہ سال کا تھا، ٹھیک آج سے قریب اسی سال پہلے، جب میری کلاس کی ایک ہندو لڑکی کامنی پر میرا دل آ گیا تھا۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آ گئی تھی، شاید میری سالگرہ کا دن تھا۔ اس وقت ہمارے گھر روز پڑھانے کے لیے آنے والے مولانا صاحب آئے ہوئے تھے جنہوں نے عصر کے وقت ہمیں زیرِ دقت وضو کروا کر اپنے ساتھ نماز کے لیے کھڑا کر رکھا تھا۔ جیسے ہی میری نظر کامنی پر پڑی، میں نے جلدی سے نماز توڑ دی تھی تاکہ کامنی کو یہ نہ پتہ چلے کہ میں نماز بھی پڑھتا ہوں۔ صرف کامنی پر ہی کیا منحصر تھا میں اب تک بھی اپنی کسی لڑکی دوست کے سامنے نماز پڑھنے سے کتراتا تھا۔ پتہ نہیں میرے دل میں ایک عجیب سی جھجک تھی کہ مجھے اپنی گرل فرینڈز کے سامنے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس سے میرا اثر ان کی نظر میں خراب ہو جائے گا۔

اس دن جب میں نے بابا کو کامنی کے آنے اور میرا اپنی نماز توڑ کر بھاگ کر بڑے کمرے میں بچھپ جانے کا واقعہ سنایا تو وہ بہت دیر تک ہنستے رہے تھے۔

اس دن جب پیئر یو غورشی آیا تھا، مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ طلبہ کی بہت بڑی تعداد اب خود میرا نرم پیچہ سننا چاہتی تھی، پڑھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ انتظامیہ کے پے در پے اقدامات نے جو دھیرے خلاف کر رہی تھی۔ ان سب میں تجسس کی ایک ہر دوڑ دی تھی۔ وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ آخر ایک معمولی اور عام طور پر یو غورشی کی لائبریری کے طاقوں میں مٹی اور گرد کے نظر ہو جانے والے اس نرم پیچہ میں، میں آخر کیا بات لکھنا اور کہنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے آئے دن مجھے گھبرنے کے لیے نئے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ اور یہی سرسبزک کی بنیادی غلطی تھی۔ انہوں نے طلبہ کے اس تجسس کو ہوا دے دی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ اگر مجھے روزمرہ کے معمول کی طرح خود اپنا نرم پیچہ پڑھنے اور پیش کرنے کی اجازت دی جاتی تو شاید وہ متنازعہ و ضرور ثابت ہوتا لیکن اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو اب بن پڑھے اور پیش کیے ہی دھیرے دھیرے طلبہ کے ذہن پر ہو رہا تھا۔

اسی شام جب میں منبر کے کنارے اپنے پسندیدہ شیخ پر بیٹھا سامنے منبر میں تیرتے پرندوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ربیکا شاید مجھے ڈھونڈنے ہوئے ہی وہاں آ لگی، دُور سے اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری طرف چلی آئی۔ کالے اسکرٹ پر اس نے سفید پھولوں والی بہت خوبصورت سی قمیض پہن رکھی تھی اور اس لباس میں وہ خود بھی کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچی سوچی سی تھیں۔ جیسے بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ بہت دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے، پھر وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا میں تم سے معافی مانگنے کا حق اب بھی رکھتی ہوں؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”دوست ہر حق رکھتے ہیں، سوائے معافی مانگنے کے حق کے، یہ حق انہیں بھی نہیں دیا جاسکتا کیونکہ دوستی میں اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ دوست کبھی غصہ ہو ہی نہیں سکتا تو پھر معافی کیسی؟“

”نہیں۔۔۔ غلطی تو میری بہت بڑی تھی۔۔۔ لیکن میں جانتی تھی کہ میڈی کا طرف کتنا بڑا ہے اور وہ آگے سے مجھے میری معذرت کا

کیا جواب دے گا۔“

”جانے دو! بات تو سنا کو۔۔۔۔۔ اتنے دنوں کے بعد بات کی ہے تو کچھ اور کہو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کہہ لینے دو۔۔۔۔۔ ورنہ یہ کاشامیری روح میں ہمیشہ پنہاں ہی رہے گا۔ اس دن جب تم نے مجھے یہ کہا تھا کہ کوئی پہلے سے تمہارے دل و جان پر قابض ہے تو مجھے شدید دکھ، شدید جلن کا احساس ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ تمہارے جذبات سارے کے لیے ہیں۔ ورنہ سارے بھی شدید ناراض ہو گئی تھی۔ لیکن کل سارہ نے جب زبردستی میں اسی نہر کے کنارے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب بٹھایا اور اس نے مجھے ایمان کے بارے میں بتایا تو یقیناً کروٹیں شرم اور عداوت سے خود سے بھی نظر نہیں ملا پارہی تھی۔ میری محبت تو بہت سچی لگی میڈی۔۔۔۔۔ اصل میں تو محبت تم نے کی ہے۔۔۔۔۔ ہم سب کو اسی محبت کے پہلے پہر کے بھی حق دار نہیں ہو سکتے۔ مجھ جیسے کم حوصلہ اور کم ظرف محبت کی شام تک بھلا کیسے پہنچ پائیں گے۔“

دوسرے دن کا کریمیشی دھیرے دھیرے بولتی رہی۔ دل کا غبار اپنے آنسوؤں سے دھوئی رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔

”ایسا نہیں ہے رہی۔ تم تو ایک لمحے میں ہی محبت کے تینوں پہر بھانگ کر محبت کی شام میں پہنچ گئی ہو۔ ورنہ آج اس وقت یوں اس طرح میرے پاس بیٹھ کر یہ سارے اعتراف نہیں کر رہی ہوتیں۔ اصل میں تو تم ہی محبت کی اس شام کی حق دار ہو۔ غصہ نہ کرو اور میٹھی محبت کی شام۔۔۔۔۔ جو اس وقت تمہارے آس پاس ہی کہیں منڈا رہی ہے۔“

ریکا رو پڑی۔

”نہیں حماد۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا دل درد سے یوں کٹ نہ رہا ہوتا، مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ دل اب بھی یوں نہ تڑپ رہا ہوتا۔ میں تمہارے سامنے بیٹھی یوں کم ظرفوں کی طرح آنسو نہ بہا رہی ہوتی۔ میں تو اتنی ناشکری ہوں کہ میں تمہاری اہول دوستی کی قدر بھی نہیں کی۔ تمہاری محبت پانے کی خواہش میں اس دوستی کو بھی رد کرتی رہی تم مجھے اس بات کے لیے بھی معاف مت کرنا۔۔۔۔۔ کبھی مجھ پر رحم نہ کھانا۔“

وہ بولتے بولتے ہلک پڑی۔ میں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ اور اسے کھل کر رونے دیا۔ محبت کا کاشا جب جسم میں چھب جائے تو اس کا زہر بدن سے صرف اور صرف آنسوؤں کی صورت میں ہی نکالا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس زہر ملی محبت کا ذائقہ بھی نہیں ہی ہوتا ہوگا۔ دوسرے دن مجھے پتہ چلا کہ پیڑ نے اپنے دھوے کے ثبوت کے طور پر لائبریری ہی کے دو مانتوں کو بیان دینے کے لیے یونیورسٹی انتظار کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ دونوں بھی یہودی ہی تھے۔ یونیورسٹی نے عارضی طور پر مجھے کلاسین لینے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ انکوائری مکمل ہونے تک مزید کسی بڑے ”ہنگامے“ سے بچنا چاہتے تھے۔

یونیورسٹی میں جب یہ خبر پھیلی تو میری ساری کلاس ہلک آئی۔ طلبہ نے میرے حق میں نعرے بازی شروع کر دی، انہوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے کارڈ اور پینر اٹھائے جن پر ”انصاف۔۔۔۔۔ انصاف۔۔۔۔۔ انصاف“ لکھا ہوا تھا۔ طلباء کی قیادت ریکا اور جم کر رہے تھے۔ جم خاصا



مشغول تھا اور اس نے انتظامیہ کو دیکھ کر کہہ دیا کہ اگر مجھے کلاس لینے کی فوری اجازت نہ دی گئی تو وہ تمام طلباء کو لے کر باہر سڑک پر نکل جائے گا اور یہ بڑا تباہی پورے شہر کی تھیں درس گاہوں تک پھیلا دی جائے گی۔ یونیورسٹی کا میدان، نہر کنارے، راہدار یوں اور چھتوں پر ہر جانب اسٹوڈنٹس ہی دکھائے دے رہے تھے۔ میں جب کلاس سے نکل کر باہر آیا تو ان سب کے نعروں میں شدت آ گئی۔ ان سب کو ایک انجینیئر کے لیے اس طرح لڑتے دیکھ کر میری آنکھوں کے گوشے خود بخود بھیگ گئے۔ مجھے لگا ایمان کسی ستون کی اوٹ سے مسکرا کر جھٹک رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ "میں نے کہا تھا نا۔۔۔ تم کبھی اس لیے نہیں ہو گے۔۔۔ میں ہر لمحہ محبت کی صورت میں۔۔۔ دوستی کی صورت میں تم پر برقی رہوں گی۔ میری محبت روپ بدل بدل کر تمہارے ارد گرد منڈلاتی رہے گی۔ میں تمہیں اتنا مستحضر کر دوں گی کہ لوگ تم پر مرنے کے لیے ہر دم تیار رہیں گے۔ میری محبت ہر لمحہ تمہارے گرد عظمت اور حفاظت کا حصار بنائے رکھے گی۔"

جم نے مجھے یوں گم سم بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھڑے دیکھا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے مجھے گلے سے لگایا۔ ساری یونیورسٹی نعروں سے گونج اٹھی۔ میں رو پڑا، آنسو خود بخود میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ جم نے میرے دھڑکے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"فکرت کرو باغی بڑے۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

میں نے سارہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ اتنے میں ذین آئزک کے کمرے سے اعلان ہونے لگا کہ میں جہاں کہاں بھی ہوں۔ فوراً ان کے کمرے میں پہنچوں۔ ایک بار پھر شور مچ گیا۔ سب میرے ساتھ ہی ذین کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میرا ایک ہاتھ جم نے اور دوسرا بیکانے تھم رکھا تھا۔ ان سب کو کمرے کے باہر چھوڑ کر میں اندر داخل ہوا تو میری نظر سارہ پر پڑی جو غصے میں سرخ چہرہ لیے ذین کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ دروازے میں ہی اس کا میرے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے چند لمحوں میں میری جانب دیکھا۔ پھر نکلے

نکلے اس نے میرا ہاتھ اک گھڑی کے لیے تھما اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"فکرت کرنا۔۔۔ یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔ میں نے تمام اسٹوڈنٹس کی طرف سے بڑا ہال کی کال جمع کروادی ہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ یہ تمہیں کیسے یہاں سے باہر کرتے ہیں۔"

سارہ میرا ہاتھ چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ اندر کمرے میں سر آئزک انتہائی غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ سارہ کو مجھ سے بات کرتے دیکھ کر تو ان کا چہرہ بالکل ہی بگڑ گیا تھا۔ سامنے میز پر پرلی جانب جیوری کے دو اور ارکان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سر آئزک میری طرف پٹنے اور غصے میں غرائے۔

"دیکھ رہے ہو مسز حماد احمد رضا۔۔۔ تمہاری وجہ سے آج اس یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ڈسٹنس کی کیسی دجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ یونیورسٹی کے نام پر دھبہ لگ گیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس یونیورسٹی میں طلباء نے میرے حکم کے خلاف جانے کی جرأت کی ہے۔ بغاوت کی ہے۔۔۔ اور اس سب کے ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو۔"



میں نے بڑی مشکل باہر صبح لڑکے اور لڑکیوں کو دوبارہ کلاس میں جانے پر آمادہ کیا۔ جم کے قبا قاعدہ ہاتھ پیر جوڑنے پڑے تب جا کر وہ کہیں نکلا۔ ربیکا اس بات پر بھی بے حد خفا تھی کہ میں نے اندر ٹرم پیپر پیش نہ کرنے کی شرط پر حامی کیوں بھری۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل میں یہ سارا کھیل ہی مجھے اس پیپر کو پیش نہ کرنے کی خاطر کھیلایا گیا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے دوسرے کسی طالب علم یا جم وغیرہ کو بھی عتاب کا نشانہ بنایا جائے۔ مجھے انگوٹری کے خاتمے تک انتظار کرنا ہی تھا۔ سارا بھی وہیں کھڑی چپ چاپ ہماری بحث سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ جیسے اس کے اندر بہت سے سوال چل رہے ہوں لیکن وہ انہیں پوچھ نہیں سکتی ہو۔ جیسے اس کے اندر ایک جنگ سی جاری ہو۔ میں نے سوا یہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے آگے چلکی بجاتی۔ وہ چونک سی گئی، میں نے اسے پھینرا۔

”ہے کس آنزک۔۔۔ دیکھا لوگ ہم سے کس قدر خوف زدہ ہیں۔ مسلمان نام اتنا خوف ناک تو نہیں تھا کبھی۔۔۔۔۔ تمہارے پاپائے تو بھی سے مجھے تمہاری مستقبل کی شادی میں باراتی کی حیثیت سے دعوت نامہ بھی دے ڈالا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں میں تمہیں بھاگ کر نہ لے جاؤں۔“

سارا اور ربیکا دونوں ہی ہنس پڑے۔ ربیکا نے ٹھنڈی آد بھری۔

”اب سارا آنزک کو کون سمجھائے کہ تم کسی لڑکی کو نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ مجھ جیسی کئی لڑکیاں تمہیں اپنے ساتھ بھاگ لے جانے کی ناک میں ہیں۔“

ربیکا پوچھی سب کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرتی رہی لیکن میں نے نوٹ کیا کہ سارا اس وقت ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نہ تھی۔ جانے اس کے دماغ کہاں اُلکھے ہوئے تھے۔

☆☆

یونیورسٹی کا بڑا ہال کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ آج سب طالب علم اپنا اپنا ٹرم پیپر جمع کروانے کے بعد ہال میں جمع ہوئے تھے۔ یہاں پر آج چند بہترین طالب علموں کو اپنا پرچہ اور اپنی تحقیق باقی طالب علموں کے سامنے پڑھ کر سنانے کا موقع دیا گیا تھا۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ آج صرف تین اسٹوڈنٹ جنٹوں نے پچھلے سسٹر میں یونیورسٹی بھر میں پہلی تین پوزیشنز حاصل کی تھیں۔ وہی اپنا منتخب ٹرم پیپر حاضرین کے سامنے پیش کریں گے۔ خاصی بڑی تقریب تھی۔ لندن کے صدر صاحب حسب معمول مہمان خصوصی تھے۔ لوگوں کی تعداد پچھلے چند ہفتوں سے جاری انتظامیہ اور میرے درمیان چٹکاش کی وجہ سے بھی بہت زیادہ تھی۔ جانے یہ خیر کہاں کہاں گردش کرتی رہی تھی۔ سائنس کے اس دور میں لوگوں کو لاعلم رکھنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ انہی میں اخباری رپورٹرز و فوٹو گرافرز کی بڑی تعداد بھی شامل تھی جو ہر سال کی طرح اس سال بھی یونیورسٹی کی اس خاص تقریب کی ترویج کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت کم ہی ایسے ہوں گے جو میرے چہرے سے واقف ہوں گے لیکن بقول جوزف ان میں سے ہر ایک کم از کم میرے نام سے ضرور واقف تھا۔

کچھ ہی دیر میں سارا آنزک نے اسٹیج پر آ کر مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ ان چند بڑے ناموں کا اعلان کیا جو یونیورسٹی کو لاکھوں پاؤنڈ سالانہ چندہ دیتے تھے اور جن میں سے اکثر اس وقت اس تقریب میں ہال کی پہلی زد میں موجود بھی تھے۔ یہ سب کے سب نام یہودیوں کے ہی تھے۔ ان میں سے اکثر کی اپنی اوادیں بھی اسی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے چند طلباء و طالبات کو ان کی غیر معمولی

قابلیت پر سند اور میڈل وغیرہ دیے گئے۔ اس کے بعد ان اسٹوڈنٹس کو اپنا پرچہ پڑھنے کی دعوت دی گئی جن کے نام آج کی فہرست میں شامل تھے۔ ان ناموں میں سارہ کا نام بھی شامل تھا کیونکہ پچھلے سمسٹر میں بھی ہمیشہ کی طرح اس نے نئی پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

سب سے پہلے جنی فوکس نامی لڑکی نے معاشیات پر اپنا پرچہ پڑھا اور ہال سے خوب داد وصول کی۔ اس کے بعد مارٹن نامی سبباؤل کے طالب علم نے لندن کی مدانی عمارتوں کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کی۔ اس کا پرچہ بھی واقعی جواب تھا۔ ہال نے اسے بھی جی بھر کے ستائش کا انعام دیا۔ اس کے بعد سارہ کا نام پکارا گیا۔ بلیک کوٹ اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس سارہ نے سفید لمبے کے ساتھ اپنا پسندیدہ سکارف بھی گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے مجھے ایک دن بتایا تھا کہ سرخ رنگ کا یہ اسکارف وہ صرف خاص موقعوں پر ہی پہنتی تھی۔ آج بھی اُس نے اپنے بے ہال پیچھے کس کر باندھے ہوئے تھے اور زور سے بالکل کسی کالونٹ اسکول کی طالبہ سی تو لگ رہی تھی۔ سارہ کا نام پکارے جانے پر ہماری ساری کلاس نے خوب شور مچایا جن میں جم اور ریکاسر فہرست تھے۔ سارہ مسکراتی ہوئی اسٹیج پر چڑھ گئی۔ اس نے ہال کے تمام حاضرین کا اور صدر تقریب کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اُس نے اپنے سامنے اسٹیج پر بنے چھوٹے سے ٹشے کے روٹزم (ڈانس) پر کھائے اپنے پرچے کا پسلا صفحہ پلانا۔

”جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ میرے پرچے کا عنوان ہے ”ہالوکاسٹ۔۔۔۔ ایک نظریہ یا ایک حقیقت۔؟۔۔۔۔ آج سے تین ماہ پہلے بھی میں نے اسی موضوع پر پہلے حصے کی حیثیت انعام بھی حاصل کیا تھا۔ آج میں اُسی پہلے حصے کا دوسرا حصہ آپ سب کے سامنے پیش کرنا چاہوں گی۔“ سفید ہے آپ سب کی توجہ مجھے حاصل رہے گی۔“

پہلی قطار میں بیٹھے سر آئزک فخر اور مسرت سے اپنی بیٹی کا با اعتماد انداز دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ساتھ بیٹھے میزور چند دیگر خصوصی مہمانوں کو بھی دھیرے سے بتایا کہ سارہ ان کی بیٹی ہے۔ سب نے ستائش انداز میں سر ہلائے۔ سارہ کی بات جاری تھی۔

”یہاں میں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ پہلے حصے کو تحریر کرتے وقت میں نے تحقیق کی بجائے زیادہ تر مواد اکٹھا کرنے پر اپنی توجہ قائم رکھی تھی۔ شاید اس وقت تک مجھے تحقیق کرنے کی اتنی عادت نہیں تھی یا صرف تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے رہنے کی وجہ سے میں نے دوسرے رخ کو چھپنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن آج میرا ٹرم پیپر پوری تحقیق اور دلائل کے بعد مرتب ہوا ہے۔ میرے پاپا۔۔۔۔۔ سر آئزک نے مجھے ہمیشہ ڈکے کی چوٹ پر بچ بولنے اور بچ بننے کی تربیت دی ہے اور بچ یہ ہے کہ آج اگر میں آپ سب کے سامنے اس اسٹیج پر فخر سے کھڑی ہوں تو یہ فخر دینے والے اصل میں میرے پاپا، میرے سب سے بڑے استاد خود ہیں۔“

سارے ہال نے سارہ کی اس بات پر تائیاں بجا کیں۔ سر آئزک کا سر فخر سے مزید تن گیا، سارہ نے پہلا صفحہ ختم کر کے دوسرا صفحہ پلانا۔

”ہالوکاسٹ، پر تحقیق کے دوران میں نے بچ اور مفرد بننے کی ایک عجیب سی جنگ دیکھی۔ یہ جنگ باہر بھی ہو رہی تھی اور خود میرے اندر بھی، میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ لوگوں کو بچ کہنے اور بچ بننے سے اس قدر گریزاں دیکھا۔ ایک عجیب انسان ہماری زندگیوں میں آیا اور اس نے سب کچھ جس نہیں کر کے رکھ دیا۔ میں نے اپنے پاپا کے بعد بچ کا دوسرا سبق اُسی انسان سے سیکھا۔ میں نے یہ بھی سیکھا کہ کوئی کس طرف بچ پر قدم جم کر کھڑا ہو سکتا ہے اور ساری کائنات سے نکل لینے کی ہمت کر سکتا ہے۔ میرا آج کا ٹرم پیپر، یہ تحقیق اور یہ تجربہ دراصل میری نہیں ہے، بلکہ اُسی سچے

انسان کی تحقیق ہے جس کا نام حاد رضا ہے۔“

ہاں میں جیسے کسی نے ہم کا دھماکا کر دیا ہو، اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سر آڑک غصے میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کسی سے چلا کر مائیک بند کر دینے کا کہہ لیا۔ لیکن تب تک جم اور ڈیوڈ وغیرہ نے ہال کے آڈیوسٹم پر قبضہ کر لیا تھا۔ دنگھٹے ہوئے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کے جسم میں جیسے کسی نے بجلی سی بھری تھی۔ وہ دھڑا دھڑا سارے اور دیگر لوگوں کی سر آڑک سمیت تصاویر بنانے لگے۔ میز نے آہستہ سے سر آڑک کے کان میں کچھ کہا شاید ان کی توجہ اخباری رپورٹرز کی طرف متوجہ کر دئی۔ سر آڑک بے بسی کے عالم میں خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اور بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئے۔

خود میرے لیے بھی یہ کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سارے اپنے پرچے کی جگہ میرے پرچے پڑھنے کے لیے آئے گی۔ اس نازک سی لڑکی کی جراتوں کی حد جانے کہاں جا کر ختم ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہت مشکل۔۔۔۔۔ سارے کی تقریر جاری تھی۔

”نظریہ ہالوکاسٹ کی ابتدا صیہونی ورلڈ آرڈر کے اسرائیلی لیڈر اور وزیر اعظم ڈیوڈ بن گورین کی تحریک سے شروع ہوتی ہے اور اس کے لیے جرمنی کے ہیڈر اور دوسری جنگ عظیم کے ایک مشہور کردار ہٹلر کو ہدف بنایا گیا۔ وجہ برطانیہ اور امریکہ کی یہودی رہنمائی کو یہ یقین دہانی تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد سلطنت یہودیوں کے نام ہوگی۔۔۔۔۔

سارے میرے پیچھے پڑھتی جا رہی تھی اور ہال پراک سٹانا سا چھایا ہوا تھا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جرمن اور ہٹلر ہی ہدف کیوں بنے۔۔۔۔۔؟ جواب ہٹلر کی یہودی دشمنی سے ظاہر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہودیوں کو جرمنی بدر کر دیا گیا۔ سٹلے اور دیگر جنگی ساز و سامان کی فیکٹریاں یہودیوں سے چھین لی گئیں۔ کلیدی اسامیوں اور عہدوں سے یہودیوں کو ہٹ کر جرمن باشندوں کو تعینات کر دیا گیا تھا اور یوں یہودی جرمنی کے خلاف ہو گئے۔ یہ سلوک نہ صرف جرمنوں نے بلکہ روہنیہ اور دیگر کئی ملکوں نے بھی یہودیوں کے ساتھ ردوار کیا۔ وریمیں سے ہالوکاسٹ کے نظریے کی ابتدا ہوئی۔ شروع میں میں نے بھی بغیر تحقیق کے اس حق میں چھپنے والی بہت سی کتابوں سے حوالے لے کر اسے سچ مانا لیکن آج حاد رضا اس کے پرچے اور اس کی تحقیق کے نتیجے میں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہودی مصنفین اور محقق آج تک اتنی بڑی ہلاکتوں کے بارے میں ایک بھی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ جرمنوں کے ہاتھوں یہودیوں کی ہلاکتیں تو ضرور ہوئی تھیں لیکن اصل تحقیق اور تمام تر شواہد اور ثبوت چند ہزار ہلاکتوں سے زیادہ کی تصدیق نہیں کر پائے۔“

سر آڑک نے غصے میں اٹھ کر دوبارہ ہال سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک ہال سے باہر موجود لوگ بھی اندر گھس آئے تھے اور دروازوں کے قریب اور ہال کے اندر نشستوں کے درمیان بنے راستوں میں اس قدر جھوم تھا کہ وہ تھملا کر وہیں کہیں بٹھکتے رہ گئے۔ سارے بولتی رہی۔

”دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اتنے بڑے پیمانے پر جرمن فوج نے یہودی قتل عام کیا بھی تھا تو اس وقت کے اخبارات، جرائد اور رسائل اس بارے میں اس قدر خاموش کیوں ہیں۔ پچھلے کئی دنوں میں میں نے دوسری جنگ عظیم سے لے کر ہالوکاسٹ کا نظریہ سامنے آنے تک کے دور کے ہر خبر، ہر رسالے، ہر خبر کو چھن مارا ہے لیکن مجھے اتنی بڑی ہلاکتوں کی خبر جرمن دشمن اخبارات اور رسائل میں بھی نہیں ملی۔ آخر کیوں؟



تیسرا سوال یہ ہے کہ "ہالوکاسٹ" کا الزام تو جرمنوں پر لگایا جاتا رہا ہے لیکن اس وقت کی یہودی قوم کی طرف سے دباؤ ہمیشہ فلسطین اور قبلہ اول اور گومات کی پہاڑیوں کی طرف نقل مکانی کی صورت میں ہی کیوں نکالا گیا۔ میں جانتی ہوں کہ قبلہ اول ہر یہودی کے لیے اپنی زندگی سے زیادہ مقدس ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ اس نقل مکانی کے لیے ہالوکاسٹ کے نظریے کا ہی سہارا لیا جاتا۔۔۔ کیا کوئی مجھے جرمنوں کے خلاف اٹھائے جانے والے کسی اقدام کے بارے میں بتائے گا۔۔۔ اصل مجرم تو یہودیوں کے نزدیک جرمن تھے۔۔۔ لیکن ان کے خلاف ایسا کچھ نہیں کیا گیا جس کا کوئی قابل ذکر کہیں بھی سنائی دیا ہو۔۔۔ آفریکوں۔۔۔؟

پھر سارہ نے ان تمام تعینات کے نام پڑھے جن سے میں نے ہالوکاسٹ کے نظریے کے خلاف شواہد اکٹھے کیے تھے اور تمام اسٹوڈنٹس کو ان تصانیف کو ایک بار پڑھنے کا مشورہ بھی دیا۔ مجھے یقین ہے اتنے دنوں میں سارہ نے خود بھی ایسی ہر ایک تعینات کو چھان مارا ہوگا جس کا حوالہ نہیں نے پڑے میں دے رکھا تھا۔ آخر میں سارہ بولی۔

"بحث یہ نہیں ہے کہ "ہالوکاسٹ" مفروضہ ہے یا حقیقت۔ بحث تو اب یہ ہے کہ کچھ کوڑا بننے کے سامنے پیش کرنے سے اور بچ بولنے سے اس قدر خوف کیوں۔۔۔؟ نہیں اپنی نئی نسل کو اس بات کی دعوت دیتی ہوں کہ ہمیں خود آگے بڑھ کر کچھ کے نقاب کو الٹ دینا چاہیے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے اس وقت کچھ متعصبہ حاصل کرنے کے لیے غلط بیانی سے کام لیا تھا تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں۔ کیوں تاہم خود چل کر کچھ کو تلاش کریں حماد احمد رضا کا یہ نرم ہنسنے کا یہ صرف ایک ابتداء ہے۔ ہماری نئی نسل کو کچھ کی طرف بلائے کی ابتداء۔ حمد نے اس پرچے میں کہیں بھی نہیں لکھا کہ "ہالوکاسٹ" سراسر جھوٹ ہے۔ لیکن اس نے اس کے مفروضے کے سچے ہونے پر انگلی اٹھائی ہے۔ اس نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ ایک قوم کے مظالم اگر ثابت ہو بھی جائیں تب بھی اس کا بدلہ کسی سازش کے ذریعے دوسری قوم سے لینا نا انصافی ہے۔ حمد کا یہ نرم ہنسنے سراسر انہی کی حدود میں تو کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا کیونکہ جو ہو چکا ہے بدلنا اب کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ کس نے کہاں پر اور کتنی غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ میں پھر کہوں گی یہ ہم سے تین سٹیس پہلے کیے گئے لوگوں کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں۔ تو پھر ہم آج کی نسل اس کی جواب دہی کیوں کرتے پھریں۔ یاد رکھئے۔۔۔ اس دنیا میں امن قائم کرتا ہے تو ہماری اس نسل کو ہی آگے آنا ہوگا۔ پھر چاہے وہ نسل یہودی ہو یا مسلمان، پورچین ہو یا امریکن یا افریقین۔۔۔ ہمیں اپنا امن کا نظریہ خود پیش کرنا ہوگا۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔۔۔ جس نسل جس قوم کے بھی بزرگوں نے جو کچھ بھی کیا چاہا ہے اپنی دانست میں درست ہی کیوں نہ کیا ہو اور وقت نے اسے غلط ثابت کر دیا ہو، چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ سب اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ ہمیں حال میں جینا ہے۔ ماضی کا حصہ بن کر اپنے بزرگوں کی غلطیوں پر پردہ ڈالنا، ان کے جرم سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہوگا۔ کیونکہ شاید انہوں نے وہ کام غلطی یا جرم سمجھ کر نہ کیے ہوں۔۔۔۔۔

میں اپنی اور ہر قوم کی نئی نسل کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ "ہالوکاسٹ" اور اس جیسے کسی بھی مفروضے کی حقیقت کو جاننے کے لیے خود تحقیق کریں۔ خود قدم آگے بڑھیں۔ چاہے وہ مفروضہ کسی بھی قوم یا نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اپنی دوستی اور دشمنی کی بنیاد اس نئی نسل کو خود رکھنی ہوگی۔ ہم سے پہلے گزرے ہوئے ہمارے بڑوں کی دشمنیاں ہمیں ان کے ساتھ ہی دفنانا ہوں گی۔"



سارہ نے میرے ٹرم ہیچ کا آخری صفحہ بھی ختم کر دیا۔ اور اسٹیج سے اترنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ ہال پر بہت دیر تک ایک موت کا سا سکوت جاری رہا۔ اور پھر سب سے پہلے لندن کے میز اور مہمان خصوصی نے اٹھ کر سارہ کے لیے تالی بجائی۔ پھر اس کے بعد دو، دو، دو کے بعد چار اور چند لمحوں میں ہی ہاں تالیوں، غزروں اور تعریفی کلمات کے شور سے جیسے پھٹنے لگا۔ سارہ کے پیچھے اخباری فوٹو گرافرز کی فلیش مشین کی روشنی جھماکے کر رہی تھی۔ وہ اسٹیج سے اتر کر سیدھی میرے پاس آئی اور ٹرم ہیچ میری طرف بڑھا کر مسکرائی۔

”یہ اپنی امانت۔۔۔۔۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس یونیورسٹی کے ہر طالب علم کے پاس آج شام تک اس ٹرم ہیچ کی ایک ایک نقل پہنچ جائے گی۔ تم نے سچ کے جس سڑکی دعوت دی ہے۔ وہ آج اسی یونیورسٹی کے اسٹیج سے میں نے شروع کر دیا ہے۔ اور تم دیکھنا کہ بہت جلد تمہارے قافلے میں لاکھوں نوجوان شامل ہوں گے۔“ ہمارے ارد گرد اسٹوڈنٹس، اخباری نمائندوں اور ہمارے ذاتی دوستوں کا ایک جھوم تھا۔ اخبار والے دھڑ دھڑ میری اور سارہ کی تصاویر بنا رہے تھے۔ رپورٹرز اپنے ٹیک آگے کیے جانے اور کیا کیا سوال کر رہے تھے۔ مجھے ان سب باتوں کا ہوش ہی کہاں تھا۔۔۔۔۔ دفعتاً میرے سامنے کھڑی سارہ کی جگہ ایمان نے لے لی۔ میں نے چونک کر ایمان کو دیکھا، اس پاس ہاں کا شور ساکت ہو گیا، لوگ ساکت ہو گئے۔ ایمان دھیرے سے مسکائی۔ ”میں نے کہا تھا۔۔۔۔۔ محبت فاتح عالم۔۔۔۔۔“

دفعتاً ایمان کی جگہ پھر سارہ نے لے لی، ہم دونوں کے گرد بیک، جم ڈیوڈ اور نیتانے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھیرا سا ڈانسا ہو تھا تاکہ ہم جھوم کے دھکوں سے بچ سکیں۔ میں نے سامنے کھڑی سارہ کے ہال ہاتھ بڑھا کر بکھیر دیے، سارہ مسکرا دی، سارا ہال مسکرا دیا۔ ساری دنیا مسکرا دی۔ ساری کائنات مسکرا دی۔

☆☆☆

## من و سلویٰ

دور حاضر کی مقبول ترین مصنفہ **عمیرہ احمد** کا بہت خوبصورت اور طویل ناول من و سلویٰ جس کا بنیادی موضوع رزق حلال ہے۔ من و سلویٰ جو بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے اتارا گیا اور رزق حلال جو امت محمدیؐ کے لیے عطا کیا گیا، لیکن نہ بنی اسرائیل من و سلویٰ سے مطمئن تھی اور نہ ہم رزق حلال پر قانع۔ انہیں انواع و اقسام کے زمینی کھانوں کی طلب تھی اور ہمیں کم وقت میں زیادہ کی رزق حلال کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

## نوجوان انقلاب

رات یونورسٹی کی تقریب سے نہیں بہت دیر بعد فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ ربیکا نے تقریب کے بعد اپنے خاص دوستوں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں سے آتے آتے آدمی رات ہی ہو گئی تھی۔ میں آتے ہی بستر پر پڑ کے سو گیا تھا۔ پھر نہ جانے کس وقت مجھے کامران کے شور نے جگا دیا۔ وہ میرے ان کی کمرے میں چلا تا ہوا داخل ہو رہا تھا۔

”اودہ تو میرا شہزادہ پورے شہر میں آگ لگانے کے بعد یہاں پڑا سو رہا ہے۔“ میں نے چندھیلی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”تم آج ریسٹورنٹ نہیں گئے اپنے۔“

”وہیں سے آ رہا ہوں۔ وہاں بھی تمہارے ہی فدائین کا جھوم جمع ہے۔ جو تمہارے دیدار کے لیے ترس رہے ہیں۔ سارے شہر کے اخبارات میں کل یونورسٹی ہال میں گئی اس یہودی حسینہ کی تقریر کے چرچے ہیں۔ تم دونوں کی تصویروں کی دھوم ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ آج اگر تم یہاں سے انکسٹن لڑنے کا اعلان کر دو تو بلا مقابلہ میز کا انقلاب جیت جاؤ گے۔ یہ گوری نئی نسل جب کسی کوسر پر بٹھاتی ہے تو پھر اترنے نہیں دیتی۔“

کامران نے آج کے اخبارات کا مونا سا پلندا میری طرف پھینکا۔ ہر اخبار کے پہلے صفحے پر سارہ کی تقریر کے دوران اور پھر میرے ساتھ کھڑے مجھے نرم پیپر واپس کرتے ہوئے کی تصویر اور ایسی کئی دیگر تصاویر چھپی ہوئی تھی۔ تقریباً ہر اخبار نے اس واقعے کو اور سارہ کی تقریر کو ”نوجوان انقلاب“ سے تشبیہ دی تھی۔ چند ایسے اخبارات نے جن کے مالکان یہودی تھے یا پھر یہودیوں کے زیر اثر تھے اور انہی کے چندے سے چلتے تھے، سارہ کی تقریر اور ہالوکاسٹ پر میرے پر سہے پر زبردست تنقید بھی کی تھی۔ اسے ایک جذباتی باتوں کا پلندا قرار دیا تھا لیکن اس وقت ان کی تنقید بھی ہماری شہرت کو بڑھانے کی ایک وجہ بن گئی تھی۔ اس نازک لڑائی کی جرأت نے میری بات شہر کے ہر گلی کو سہے میں پہنچا دی تھی اور کل تک انہی اخبارات کے ذریعے پورے یورپ میں در ہر نثریت کے ذریعے ساری دنیا میں پہنچنے والی تھی۔ لوگوں میں ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا تھا۔ نوجوان نسل نے سچ کی تلاش کے عنوان سے اپنے بڑے بزرگوں کو انہی اخبارات میں دعوت دی تھی کہ وہ ان کی مدد کریں، سچ جاننے میں اور سچ کو پھیلانے میں۔ سارہ نے سچ ہی کہا تھا۔ یہ قافلہ اب چل پڑا تھا۔ اس قافلے کی سربراہی خود سارہ ہی تو تھی۔

چند اخبارات نے جو یہودی اثر میں تھے۔ ہیلز کے ساتھ میرے فرضی جھگڑے کو بنیاد بنا کر اور اُسے بڑھا چڑھا کر بیان کر کے میری کردار کشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ سارہ اور میرے تعلق پر بھی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں۔ ان اخبارات نے خاص طور پر سارہ کے بال بکھراتے میرے بڑھے ہاتھوں والی تصویر کو شائع کیا تھا۔ گویا جنگ چھڑ چکی تھی۔ کچھ اخبارات نے مجھے خاص قوم کا ایک خطرناک ایجنٹ بھی قرار دیا تھا۔ جو ایک خاص ایجنڈہ لے کر یونورسٹی آیا۔ لیکن زیادہ تر اخبارات نے یکجہاں اچھا لڑنے کی بجائے میرے پیغام کو آگے بڑھایا تھا۔ سوچنے کے پیغام کو، تحقیق کر کے سچ

کے جاننے کے پیغام کو سارہ کی توہر اخبار نے زبردست تعریف کی تھی۔ اسے روایتوں سے بہت کرڈنی کے سامنے کھڑی ہونے والی لڑکی قرار دیا تھا۔ اسے نئی نسل کی آواز کہا تھا، میرا مقصد پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ بحث شروع ہو چکی تھی اور میں جانتا تھا یہ بحث آگے چل کر نئی نسل کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والی تھی۔

لیکن اخبارات میں اکا دکا چند ایسے واقعات کی بھی نشان دہی کی گئی تھی جو میرے لیے کافی تشویش کا باعث تھے۔ لندن کے مضافات میں اور چند یہودی آبادیوں کے ارد گرد تشدد کے اکا دکا واقعات کا بھی ذکر تھا جو سارہ کی اس تقریر کے نتیجے میں پیش آئے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ شدت پسندی اور انتہا پسندی کا التزام تو ہم پر لگایا جاتا رہا ہے ہمیشہ اور ایک تسلسل کے ساتھ، لیکن ان تنگ نظر یہودیوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا تھا جنہوں نے اپنی ہی نسل کی ایک معصوم لڑکی کی ایک چکی چاکر نسل تعصب کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے دو بجے آج یونورسٹی جانا تھا لیکن کامران نے مجھے اکیلے جانے نہیں دیا۔ اسے ان اکا دکا واقعات کی وجہ سے کافی تشویش تھی جو لندن کی یہودی بستیوں کے مضافات میں ہوئے تھے۔ وہ مجھے خود یونورسٹی کے گیٹ پر اپنی گاڑی سے اتار کر سی واپس ریسنورٹ گیا اور مجھے تاکید کر گیا کہ میں واپسی پر نکلنے سے پہلے بھی اسے فون کر کے بلوالوں اور پیدل، تنہا یونورسٹی سے نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ بچپن سے، یہاں ہی تھا، اسکول اور کالج میں جب بھی میرا کسی سے جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ یونہی میرے سائے کی طرح میرے ساتھ چپکار ہوتا تھا اور جب تک وہ خطرہ مٹ نہیں جاتا تھا مجھے کہیں اکیلے نہیں جانے دیتا تھا۔ یوں کئی مرتبہ ہم دونوں نے اکٹھے اور بہت مرتبہ اس نے میری جگہ اکیلے اپنے جسم پر بہت سے زخم کھائے تھے۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسے دوستوں کو ماں باپ کے ساتھ کا درجہ کون نہیں دیا جاتا؟

یونورسٹی کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے ہیلو، ہائے، اور مبارک ہادی آوازوں نے میرا استقبال کیا۔ حالانکہ آج یونورسٹی میں کل کی تقریب کی وجہ سے عام تعطیل کا اعلان کیا گیا تھا اس لیے یونورسٹی تقریباً خالی ہی تھی۔ صرف ہوشل میں رہنے والے چند اسٹوڈنٹس موجود تھے لیکن مجھے اپنے خلاف ہونے والی انکوائری کے سلسلے میں آج بدایا گیا تھا۔ ڈین آئزک کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے کانڈھے تھپک کر ہاتھ مارا اور گلے لگا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

ڈین آئزک کے کمرے میں تو پوری عدالت ہی لگی ہوئی تھی۔ جیوری کے ممبر، پینل اور اس کے دونوں گواہ موجود تھے۔ ایک دو نئے چہرے بھی موجود تھے جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر آئزک کی آنکھیں سوچھی ہوئی تھیں اور چہرہ اتر اتر ہوا تھا۔ یقیناً رات کو دو بجے جب سارہ کو ریکالنے، میں نے اور ہمارے ساتھ کی تمام ٹوئی نے گھر چھوڑا تھا تب اس کے بعد ان کی اور سارہ کی ایک طوفانی بحث یا جھگڑا ضرور ہوا ہوگا۔ میری آج سارہ سے بھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے میں صرف اپنے طور پر خیالی گھوڑے ہی دوڑا سکتا تھا کہ کل رات سارہ کے گھر میں کیا ہوا ہوگا۔ جیوری نے ہنی کارروائی شروع کی۔ میرے خلاف الزامات کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی جس میں اب یونورسٹی کی منفی شہرت کا سبب بننے کا الزام بھی شامل کیا جا چکا تھا۔ لیکن آج مجھے جیوری کی غلط میں دکھائی دے رہی تھی۔ میرا تھا تو اسی وقت تھا تھا جب خصوصی طور پر آج مجھے چھٹی والے دن پیشی کے لیے بلایا گیا تھا۔

سنے والے بھاری بھر کم اور موٹی توند والے صاحب کا نام پارک تھا۔ وہ لندن کی خفیہ پولیس کے ٹیکشن انچارج تھے۔ ان کے ساتھ خفیہ ایجنسی ایم۔ آئی، کے دو اہلکار بھی موجود تھے۔ پیٹر نے پھر سے اپنی رام کہانی سنی۔ اس مرتبہ دونوں گواہوں نے بھی بیانات دیے۔ میرا بیان تو پہلے سے وہی تھا کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن جیوری نے میرا اعتراض رد کر دیا اور بلاا فریصلہ سنایا کہ مجھے فوری طور پر یونیورسٹی کے اس ٹرم سسٹمز سے فارغ کیا جاتا ہے اور پیٹر کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ جنگ عزت کا دعویٰ کرنا چاہے یا اگر اسے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا تو وہ پولیس سے بھی رابطہ کر سکتا تھا۔ شاید اسی لیے آج مجھے یہاں پولیس والے حضرات بھی نظر آ رہے تھے۔

پارک اس تمام کارروائی کے دوران غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے سراسر تڑک سے پوچھا کہ کیا مجھے اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی کی حد تک تو فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ البتہ میں چاہوں تو لندن کی کسی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف جاسکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے دے لفظوں میں یہ دھمکی بھی دی کہ انہوں نے پیٹر کو فی الحال پولیس میں میرے خلاف جانے سے اسی شرط پر روک رکھا ہے کہ میں اس فیصلے کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤں گا۔

جیوری نے فیصلہ سن دیا تھا سراسر تڑک کا چہرہ فیصلہ سننے کے بعد بھی اترا ہی رہا۔۔۔۔۔ شاید انہیں آنے والے حالات کا کچھ اندازہ تھا۔ وہ یونیورسٹی میں صرف میری کلاس عارضی طور پر شمع کرنے کا انجام دیکھ چکے تھے۔ وہ جیوری کے ساتھ فیصلہ سنانے کے بعد بھی بہت دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

میں کمرے سے نکل آیا۔ میرا حیدان کسی اور طرف تھا کہ پیچھے سے موٹی توند والے پارک نے مجھے پکارا۔ میں نے پت کر اُسے دیکھا۔ وہ میرے قریب پہنچ چکا تھا اُسے ہر لمحہ جو غم چبانے کی عادت لگتی تھی۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو تم ہو محماد۔۔۔۔۔ جس نے آج پورے لندن میں آگ لگا رکھی ہے۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ آگ لگانے کی قوت رکھتے ہو۔۔۔۔۔ میں جیوری کی تمام کارروائی کے دوران بہت غور سے تمہیں دیکھ رہا تھا، تمہارے چہرے پر ذرا سی بھی پریشانی نہیں تھی۔“

”میں جانتا تھا کہ یونیورسٹی انتظامیہ یہی فیصلہ کرے گی۔ فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔ آج صرف سنایا گیا ہے۔“

پارک جو غم چباتے ہوئے اپنی ذہنی پینٹ کے کیلس اوپر کھینچتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب۔۔۔۔۔ مجھے تمہارا اعتماد واقعی بہت پسند آیا۔۔۔۔۔ کیس تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ یونیورسٹی کے باقی اسٹوڈنٹس کو شہر کی سڑکوں پر لاکر جیوری کو اپنا فیصلہ دہسینے پر مجبور کر دو گے۔ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں اطلاع دیتا چاہتا ہوں کہ انتظامیہ نے کل سے یونیورسٹی کو پندرہ دن کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ اسٹوڈنٹس کے کسی ممکنہ ری ایکشن سے بچا جاسکے۔“

پارک نے خبر نہ کر پھر باہر پولیس والوں کی طرح میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ حالانکہ وہ یہ سب نہایت غیر محسوس طریقے سے کر رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

”آپ بے فکر رہیے۔ اس یونیورسٹی کی اسی سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسٹوڈنٹس کو دو ہفتے کی چھٹی بغیر کسی طاع کے کل رہی ہے۔ وہ سب

اس چھٹی کو بہت خوشی سے پُر لطف انداز میں گزاریں گے۔"

میں گے بڑھنے لگا۔ پار کرنے صدی سے پھر مجھے پکارا۔

"آگے کا کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ سوچا نہیں۔ اپنے خلاف جھوٹے الزام کا سامنا کروں گا۔" میں پھر آگے بڑھنے لگا۔ پار کر پھر بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ الزام جھوٹا ہے۔"

میں رُک گیا۔ میں نے حیرت سے پار کر کے جانب دیکھا۔ وہ حسب معمول جو غم چباتا رہا۔ "آپ جانتے ہیں پھر بھی آپ میرے خلاف

ہوتی انکوٹری کے دوران پُپ چاپ خاموش بیٹھ رہے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟"

"کیونکہ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور ان لوگوں کے پاس گواہ کے طور پر سارے ثبوت موجود تھے۔ تم نہیں جانتے، تم نے اور تمہاری

دوست سارہ نے اس وقت لندن کی تمام انتظامیہ اور سارے خفیہ ڈیپارٹمنٹ کو ہمارا رکھ دیا ہے۔ ساری پولیس کو کنٹرولنگ ایکشن کی وجہ سے الٹ کر دیا

گیا ہے۔ اگر یونیورسٹی انتظامیہ ہمیں طلب نہ کرتی تب بھی لندن انتظامیہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ معاملہ اب اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے۔"

"لیکن آپ یہ کیسے جانتے ہیں کہ ان کا الزام جھوٹا ہے۔"

"میں اس سے پولیس کے محکمے کی خاک چاٹ رہا ہوں بخود دار۔۔۔ اس نمیبٹ لائبریری کی شکل پر ہی لکھا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا

ہے۔ درمیر اندازہ ہے کہ یہ سب یونیورسٹی کے ڈین کی شر پر ہو رہا ہے۔"

وہ واقعی پکا پولیس والا تھا۔ کچھ دیر میں ہی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔

"اس کے بعد کا دوسرا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ ذہن میں ضرور رکھنا کہ ان لوگوں نے اب تمہیں لندن سے ڈی پورٹ (علاقہ بدر)

کرنے کا پورا منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔ جو بھی قدم اٹھانا بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔"

"آپ مجھے یہ بتائیے کہ میری شکایت پر میرے خلاف پولیس کا رد عمل کیا ہو گا۔"

پار کرنے چونک کر میری طرف دیکھا۔۔۔۔۔

"میری توقع سے کہیں زیادہ ذہن ہو۔ عام حالات میں پولیس اُس کی تمہارے خلاف شکایت پر زیادہ سے زیادہ یہ عمل کرتی کہ تمہیں چند

منٹ کے لیے قریبی اسٹیشن بلوا کر تم سے کوئی زبانی یا تحریری ضمانت لے لیتی اور تم دونوں کو مستقبل میں مقنا دار بننے کی سمجھ کر کے جانے دیتی۔ کیونکہ

پولیس کے محکمے میں اور کسی یونیورسٹی کے قانون میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پولیس بغیر کسی خاص ثبوت کے صرف گواہوں کی شہادت پر کسی کو ملزم یا مجرم نہیں

مان سکتی، اور گواہ بھی وہ خود الزام لگانے والے کے وقار و ملازم ہوں۔ لیکن اس دن کی تقریب اور تمہاری دوست کی اس تقریر کے بعد اب حالات وہ نہیں

رہے۔ اب اس یہودی کا الزام ستر فیصد پہلے ہی درست مان لیا گیا ہے۔ لندن انتظامیہ بہت چوکنا ہو گئی ہے۔ رہی سہی کسر تشدد کے ان اکاڈک واقعات

نے پوری کر دی ہے۔ ایسے مواقع پر چاہے پولیس تمہارے خلاف کوئی ایکشن لے یا نہ لے۔ لیکن ساتھ وہ ہر حال میں تمہاری یونیورسٹی انتظامیہ کا ہی

دے گی۔ اس وقت تم یونورٹی اور پوئیس دونوں کے لیے ایک سا خطرہ ہو۔“

پار کرنے تفصیل سے مجھے تمام صورت حال کا جائزہ کر کے بتا دیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اپنے آئندہ کسی بھی اقدام کے سلسلے میں آگاہ رکھوں گا۔ پار کر میرا کندھا تھپتھا کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ، ربیکا، جم وغیرہ میں سے کسی کو میری آج یہاں سر آڑک کے سامنے پیشی کا پتہ نہیں تھا ورنہ وہ سب کے سب اس وقت یہاں جمع ہوتے۔ میں نے دانستہ طور پر خود بھی انہیں اس اچانک کال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں اس انکو نری کے نتیجے سے پہلے ہی سے بخوبی واقف تھا۔ بلاآخر سر آڑک نے اپنا مقصد کسی نہ کسی طور حاصل کر ہی لیا تھا۔ میرا ذہن حیرتی سے آگے آنے والے وقت اور حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ کامران کو میں نے فون کر کے یونورٹی کے فیصلے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ آج ہی دو چار اچھے وکیلوں سے اس سلسلے میں بات کر لے گا۔ آج سر آڑک اور ان کے درپردہ یہودیوں کے امرا طبقے نے میرے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا تھا مجھے میرے خیالات کی سزا دی جا رہی تھی۔ مجھے ان کی نئی نسل کو سوچ کے راستے پر ڈالنے کی سزا دی جا رہی تھی۔ یہ سزا دینے والے صرف سر آڑک ہی نہیں تھے، ان کا تو صرف ایک چہرہ تھا جو مجھے دکھائی دے رہا تھا یا ان کا منک خوار پنیر۔۔۔ جس کا کاندھا ان لوگوں نے استعمال کیا تھا۔ اصل میں تو اس سازش کے پیچھے لندن کا ہر جنگ نظر درنیکس یہودی شامل تھا موجود تھا۔ ایک معمولی سے لڑکے کی جرأت پر ان سب کا تو خون ہی کھول اٹھا ہو گا جس نے وقت کے اس بہت سے بڑے سرمایہ دار طبقے سے ٹکر لینے کی جرأت کی تھی۔ وہ مجھے اب عبرت کی مثال بنا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ایسی جرأت پھر دوبارہ اور کوئی نہ کر سکے۔ لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سارہ کی زبانی میرا پیغام لندن کے گلی کوچوں میں پھیل چکا تھا اور اب یہ بات چل نکلی تھی۔ مجھے اس لمحے سارہ پر بے حد پیار آیا۔ کیا دنیا میں سچ کا دامن تھا سننے والی ایسی ستوالی لڑکی کوئی اور ہو سکتی ہے۔۔۔؟

☆☆☆

## لحاف

عصمت چغتائی اردو زبان میں افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے۔ منٹو کی طرح عصمت کا قلم بھی معاشرے کے حساس موضوعات کی نشاندہی کرتا رہا اور اس پر بھی اکثر اوقات قہقش نگاری کا التزام لگتا رہا۔ لیکن اسکے باوجود عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول اردو دب کا لازمی جزو ہیں۔ **لحاف** عصمت کے ۶۶ بہترین منتخب افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں جوانی، لحاف، بکلی ڈکی، باندی، ایک شوہر کی خاطر، نئی ذہن، محل، عورت، خرید و، بھینسیاں اور ذائق افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے اہل سائے سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔





گاڑی کی شہر کی مضافاتی سڑک کے راستے پر ڈال دیا۔ یہ راستہ درمیان شہر کی گلیوں والے راستے سے بہت لمبا تھا لیکن اس وقت دفتروں سے چھٹی کی وجہ سے سڑکوں پر اس قدر انجم تھا کہ ہم اس شہر سے باہر والے راستے سے کہیں جلدی ٹریفنگر اسکوٹر تک پہنچ جاتے جہاں سے تیسری سڑک کے بہت بڑے اور سڑک سے بھی چوڑے فٹ پاتھ کے کونے پر کامران کاربنہ سٹورنٹ موجود تھا۔ اب ہماری گاڑی ٹیمر پور کے پل سے گزر رہی تھی۔ دور سورج کی آخری کرنیں پل کی بڑی بڑی برجیوں کی نوکیلی چوٹیوں کو چوم کر الوداع کہہ رہی تھیں۔ دریا میں پچھلے سونے کی لمبی لمبی سی تاریں تیر رہی تھیں۔ کار اس طویل پل کو پار کر کے اب پل کے ساتھ دوڑتی، پل کھاتی، کالی لمبی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سارہ نے کچھ دُور جا کر دریا کے کنارے گاڑی روک دی اور گاڑی سے نکل کر سڑک کی ڈھلان پر بنی لوہے کی اس لمبی سی پٹی کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی جو دریا کنارے سڑک کے ساتھ ساتھ دُور تک پل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ سورج اب ڈوب چکا تھا لیکن شفق کی لالی اب آسمان پر نارنجی رنگ بکھیر رہی تھی۔ یہ نارنجی رنگ جب دریا کنارے پڑی برف کی پٹی پر پڑتا تو مجھے اپنے محلے میں، نے والے گولے گندے والی کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی سفید برف کا گولہ بنا کر اس کے اوپر شیشے کی بوتلوں میں بھری ال، نیل، پہلی اور نارنجی رنگ کی شربت انڈیل کر گولہ ہمارے حوالے کر دیتا تھا اور پھر ہم سب بچے دیر تک مزے لے لے کر وہ برف کا گولہ پڑتے رہتے تھے۔

سارہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی خاموش دریا کے بہتے پانی کو دیکھتی رہی۔ اس نے اب بھی اپنی آنکھوں سے وہ گہرے رنگ کا کارا چشمہ نہیں اتار تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس چشمے کے نیچے اس کی گھنی پکلیں اب بھی بیکل ہوئی تھیں۔ پھر ہالا خراس نے خود ہی یہ خاموشی توڑی۔

”پاپا نے اچھا نہیں کیا۔۔۔۔۔ میں انہیں اتنا کڑو نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے میرا بھرم توڑ دیا ہے۔ وہ ایک کڑو شخص نکلے میڈی۔۔۔۔۔ میں ہالکل نوٹ گئی ہوں۔“

ہالا خراس کے صبر کا بند نوٹ گیا اور وہ ہلک ہلک کر رونے لگی۔ اس نے اپنے اندر بائیس سالوں سے جس باپ کا منہ سب سے اُدھنی جگہ پر سجا کر رکھا ہوا تھا۔ شاید آج وہ منہ پاش پاش ہو گیا تھا۔ میں نے سارہ کی آنکھوں سے اس کا چشمہ اتار دیا۔۔۔۔۔ اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں سے اس کے بہتے آنسو صاف کیے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیے۔

”تم دنیا کی سب سے مضبوط لڑکی ہو مس آنک۔۔۔۔۔ تمہارے یہ بہتے آنسو تمہیں کڑو نہیں بنا سکتے۔ ابھی تمہیں زندگی میں ایسے اور بہت سے تجربات سے گزرنا ہوگا۔ اور اس وقت شاید میں یا تمہارے دوستوں میں سے بھی بہت سے تم سے دُور ہوں گے۔ اس لیے خود کو ابھی سے سنبھالو سارہ۔۔۔۔۔ میں تمہیں یوں کڑو پڑتے نہیں دیکھ سکتا۔

سارہ اب بھی سسک رہی تھی۔

”نہیں حمد۔۔۔۔۔ میں اتنی طاقتور نہیں ہوں، مجھے اتنا بڑا مقام نہ دواپنی نظروں میں۔۔۔۔۔ اتنی ہماری ذمہ داری نہ ڈلو میرے کاندھوں پر۔۔۔۔۔ میں تو بہت کڑو لڑکی ہوں۔۔۔۔۔ نہیں جیسا پاؤں گی یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ نہیں جیسا پاؤں گی۔“

”تمہیں سنبھانا ہوگا۔۔۔۔۔ تم ہی سنبھاؤ گی۔۔۔۔۔ یہ میں جانتا ہوں۔“

میں نے زور سے سارہ کو کانڈھوں سے پکڑ کر چمخوڑا۔

”اور سر آڑک نے وہی کیا جو ایک جنگ میں کوئی دشمن دوسرے دشمن کے ساتھ کرتا ہے۔ ان سے کیسا لگے۔۔۔؟۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ یقین چاہو مجھے ان سے کوئی ذاتی شکایت نہیں ہے۔“

سارہ چلا کر بول پڑی۔

”لیکن کیوں؟۔۔۔۔۔ اسکی کیا جنگ ہے ان کی تم سے۔۔۔؟ کیا دشمنی ہے۔۔۔؟ کیا ہے تمہارے پاس یہ کہ سارا شہر تم سے خوف زدہ ہے۔۔۔۔۔ میں آج تک اپنے آپ کو اپنی نسل کو عظیم سمجھتی رہی لیکن تم نے ایک جھٹکے میں ہی ہماری عظمت کے تمام احسانات کو تار تار کر دیا۔۔۔۔۔ میں پاپ کو دنیا کا سب سے مضبوط آدمی سمجھتی تھی لیکن دو توب سے زیادہ کمزور نکلتے۔۔۔۔۔ تم نے تو ہمیں صرف سچ کو کھو بے کی دعوت دی تھی۔۔۔۔۔ وہ سچ کیا ہے جس سے میرا مضبوط باپ بھی کھراتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے تو یہ معاملہ صرف بالوکاسٹ تک کانہیں لگتا۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ حماد۔۔۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔۔۔ کس پر اعتبار کروں۔۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔۔۔۔۔ میرے اندر میرے اپنے بنائے ہوئے نیڈ نیڈ ایک ایک کر کے نوٹ رہے ہیں۔ میں اندر سے مر رہی ہوں۔۔۔۔۔ میرا اعتبار۔۔۔۔۔ میرا بھرم ٹوٹ رہا ہے۔۔۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔۔۔ کہاں جاؤں۔“

سارہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور اپنا درد کہتی رہی۔

”تم صرف اپنے دل پر اعتبار کرو۔۔۔۔۔ جو تمہارا دل کہے۔۔۔۔۔ وہی سچ ہے۔۔۔۔۔ کبھی کبھی فیصلہ دل پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔۔۔۔۔ اب چلو۔۔۔۔۔ وہاں ریسٹورنٹ میں سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم جانتی ہوتا رہا کہ دل پر کسی ٹھہریاں چل رہی ہوں گی اس وقت۔“

سارہ مسکرتی نہیں جانتا تھا کہ کس بات سے اس کا موڈ بہتر ہو سکتا ہے اور یہی میں چاہتا تھا۔ میں نے اس کا سیاہ چشمہ اس کے ہاتھوں میں بجا دیا۔ ہم دونوں ڈور اوپر سرنگ کے کنارے کھڑی ہماری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ میں سارہ سے دو قدم آگے تھا۔ اچانک سارہ نے رک کر مجھے آواز دی۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔“

میں نے پلٹ کر سارہ کو دیکھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ اس ٹھیک فیصلہ کرے گا۔ مجھے کوئی دھوکا تو نہیں دے گا۔“ اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تمہارا دل تمہیں کبھی دھوکا نہیں دے گا۔۔۔۔۔ اتنی اچھی لڑکی کا دل کبھی دھوکے باز نہیں ہو سکتا۔“

میرا جواب سن کر وہ بھی مسکرا دی۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور پھر سارہ نے نہ جانے کن شارت کٹ راستوں سے گاڑی نکالی کہ ہم آدھے گھنٹے میں کامران کے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ وہاں تو واقعی میلہ سا لگا ہوا تھا۔ میری تقریباً پوری کلاس ہی موجود تھی اور چند دیگر سمسٹرز کے لڑکے لڑکیاں بھی وہاں رفتہ رفتہ پہنچ رہے تھے۔ کامران ریسٹورنٹ کے اندر اور باہر کافی مصروف نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں کو پہنچنے دیکھ کر وہیں ڈور سے چلے۔

”سمسٹر حماد امجد رضا۔۔۔۔۔ پانچ سو سینتیس پاؤنڈ کا مل بن چکا ہے۔ براہ مہربانی کاؤنٹر پر تشریف لے آئیے۔“

ریکا نے فوراً اعلان کیا کہ وہ آج کا تمام بل خود دے گی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کامران کبھی اس سے بل کا ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ ہم سب

ریسٹورنٹ کے باہر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر ہی ٹک گئے۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور چند محویں اسٹریٹ، جس پر کامرن کار ریسٹورنٹ موجود تھا اب جنگ لگانے لگی تھی۔ کافی کی خوشبو آس پاس بکھرنے لگی تھی۔ جہاں دیدہ بوزھے گارسلگائے کبھی نہ سلجھنے والے مسئلوں پر بات کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر بنے ریسٹورنٹس میں لگی کرسیوں پر جمع ہو رہے تھے۔ چلتے۔ گاروں کی مہک سے سماں دھواں دھار ہونے لگا تھا۔

کبھی کبھی نہیں سوچتا ہوں کہ اگر دن کے چوتیس پہروں میں شام کا پہرہ نہ ہوتا تو ہماری زندگی کتنی بے رنگ ہوتی۔۔۔ ایک خوبصورت شام دوستوں کا ساتھ چمکتی خوشبوئیں۔۔۔ یہ سب کتنی بڑی نعمت ہیں۔۔۔ ہماری زندگی میں کیسی کیسی نعمتیں ہیں جن کا ہم شکر تو ذور کی بات ہے ٹھیک سے کبھی احساس بھی نہیں کر پاتے۔۔۔ آج مجھے احساس ہوا تھا کہ شاعروں نے دیوان کے دیوان صرف اس ایک شام پر کیوں لکھ مارے ہیں۔

میرے تمام گلاس فیلو بے حد پھرے ہوئے تھے۔ جم کل منج سے شہر کی مرکزی شاہراہوں پر مظاہرے کرنے کا شیڈول طے کر رہا تھا، ہر بیک ایک میز پر چڑھی تقریر کر رہی تھی کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے مجھے بے دخل کرنے کے بعد یونیورسٹی صرف اس لیے بند کر دی ہے تاکہ ان کے جھوٹ پر وہ پناہ دے۔ آس پاس کے فٹ پاتھ ریسٹورانوں کی میزوں پر بیٹھے بوزھے بھی اب ریکا کی تقریر دیکھنے سے سن رہے تھے اور عام سنوڈنٹس کے ساتھ گرجوٹی سے تاشیاں بجا رہے تھے۔ تمام طالب علموں نے غیر معینہ مدت کے لیے یونیورسٹی سے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سارہ اُن کو یہ سمجھانے میں لگی ہوئی تھی کہ انہیں جو بھی قدم اٹھانا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور قانون کے دائرے میں رہ کر اٹھانا ہو گا تاکہ یونیورسٹی انتظامیہ کسی بات کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ لیکن اس وقت ان سب کے جذبات اس قدر پھرے ہوئے تھے کہ وہ سارہ کی بات بے مشکل ہی سمجھ پا رہے تھے۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ منیں نے نیلی بی جھٹ پر بجائے تین لمبی سفید کاروں کو چند روڈیں لگی میں داخل ہوتے دیکھا۔ یقیناً یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں جن کی آواز اُسے سارن بند کیے گئے تھے۔ گاڑیاں ریسٹوران سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئیں۔ اگلی گاڑی میں سے پارکراہی پتلون کے کیلیس کھینچتا ہوا ہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی ذور سے ہی اُس نے گرجوٹی سے ہاتھ ہلایا۔ دیگر لڑکے لڑکیوں نے کڑی نگاہوں سے ان سب سادہ و ردی والے پولیس آفیسرز کو گھورا، اور لندن پولیس کے خلاف بھی نعرے بازی کی۔ منیں نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو روکا۔ پارکریوگم چپا تا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے اور سارہ سے ہاتھ ملایا، ہم تینوں ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ اسنوڈنٹس پھر سے اپنے اپنے مشغلاتے میں بٹھ گئے۔ پارکرنے غور سے تمام طلبہ اور ان کے جوش اور جذبے کو دیکھا۔

”ایک ہی دن میں یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔ اور مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں مرتبہ تم نے اپنے بے حد مضبوط ہونے کا مجھے احساس دیا ہے۔ جس طرح سے تمہارے صرف ہاتھ کھڑے کرنے پر یہ سارا اجماع پھپھو گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت پڑنے پر یہ تمہارے کہنے پر کسی دریا میں بھی بخوشی چلا ننگ لگا دیں گے۔“

اتنے میں ہر اہم سب کے لیے کافی کے کپ میز پر رکھ گیا۔ ساتھ ہی کچھ ٹیکسٹ بکٹ اور پیسٹریاں بھی تھیں۔ پارکرنے ایک پیسٹری اٹھا کر منہ میں رکھی۔ سارہ حیرت سے اس کی اور میری بے تکلفی کو دیکھ رہی تھی۔ منیں نے سارہ کا تعارف کر دیا۔

”یہ مسٹر پارکریں۔ لندن کی خفیہ پولیس کے سیکشن انچارج۔۔۔ اور یہ مس سارہ آئزک ہیں۔ میری اہم جماعت۔“

”میں ان سے واقف ہوں۔ بلکہ آج کی تاریخ میں لندن کی پولیس اور انتظامیہ میں شاید ہی کوئی بد قسمت ایب ہو جو مس آئزک سے واقف نہ ہو۔“

”آپ بے فکر رہیں مسٹر پارکر۔۔۔۔۔ میں اور سارہ اسی لیے یہاں آئے ہیں ان سب کو کسی بھی غلط قدم اٹھانے سے روک سکیں۔ لیکن آپ یہاں کیسے؟“

پارکر مسکرایا۔

”اب تو جہاں تم وہاں ہم۔۔۔۔۔ مجھے خصوصی طور پر تم پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تمہارے مداحوں کی تعداد دیکھ کر لگتا ہے کہ اوپر والوں کی پریشانی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔“

سارہ کے ہاتھ میں کافی کا کپ بہت دیر سے یونہی تھما ہوا تھا۔ کافی کی اٹھتی بھاپ کے عقب سے اس کی وہ دو گہری آنکھیں جانے کس سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ پارکر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں مس آئزک۔۔۔ شاید اپنے دوست کے لیے۔“

سارہ نے چمک کر پارکر کو دیکھا۔

”حمدا بے قصور ہے۔۔۔۔۔ اُسے ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔“

پارکر نے دوسری فیسٹری منہ میں ڈالی۔

”انقلابی کا سب سے بڑا گناہ، انقلاب کی ترقیب ہی ہوتا ہے۔ پچھلے زمانوں میں ایسے گناہ گاروں کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ حاکم کے نزدیک لوگوں کی سوچ بدلنے سے بڑا گناہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور حمدا بھی اسی جرم کا مجرم ہے۔“

”اگر حمدا کا ٹرم پیپر کسی انقلاب کی ترغیب تھا تو میں بھی تو اس میں برابری شریک ہوں۔ میں نے بھی وہی گناہ کیا ہے۔ پھر مجھے کیوں سزا نہیں دی جا رہی۔۔۔۔۔؟“

”سزا تو آپ کو بھی دی جا رہی ہے مس پارکر۔۔۔۔۔ آپ کے دوست کو آپ سے دُور کر کے۔۔۔۔۔ آپ کے چہرے پر یہ بے چینی، یہ اُداسی بد وجہ تو نہیں ہو سکتی نا۔“

جانے پارکر نے یہ بات دانستہ کی تھی یا نادانستہ طور پر اس کے منہ سے یہ کچ نکل گیا تھا۔ سارہ چہرہ ہنس پائی کیونکہ شاید وہ اپنی اندرونی حالت پارکر پر ظاہر نہیں کرتا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد پارکر نے میری جانب دیکھا۔

”تم بہت خوش قسمت ہو مسٹر حمدا۔۔۔۔۔ تمہیں سارہ جیسی دوست کا ساتھ ملا ہے۔۔۔۔۔ ملاوٹ اور بے ایمانی کی اس دُنیا میں ایسے سچے رشتے اور سچے جذبے کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ پیٹر نے باقاعدہ تحریری طور پر تمہارے خلاف درخواست جمع کروادی ہے۔ لیکن میں نے چیف کو یقین دلایا ہے کہ صبح تم سے ملاقات کے بعد میرے تم سے متعلق تمام خدشات دُور ہو گئے ہیں لہذا تمہیں باقاعدہ ہوا کر تم

سے جواب لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہماری اطلاع کے مطابق لندن کے مضافات میں اور قرب و جوار کی یہودی بستیوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ یہودی تمہاری یہاں موجودگی کو اپنی نئی نسل کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کے ایک خاص نمائندے آئزک کی بیٹی بھی تمہارے ساتھ وفاداری کا بھرم رکھنے والوں میں سب سے آگے کھڑی ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک بڑا چیلنج اور بڑی تنہیک کی بات ہے۔ فی الحال لندن انتظامیہ نے معاملات کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ یہودی طبقہ تشدد اور توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار کر کے اس معاملے کو بگاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ سارہ کے تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے شاید وہ براہ راست تو تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے آس پاس تمہاری نسل کے مزدور اور عام محنت کش طبقے کے نقصان کا بے حد خطرہ ہے۔ وہ ان غریب لوگوں پر اپنی بھڑاس اس رات کی طرح آسانی سے نکال سکتے ہیں۔“

مجھے پارک کی بات نے بے حد پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ میری وجہ سے کوئی دوسرا غریب مسلمان سزا کیوں بھگتے۔ پارک ٹھیک کہہ رہا تھا۔ انہوں نے سارہ کی تقریر اور ان شام بھی اخبارات نکلنے کے بعد رات کو اکا کا علاقوں میں وہاں کے رہائشی مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی اور چند جگہوں پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔ یہ آگ و دھیرے دھیرے مزید بھڑک بھی سکتی تھی۔ لندن انتظامیہ اور پولیس کی تشویش بے جا نہ تھی۔ میں نے پارک سے ہی سوال کیا۔

”آپ کے خیال میں ان کے اس خصے کا راستہ روکنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں اسی طرف آ رہا تھا۔ قانونی طور پر تمہاری پوزیشن بہت مضبوط ہے کیونکہ تم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کا بہانہ لے کر تم پر ہاتھ ڈالا جاسکے۔ بلکہ لندن پولیس کے لیے تم باہرہ کراتے خطرناک نہیں ہو جتنا اندر جا کر ہو جاؤ گے۔ کوئی بھی اچھا وکیل گرفتاری سے قبل بھی تمہاری حیثیت منظور کروا سکتا ہے۔ اس لیے ہم ان خطوط پر سوچ ہی نہیں رہے۔ لیکن میں اس وقت لندن انتظامیہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک رضا کارانہ اپیل لے کر آیا ہوں۔

”رضا کارانہ اپیل۔۔۔۔۔“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں انتظامیہ کی طرف سے تم سے یہ اپیل کرنے آیا ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ چنگاری فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں بھڑک اٹھے۔۔۔۔۔ تم کچھ عرصے کے لیے لندن چھوڑ دو۔ خود اپنی مرضی سے۔“

میرے سر میں دھماکا سا ہول۔

”لندن چھوڑ دوں۔۔۔۔۔ لیکن کیوں۔۔۔۔۔ اور اس سے فائدہ کیا ہوگا؟“

”بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ بھڑکے ہوئے یہودیوں کو فساد کا کوئی بہانہ نہیں مل پائے گا۔ وہ تم کو ہی اصل خطرہ سمجھتے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد ان کے اندر کا خوف اور دشمنی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔۔۔۔۔ دیے بھی یونیورسٹی نے تمہیں فی الحال واپس داغنے کی کوئی بھی سفارش رد کر دی ہے۔ تم اگرچہ ہو تو لندن سے باہرہ کر بھی یونیورسٹی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہو۔ یہاں رہو گے تو تمہارے ساتھی طلبہ دھیرے دھیرے بھڑک کر لندن کی سڑکوں پر آ جائیں گے، در اس کا نقصان دوسرے لوگوں کو ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا مقصد طلبہ کی طاقت کو منظم انداز میں استعمال کرنا نہیں



ہے کیونکہ اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کب کی یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ سے اسٹوڈنٹ بن چکا ہوتا۔ لیکن میرا یقین کرو۔۔۔ تمہاری زندگی میں موجودگی بہت سے بے گن ہوں اور معصوم انسانوں کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میری بات پر غور کرنا۔۔۔ مجھے تمہارے جواب کا انتظار رہے گا۔“

پارکر مجھے گہری سوچ میں چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ سارہ بہت دیر سے ڈورنٹھی ہم دونوں کو بات کرتا دیکھ رہی تھی۔ پارکر کے جاتے ہی وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور پوچھنے لگی کہ کیا معاملہ تھا۔ میں نے پارکر کی تمام بات ”الف“ سے لے کر ”ی“ تک اسے سنائی۔ سارہ نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔۔۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ جو بھی ہوگا ہم سب مل کر اس کا سامنا کریں گے۔ میں جانتا تھا اس وقت سارہ کو کچھ بھی سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔ اس لیے میں چپ رہا، وہاں ربیکا بار بار ایک میز پر چڑھی میرا نام پکار رہی تھی کہ میں آ کر اپنے ”زریں خیالات“ کا اظہار کروں، میں نے ان سب کے درمیان جا کر انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کیا کہ فی الحال ہمارے پاس قانون اور عدالت کا راستہ موجود ہے اور کھانا ہے لہذا اس وقت احتجاج کو موخر کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ جب میں نے ان سب سے کہا کہ میرے لیے یونیورسٹی کی ڈگری سے کہیں زیادہ اہم ان سب کی دوستی ہے۔ محبت ہے جو مجھے آج حاصل ہے تو سب ہی افرودہ ہو گئے۔ ربیکا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جم کو خصوصی طور پر علیحدگی میں

لے جا کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں قلم کر اس سے وعدہ لیا کہ وہ خود کو بھی اور اپنے ساتھ تمام دوسروں کو بھی قابو میں رکھے گا۔ جم کو سمجھانا واقعی ایک مشکل کام تھا لیکن جب میں نے اُسے پارکر کی بتائی ہوئی ساری باتیں کہیں اور اسے سمجھایا کہ ہمارے اس احتجاج اور میڈیا مہم کو ہماری مخالفت پارٹی معصوم لوگوں پر تشدد کرنے کے خلاف استعمال کرے گی تو اس کا غصہ کچھ خفہ اٹھوا۔ عجیب جذبہ پائی لوجوان تھا یہ جم بھی۔ اسے دیکھ کر اور اس سے مل کر مجھے ہمیشہ عہد کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی ایسی ہی تھا، سر پھر اساد دوستوں کی خاطر سب کچھ لٹا دینے والا۔ جاتے ہوئے جم نے بہت دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا، سب ہی افراد فرادہ مجھ سے رخصت ہوئے۔ ربیکا نے جاتے ہوئے سارہ کے کان میں مجھے دیکھ کر کیا کہا کہ سارہ ہنس پڑی۔ ربیکا بھی ہم سے رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے اچانک میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں قلم کر میرے ماتھے کو چوم لیا، اور نم پلکوں کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کسی انسان کی معراج اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان اُسے ٹوٹ کر چاہے۔ اپنے دن اور رات اس کے نام کر دے۔۔۔ آج مجھے ایک لمحے میں ہی خدائی کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔۔۔ جب ایک انسان کا پیار آپ کو اس احساس سے دوچار کر سکتا ہے تو ازل سے لے کر اب تک آنے والوں انسانوں کی زندگی کا احساس کیا ہوتا ہوگا۔ آج میں نے جانتا تھا کہ خدا کو زندگی اس قدر پسند کیوں ہے۔

واپسی پر میں نے تے ہوئے گاڑی میں سارہ سے پوچھا کہ ربیکا نے اُسے جاتے ہوئے کان میں کیا کہا تھا۔ سارہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”کہہ رہی تھی یہاں سے سیدھے گہری میڈی کو ڈراپ کرنا۔۔۔ کہیں گھومنے نہ نکل جانا۔“

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

”پھر تم نے کیا کہا۔“

”میں نے اُس سے کہا کہ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ ایسا موقع ہاتھ سے جانے دوں۔“ ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ سارہ نے ہائیل

پارک سے دائیں کوڑنے والی چوڑی سڑک پر گاڑی موڑ لی۔ دُور پکا ڈلی سرکس کے بڑے بڑے جموں کی روشنیوں جھلکتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سارہ کی طرف دیکھا۔

سارہ مسکرائی۔

”رات کے دس بجے ایک اچھی میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم سفر کو گھر چھوڑنے سے پہلے رات کے کھانے کا ضرور پوچھے۔ یہاں میری پسند کا ایک ریستوران ہے کیا تم میرے ساتھ وہاں ڈنر کرنا پسند کرو گے؟“

”ہاں۔۔۔ ضرور لیکن اس شرط پر کہ بل میں ادا کروں گا۔ دراصل آتے ہوئے میں کامران کا ہونہ اٹھا کر لے آیا تھا۔ اسی طرح واپس کر دوں گا تو اس کے دل کو بہت ٹھیس لگے گی۔“

سارہ ہنس دی اور گاڑی ایک لمبا سا موڑ کاٹ کر دھیمی روشنیوں والے اس ریسٹورنٹ کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ سارہ کی پسند بھی عام ہو نہیں سکتی تھی۔ مجھے ہال میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ نہایت نکست سے دُور زور لگی ہوئی مدھم روشنیوں سے جھمکاتی میزوں والے اس طویل و عریض ہال میں جس کے ایک جانب لکڑی کا بہت بڑا سافرش (ڈانس فلور) اور باہر بھی موجود تھا۔ عام لوگ نہیں آتے ہوں گے۔ سارہ کو وہاں کا علم شاید اچھی طرح جانتا تھا۔ سبھی انہوں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا ہر تپاک استقبال کیا اور سبھی مس آؤٹ کر کے کہتے کہتے تھک نہیں رہے تھے۔ سارہ نے ہال کی ایک جانب لگی خوبصورت سی میز بیٹھنے کے لیے پسند کی۔ ہال میں ہلکے نروں میں میرے لڑکپن کا پسندیدہ گانا ”چھپکے کر مس میں نے تمہیں اپنا دل دے بیٹھا تھا“ کی دھن بج رہی تھی۔ چند جوڑے فلور پر ایک دوسرے کی ہانپوں میں ہانپیں ڈالے دنیا وہ فیہا سے بے خبر اپنے محبوب کے شانوں پر سر رکھے جھوم رہے تھے۔ مغربی موسیقی اگر ہلکے نروں میں ہو تو کبھی کبھی مشرقی موسیقی سے بھی زیادہ کانوں کو بھی لگتی ہے۔ جانے کیوں مجھے چھپکے چنگھاڑتے گانے اور موسیقی کبھی بھی نہیں بھائی تھی۔ ہماری میز پر رکھی دو ٹھیں روشن کر دی گئی تھیں اور ان کی لو میں سارہ کا کندن رنگ مزید دیکھنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر بال بکھر بکھر سے جاتے جنھیں وہ پھر سے سنوارنے کی تک دو سے تھک سی گئی تھی۔ بے خیالی میں اس کی مجھ پر نظر پڑی تو اپنی اس معصوم سی حرکت پر خود ہی مسکرا دی۔ اس کی ستارہ آنکھیں بار بار نم ہونے کی کوشش کرتی تھیں لیکن وہ بڑی صفائی سے اُس فی کارا سے روک لیتی تھی۔ بہت دیر تک ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ہی خاموشی کو توڑا۔

”ایک اچھی میزبان کا فرض صرف کھانا کھانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اچھی باتیں کر کے اپنے ہم راہی کا دل بہلا نا بھی ہوتا ہے کس سارہ آؤٹ کر۔“

”تم ہی کچھ ہو نا۔۔۔ میں تم جیسی باتیں کہاں کر سکتی ہوں۔۔۔ مجھے تو صرف تمہیں سننا اچھا لگتا ہے۔ تمہارے ہونٹوں سے سُنی ہوئی ہر بات نئی لگتی ہے، خوبصورت لگتی ہے۔“

”یہ میری باتوں کا نہیں۔۔۔ تمہاری خوبصورت سماعت کا احساس ہے جو تمہیں میری عام سی باتیں بھی شاعری میں ڈھلی لگتی ہیں۔“

”تم کبھی کسی بات کا بھی کریڈٹ کیوں نہیں لینا چاہتے۔۔۔ اقرار کر لینا دل کو بہت سی نئی الجھنوں سے بچا دیتا ہے۔ کیا سمجھ سکتے ہو؟“

میڈی۔۔۔؟۔۔۔ مان لیتا ہی سکون کا باعث ہوتا ہے۔“

آج سارہ کے بچے میں کوئی نئی بات تھی۔۔۔۔۔ کچھ نیا بن تھا۔۔۔۔۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں اقرار سے بچ نہیں رہا۔۔۔۔۔ نہی کسی بات کا کریٹ لینے سے دامن بچا رہا ہوں۔ لیکن بچ بھی ہے کہ میرے اندر آج اگر تمہیں کوئی بھی خوبی نظر آئی ہے۔۔۔۔۔ میری ذات میری شخصیت۔۔۔۔۔ میری باتوں میں کوئی خوبصورتی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ میں نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ ایمان ہے۔۔۔۔۔ اس کے بغضے ہوئے پیار کا احساس ہے، پیار انسان کو پیارا بناتا دیتا ہے سارہ۔۔۔۔۔ اُس کے اندر سے تمام بُریاں نکال دیتا ہے۔۔۔۔۔ محبت انسان کے بچے کا زہر بھوس لیتی ہے۔۔۔۔۔ اس کی باتوں میں مسکری گھول دیتی ہے۔۔۔۔۔ آنکھوں سے شہد نکا دیتی ہے۔۔۔۔۔ محبت انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔۔۔۔۔ پری زاد بنادیتی ہے۔“

سارہ غور سے میری طرف دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ میری باتیں جیسے اپنی آنکھوں سے سُن رہی ہو۔۔۔۔۔ جذب کر رہی ہو۔۔۔۔۔ دوا لڑتی ہوئی آواز میں بولی۔

”شاید میں بھی انسان نہیں رہی حماد۔۔۔۔۔ شاید میں بھی پری زاد بنتی جا رہی ہوں۔“

میں نے چونک کر سارہ کو دیکھا، اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پلکوں کی شبنم گر کر سارے ماتھے پر اُڑس کی بارش کرنے والی تھی۔

”ہاں حماد۔۔۔۔۔ میں نے خود پر بے حد قابو پانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ بہت روکا خود کو۔۔۔۔۔ بہت لڑی ہوں خود سے۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی خود کو روک نہیں پائی۔۔۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے حماد۔۔۔۔۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کا یہ بیٹھا زہر چکھ لیا ہے حماد۔۔۔۔۔ پورا یہ لہ حلق سے نیچے اندر لیا ہے حماد۔۔۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔۔۔ بہت بے بس ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔ بہت لاچار ہو گئی ہوں نہیں۔۔۔۔۔“

اس لمحے میرے سارے لفظ ہی جیسے کہیں گم ہو گئے تھے۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کچھ بول ہی نہیں پایا۔ سارہ کی آنکھوں سے دو موتی گرے اور میز پر رکھی گلاب کی اک چمکری پر پڑ گئے۔ وہ بیڑی است کر کے پھر بولی۔ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

”نہیں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے دل کے اندر صرف اک خوش نصیب کا ہی بسیرا ہے۔ وہ جو تمہاری روح کی گہرائیوں تک تمہارے اندر بسی ہوئی ہے۔ تم نے کبھی کسی سے یہ راز نہیں چھپایا کہ ایمان کی محبت تمہارے خون کے ذروں میں شامل ہے۔ کتنی سچی ہے تمہاری محبت۔۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میرا دل کیوں نہیں مانتا حماد۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ کیوں میں اس دل کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہو گئی ہوں کہ خود میرا مجھ پر، میرے دن رات پر، میری روح پر اختیار نہیں رہا۔۔۔۔۔ میرے لفظ میرے نہیں رہے۔ میری ساری شخصیت میری نہیں رہی۔ اُس محبت نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے حماد۔۔۔۔۔ اس سے کہو مجھے میرا آپ واپس لوٹا دے۔۔۔۔۔ میری سانسیں مجھے واپس سونپ دے۔“

میں سارہ کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ لفظ اس کے ہونٹوں سے اپنے آپ ہی پھیلنے جا رہے تھے۔ یہ سارہ نہیں۔۔۔۔۔ سارہ کے اندر کی لڑکی یوں رہی تھی۔ سارہ تو بہت خاموش بہت کم گو لڑکی تھی۔ یہ تو پھر اُسی محبت کا ایک اور تازہ یاد تھا جو اب اس معصوم لڑکی کی روح کو کچھ کے نگار ہاتھ۔ مجھے

سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ محبت کے اس صحرا کی پیاس کب بجھے گی اور کتنے بے بسوں کی، لاچاروں کی روح کو اپنی ریت میں جذب کرے گا یہ صحر؟ ازل سے انسانوں کے دلوں کے ساتھ یہ کھیل کھیل رہی ہے محبت۔ جانے کتنے جوان دل اس کی پیاس کی بجھٹ چڑھ چکے ہوں گے اب تک۔۔۔؟۔۔۔ لیکن اس کی حرم بھر بھی نہیں مٹی۔ اب بھی ہر گھڑی کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں کسی کی محبت میں جھلا ہو رہا ہوتا ہے۔ کل کی طرح تڑپ رہا ہوتا ہے اور محبت دور گھڑی ان روح نکلنے دلوں کی یہ تڑپ اور یہ بے بسی دیکھتی رہی ہے۔

میں سارہ سے کچھ نہ کہہ پایا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ بس میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں قمام لیے۔ وہ میز کی دوسری جانب یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ جتنی شمعوں کی روشنی میں اس کی بھگی آنکھیں جھلکاتی رہیں۔ ہال میں بیٹھے سب زندوں نے اسٹیوڈنڈ رکائوڈ چھیڑ دیا۔۔۔۔۔ کیا تم میری ہی راہ دیکھ رہے ہو۔

میں حمہ ری آنکھوں میں دیکھ سکتا ہوں

میں حمہ ری مسکراہٹ میں کھوج سکتا ہوں

کہ تم تنہا ہو۔۔۔۔۔

اور کہیں کوئی تمہاری محبت میں جھلا ہو رہا ہے۔

اس نفی کی دھن پر رقص کرتے جڑوں کے قدم دھیرے دھیرے متحرک رہے تھے۔ پورے ہال کی مدھم روشنی میں دس کو چھو جانے والی محبت کا راج تھا۔ خوشبو تھی، رنگ تھے اور نور تھا۔ سارو پٹ چپ بیٹھی میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسی ایک ہل کو جی رہی تھی۔ سیٹ رہی تھی۔ اپنی عمر کی نقدی میں جمع کر رہی تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے عمر کی نقدی میں ایسا ایک ہل بھی بہت ہوتا ہے۔ تمام عمر خرچ کرتے رہو، عمر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس ہل کی پوچی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں نے دھیرے سے سارہ سے پوچھا۔

”مجھے بتاؤ۔۔۔ تمہارے اس درد کو ختم کرنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری زندگی، میری ساری عمر یہ تمہارا حق ہے۔ تم جو چاہو گی وہ یہی ہوگا۔“

سارہ دھم سے مسکرائی۔

”کاش محبت کا ہونا نہ ہونا بھی ہمارے بس میں ہوتا۔ کاش میرے پاس وقت کو پلٹنے کی طاقت ہوتی تو میں تمہیں تمہاری جہلی محبت سے پہلے پلٹنے کی کوشش کرتی۔ کاش جو عظمت تمہارے دل میں مجھ سے پہلے ایمان کی ہے۔ اس کی سب سے پہلی حق د میں ہوتی۔ کاش میری محبت میں یہ ”کاش“ نام کا کوئی لفظ ہی نہ ہوتا۔ لیکن اس محبت کا الیہ ہی یہی ہے کہ اس کی ابتدا ہی کاش سے ہوتی ہے۔ تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ تم نے اپنی پوری زندگی پر مجھے اتھیرا دے دیا ہے۔ اس سے زیادہ بڑی نعمت، اس سے زیادہ بڑی مہربانی اور انعام کیا ہوگا۔ میری اس ایک زندگی کے لیے تو تمہارا یہ اقرار ہی کافی ہے۔ بس ایک وعدہ کرو مجھ سے، میں جانتی ہوں ایمان کی یاد تمہارے دل سے تاجا جنکس مٹ پائے گی۔ لیکن جب کبھی تم کسی اور کو اپنی اس ابدی محبت کا حصہ دار بنانا چاہو گے، تو میرا حق سب سے پہلے ہوگا۔ وعدہ کرو مجھ سے۔۔۔۔۔ مجھے میرے ہونے کا بھرم دے دو،

میرے وجود کی تصدیق کر دو۔“

میں نے سارہ کی نازک انگلیاں اپنی پتیلی میں تمام لیں۔

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

سارہ نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں اپنی بند آنکھوں کے پچھون پر بہت دیر تک جوڑے رکھا، جیسے کسی مسیحا کی تاثیر کو اپنی بند آنکھوں سے اپنے پورے جسم میں اپنی روح میں دھیرے دھیرے پکارتی ہو، میرا ب کر رہی ہو۔

سازندوں نے جارج مائیکل کانفمہ چھیڑا۔

”لا پرواہ سرگوشیاں

میری سب سے اچھی دوست ہیں۔“

سارہ نے جیسے پتی آخری خواہش ظاہر کی۔

”میرے ساتھ ایک بار رقص کرو گے۔۔۔۔۔؟“

سارہ کے معصوم انداز پر میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم دونوں اٹھ کر لکڑی کے گول فرش کی جانب بڑھ گئے۔ سارہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر کھڑے نغمے کی دھن پر اپنے قدم فرش پر رکھتے رہے۔ سازندوں کے سربراہ نے جو ایک لمبا ٹیکر تھا، اپنا ہیٹ اتار کر مجھے سلام پیش کیا۔ اور مجھے اشارہ کیا کہ اب جو نغمہ وہ اور اس کا گروپ مل کر بجائیں گے وہ صرف میرے اور سارہ کے لیے ہوگا۔ پھر لمبے ٹیکر نے اپنے ساتھیوں کو کچھ اشارہ کیا اور نغمے کی دھن بدل گئی۔

(ایک اسٹریٹ بوائز) ایک مشہور بینڈ کانفمہ گونجا۔

”یہ صرف لفظ ہی تو ہیں

جو میرے پاس ہیں، صرف لفظ۔۔۔۔۔

جن سے میں تمہارا دل

چرائے جا رہا ہوں۔“

ہم دونوں کو یہ ہی نہیں چاہا کہ کب ڈانس فلور پر گھومتی ہوئی گول روشنی صرف مجھ پر اور سارہ پر آ کر ڈک گئی تھی اور آس پاس کے سبھی رقص کرتے جوڑے لکڑی کے گول فرش کے دائرے میں کناروں پر کھڑے جانے کب سے صرف مجھے اور سارہ کو ہی دیکھ رہے تھے، سارہ کے رقص کا انداز بھی اسی کی طرح باوقار تھا۔ اس کے قدم جگت میں نہیں اٹھتے تھے جیسے بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھنے کی جگہ کا انتخاب کر رہی ہو۔ نغمے کی دھن ختم ہونے کے بعد جب آس پاس سے تالیوں کا شور اٹھا تو ہم نے دیکھا کہ پورا ہال ہماری طرف ہی متوجہ ہے اور صرف ہم ہی روشنی کے گول دائرے میں کھڑے ہیں۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ہنس دی۔ اس کی ہنسی سے لگا جیسے تیز بارش کے دوران کالی گھٹا یک دم

چھٹ گئی ہو اور آسمان پر بادلوں کے درمیان سے اچانک سورج نکل آیا ہو۔ سب لوگ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ سارہ کے چہرے پر چھایا غبار بھی شفق کی پٹنمی سرخی میں بدل چکا تھا۔ یہ محبت بھی پل پل میں کیسے کرشمے دکھاتی ہے، کیسے کیسے روپ بدلتی ہے۔

گھر واپسی پر ہم دونوں خاموش تھے۔ آج سارہ کو میری طرف سے اسی مجرم کی ضرورت تھی جو اس رات چرچ سے واپسی پر مجھے سارہ کی جانب سے درکار تھا۔

محبت اپنے ظہار کے پل جس قدر بے باک ہوتی ہے۔ وہ پل گزر جانے کے بعد اس سے کئی گن زیادہ شرمیلی ہو جاتی ہے۔ سارہ کا بھی اس وقت وہی حال تھا۔ ہماری گاڑی لندن کی سنسان سڑکوں سے ہوتی ہوئی کامران کے فلیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔

سارہ کے گلے کا سکارف بار بار ہرا رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں نے دانستہ اُسے غل نہیں کیا۔ کبھی کبھی ہمیں کسی کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ گاڑی کامران کے اپارٹمنٹ کے نیچے آ کر رک گئی۔ سارہ نے میری جانب دیکھے بغیر کہا۔

”آج کی رات میری زندگی کی سب سے حسین رات تھی حماد۔۔۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔“ میں نے گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ ہونٹ سے لگتے ہوئے ہاں کے درد زے پر کھڑے دربان نے ہمیں گلاب کی ایک ایک کلی چٹائی کی تھی جو ہونٹ کے خوبصورت مونوگرام والے کپڑے کے چھوٹے سے رومال میں لپی ہوئی تھیں۔ گاڑی سے اترتے ہوئے میری کلی وہیں اندر ڈیش بورڈ پر پڑی رہ گئی تھی۔ سارہ نے گاڑی میں لگا قلم نکال کر اس رومال پر دن، تاریخ اور وقت لکھ کر اُسے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

”میں اُسے نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ رہی ہوں۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔“

”گھر پہنچ کر مجھے ایک فون ضرور کر دینا رات کافی بیت چکی ہے اور شہر میں تمہارے مداحوں کی تعداد بھی کافی ہے۔“

سارہ نے سر ہلایا۔ میں گاڑی سے دو قدم پیچھے ہٹا تاکہ وہ گاڑی آگے بڑھا سکے۔ سارہ نے اپنے گلے سے لپٹا سکارف کھولا اور گاڑی سے نیچے اتر کر اُسے میرے گلے میں باندھ دیا۔

”یہ تمہارے ساتھ رہے گا تو ہمیشہ میری یاد دلائے گا۔“

سارہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ میں اُسے گلے کے موڑ سے مڑتے وقت تک دیکھتا رہا۔ ٹھنڈی بخ بخ ہو اؤں نے

میرے وجود کو جنمنا دیا اور میرے گلے میں بندھا سارہ کا سکارف لہرا رہا۔ یہ صرف ایک سکارف ہی نہیں تھا۔ یہ سارہ کے وجود کی خوشبو تھی۔ جو

میرے گلے سے سکارف کی صورت میں لپٹی ہوئی تھی اور تمام ماحول پر دھیرے دھیرے چھا رہی تھی۔ ذور کسی گھنٹہ گھر نے رات کے منے میں دو

بجے کا اعلان کیا۔ میں شکستہ قدموں سے اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆



## الوداع

اگلے دو دن بہت ہی ہنگامہ خیز گزرے۔ جم کے بے حد کنٹرول کرنے کے باوجود چند اسٹوڈنٹس نے اچانک یونیورسٹی بند کرنے پر خوب ہنگامہ آرائی کی۔ ایک جیس تو ہا قاعدہ سرائزک اور جیوری کے خلاف نکالا گیا۔ اخبارات نے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور یہودیوں کے زیر اثر اخبارات نے تو سیاہ پروپیگنڈہ کی حد ہی کر دی۔ ان اخبارات نے میرے نرم ہچک کو یہودیوں کی مقدس تاریخ پر ایک حملہ قرار دیا۔ اور ان اخبارات کی ہرزہ سرائیوں کی وجہ سے تشدد کے واقعات میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا۔

پارکراس دوران مسلسل مجھ سے رابطے میں رہا اور لگا تار اپنی رضا کارانہ پیش کش کے بارے میں میرا جواب جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دن بھی نہیں اور کامران شام کو اکٹھے ہی تھے جب اس کا پارٹنر منٹ کے نمبر پر فون آیا تھا۔

"ٹھیک ہے مسٹر پارکر۔۔۔ میں لندن چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرے چلے جانے سے تشدد کی یہ لہر واقعی ختم جائے گی۔"

"مجھے پورا یقین ہے، ان کی اصل دشمنی تم سے ہے۔ یہ مزدور طبقہ بے چارہ ان کا کیا بگاڑ پائے گا۔ اور پھر میڈیا میں ان کا تاثر بھی ان واقعات کی وجہ سے نرمی طرح خراب ہو رہا ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد ان کے پاس کوئی وجہ نہیں رہ جائے گی لڑنے کی۔"

"ٹھیک ہے سر۔۔۔ میں تین دن بعد کی پہلی فلائٹ سے لندن چھوڑ دوں گا۔ آپ چاہیں تو اخبارات اور میڈیا کے ذریعے اس خبر کو بھی سے شہر میں پھیلادیں۔ میں اب ان کے ہاتھوں حزیہ کسی بے گناہ کا نقصان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

دوسری جانب سے کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر پارکر کے گہرے سے سانس لینے کی آواز ابھری۔

"میں جانتا تھا تم آخر کار یہی فیصلہ کرو گے۔ میں نے صرف اپنے اسی یقین پر ابھی تک لندن پولیس کو تمہارے خلاف کسی خطہ الزام پر کوئی جھوٹی کارروائی کرنے سے روک رکھا تھا۔ حالانکہ مجھے اس کے لیے بہت سے ایسے لوگوں کی بھی سننا پڑی جن سے عام حالات میں میں نہیں بات کرتا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم واقعی ایک بہادر شخص ہو۔ یہ لوگ تمہیں تو یہاں نکلنے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن جو نظریہ تم بیچ کی صورت میں ان کی فتنے کے دماغ میں بونگے ہو۔ وہ اس نظریے کو کبھی اپنی آنے والی نسلوں کے دماغ سے نہیں نکال پائیں گے۔۔۔ ہمیشہ خوش رہو۔"

پارکر نے فون رکھ دیا۔ کامران نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔

"تو کیا واقعی تم نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابھی سارے راستے بند نہیں ہوئے میڈی۔ میں نے شہر کے بہترین وکیوں سے بات کی ہے۔ ہم آخری وقت تک ان سے لڑیں گے۔"

”میں نے قانونی لڑائی سے ہاتھ کب روکے ہیں یا۔۔۔ دو جنگ تو تم یہاں میری غیر موجودگی میں بھی ضرور لڑو گے۔ لیکن فی الحال میرا منظر سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔ میری وجہ سے بہت سے مصحوم لوگ مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ان کا میرا ہم مذہب ہونا ہی سب سے بڑا جرم بن گیا ہے۔“

کامران کا غصہ اپنی جگہ بج تھا اور پھر شام تک ٹی۔وی اور اخبارات کے ذریعے میرے سبھی دوستوں کو بھی میرے اس فیصلے کی خبر ہو گئی۔ سب سے پہلے سارہ اور ربیکا پہنچیں۔ ربیکا نے تو آتے ہی آسان سر پر اٹھالیا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ تم نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ ہم تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔ اس روز ایئر پورٹ جانے والے تمام راستوں کا گھیراؤ کریں گے۔ سڑکوں پر لٹ جائیں گے۔“

”تم کوئی اچھی سی صاف سڑک دیکھ کر لیٹنا۔۔۔ ورنہ صبح جو تم تین چار گھنٹے اپنے میک اپ پر لگاتی ہو وہ سب ضائع ہو جائیں گے۔“

ربیکا غصے میں بھی ہنس پڑی۔ لیکن پھر دوبارہ چلا کر بولی۔

”یہ مذاق کی بات نہیں ہے مسز میڈی۔۔۔ تم پر ہمارا بھی کچھ حق ہے اور میں اسی حق کا سہارا لے کر کہتی ہوں کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“

سارہ وینچاپ کھڑی تھی کیونکہ اُسے میرے فیصلے کی وجہ معلوم تھی۔ اس دن پارک سے ہوئی قرم گفتگو اور پھر شہر کے واقعات پر شروع ہی اُس کی نظر تھی۔ لیکن اس کے انداز سے بھی صاف ظاہر تھا کہ اُسے میرے فیصلے سے سب جانتے ہوئے بھی بے حد دھچکا لگا ہے۔

ہم سب اس وقت کامران کے ریسٹوران کے باہر والے فٹ پاتھ پر لگی میزوں پر بیٹھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں جم، ڈیوڈ اور لینا وغیرہ بھی آ گئے۔ میں نے ان سب کے جذبات کو بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ انہیں اپنے دندان چھوڑنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی کہا کہ میں ہمیشہ کے لیے واپس نہیں جا رہا۔ ان سب سے رشتہ میرے خون میں شامل ہو چکا ہے اور اب چاہے میں دنیا کے کسی کونے میں بھی رہوں۔ میرا دل ان سب کے ساتھ ہی دھڑکے گا۔

ربیکا کے آنسو بار بار چٹک جاتے تھے۔ میں نے ماحول کو کچھ بدلنے کے لیے ربیکا پر چوٹ کی کہ کچھ لوگ دوستوں کو صرف ٹیکسین آنسوؤں کے گلاس پر ہی فرما کر رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے اعزاز میں کوئی الوداعی تقریب ہی منعقد کر دیں۔ ربیکا ہیکلی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی اور اُس نے ہم سب کو اپنی پوری گلاس کو اگلے دن اپنے گھر کھانے پر مدعو کر دیا۔ ان کا دل رکھنے کے لیے میں نے دیں سے ان کے سامنے ہی فون پر اپنے دھک کو چند ہدایات دیں کہ میرا کیس کس طرح سے عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔ سارہ اس تمام دوران ہلکلگم مسمی اور خاموش بیٹھی رہی۔ جانے اس کے ذہن میں کیا کشمکش ہی چل رہی تھی۔

رات گئے وہ سب مجھ سے رخصت ہو گئے، سارہ بھی اپنی سفید جیل کی جانب بڑھ گئی۔ میں آج کامران کے ساتھ آیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ وہی کار اور وہی تھا۔ سارہ کے قدموں کی چٹکیا ہٹ واضح تھی۔ کامران جو میرے ساتھ ہی میز پر بیٹھا تھا اُس نے خود ہی سارہ کی مشکل آسان کر دی اور سارہ سے چلا کر کہنے لگا۔

”مس آنزک۔۔۔ اگر آپ میرے حال پر رحم کریں اور میرے اس جذباتی دوست کو گھر چھوڑتی جائیں تو میں اپنا کچھ کام دھندہ کر

لوں۔ اس کے باپ کے پاس تو اسے ورثے میں دینے کے لیے کافی دولت ہے جب کہ میرا باپ میرے لیے صرف دھانیں چھوڑ گیا ہے۔“ سارہ کامران کی بات سن کر مسکرا دی۔

”میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔“

کامران نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”جاؤ بیٹے حاد۔۔۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔۔۔ کیسے جان دھڑکھم کے دوست سے پالا پڑا تھا۔ حالانکہ میں جانتا ہوں وہ گاڑی کے قریب کھڑا میرا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن میں نے تمہیں یہ چانس بخش دیا ہے۔ جاؤ پیش کرو۔“ میں نے بھی اٹھتے ہوئے کامران کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

”بلی کے خواب میں مجھ پڑے۔۔۔“

کامران کا منہ بن گیا میں، کر سارہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ میری اور کامران کی ٹوک جھوٹک دور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”تمہارا دوست کیا کہہ رہا تھا میڈی۔“

میں نے سارہ کو کامران کی بات بتائی۔ وہ سن کر مسکرا دی۔

”تمہارا دوست واقعی دوستی کے قابل ہے۔ میں واقعی اکیلے آتے ہوئے ہچکچا رہی تھی لیکن جانے کیوں تمہیں ساتھ چلنے کا بھی نہیں کہہ پا رہی تھی۔ کامران نے میری مشکل حل کر دی۔۔۔ تم نے اتنے بہت سے اچھے لوگ اپنے آس پاس کیسے جمع کر رکھے ہیں؟ ہمیں تو ڈھونڈنے سے بھی ایک نہیں ملتا۔“

میں سارہ کا اشارہ سمجھ کر مسکرایا۔

”جس کے گرد یہ سب لوگ جمع ہیں۔ وہ تو خود تمہارے ساتھ ہے۔ پھر یہ گلہ کیسا؟“ سارہ بھی میرا جواب سن کر مسکرا دی۔ لیکن پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر اُداسی کے وہ بلبے اُنے باؤں چھا گئے۔

”تو تم جا رہے ہو ہاں۔۔۔ ہم سب کو تنہا چھوڑ کر۔“

”نہیں، ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی تو ہوں۔ ہر لمحہ تمہاری دسترس میں۔“

سارہ روپ رہی۔ جیسے کوئی گہری سوچ اس کے اندر جنگ چھیڑے ہوئے ہو پھر اُس نے غصے سے ہونٹے میچے میں کہا۔

”نہیں، بہت دنوں سے وہ وہجڑو صوفی نے کوشش کر رہی ہوں جس نے اتنے بہت سے لوگوں کو تم سے خوفزدہ کر رکھا ہے۔ لیکن ہر بار میری سوچ خالی دیواروں سے ٹکرا کر پٹ آئی ہے۔ میں نے تو ریت اور انجیل میں بھی کافی سرکھپایا لیکن تمہارے پیغام تک نہیں پہنچ پائی۔ وہ کیا بات ہے جو تمہیں ہم سب میں ممتاز کرتی ہے۔ خصوصی بناتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو تمہارے اندر فخر اور غرور کا اس قدر مضبوط احساس جگاتی ہے کہ میرے پاپا جیسے

مضبوط اور بڑے قد والے انسان بھی تمہارے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ ایسے سازشی بونے جو ایک دراز قد شہزادے کو سنکڑوں کی تعداد میں مل کر گرانے کی دیراس کی منگلیں کسنے کی فکر میں ہوں۔ لیکن ہر بار منہ کی کھار ہے ہوں۔ یولو۔۔۔ تم میں ایسا کیا ہے میڈی؟“

”جج کہوں تو مجھ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے فکر کرنے کے لیے۔ ہاں اگر میرا مذہب ہی ان کی پریشانی کی وجہ ہے تو یہ مذہب تو میرے سب نام مذہبوں کا غرور ہے۔ میں نے تو آج تک اس مذہب کا ایک حق بھی ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا۔ جج پوچھو تو میں اپنے مذہب کے نام پر خود ایک دھبہ ہوں۔ میرا کوئی بھی تو عمل اس سے مطابقت نہیں رکھتا، اور ایک بات اور جو تم خود جانتی ہو کہ میں تو ایمان کی وجہ سے ہمیشہ اس مذہب کو اپنا مخالف۔۔۔ اپنا دشمن سمجھتا رہا ہوں۔۔۔ میں یہاں آنے تک یہی سمجھتا رہا کہ اس مذہب نے ہی مولوی عظیم کی صورت میں میری یرن کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ یہ مذہب مجھے دوسروں میں اتنا ممتاز کر دے گا۔ میرا قد اتنا بڑا حادے گا۔ دشمنوں اور میرے مخالفوں کو مجھ سے اتنا خوف زدہ کر دے گا۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو کبھی اس مذہب کو اپنے لیے باعث افتخار نہیں سمجھا۔ ان سب لوگوں کی مخالفت نے اسے میرے لیے باعث افتخار بنا دیا۔“

”جج کہوں تو یہاں آنے سے پہلے میں ”ہالوکاسٹ“ کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ نہ ہی میرے دل میں کسی کسی فلسطینی مسلمان کے لیے کوئی درد ہی جا گا تھا۔ اور شاید اگر میرے راستے میں یہاں اس قدر کانٹوں کے جال نہ بچائے جاتے تو میں کبھی اس فرم پیپر کی تحقیق میں نہ پڑتا۔ میں بھی عام لو جو ان لوں کی طرح اسے ایک واقعہ سمجھتا رہتا جس کے جج یا جھوٹ کو جاننے کی زحمت بھی کبھی گوارا نہ کرتا، مجھے اس راہ پر ڈالنے والے بھی اصل میں سراسر آنکڑی ہیں۔ اگر میرے اندر کوئی جذبہ قابل فخر، قابل غرور ہے تو اسے جگانے میں سب سے بڑا ہاتھ بھی انہی کا ہے۔ لیکن وہ مزید کس جج سے خوف زدہ ہیں یہ تو میں بھی نہیں جان پایا ابھی تک۔“

”اسی جج اسی پینا م کی تو میں بھی متلاشی ہوں۔ کیا تم اس کھوج میں میری مدد نہیں کرو گے حاد۔۔۔۔“

میں غور سے سارہ کی بات سن رہا تھا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے۔۔۔؟ ایسا کون سا پیغام ہو سکتا ہے۔ اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی الوداعی کرنیں اونچی اونچی عورتوں کی چونچوں اور گنبدوں پر سنہری قلعی پھیر کر واپس پلٹنے کی فکر میں تھی۔ اچانک ایک اونچے گنبد کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ہم اس سنٹرل لندن کے علاقے سے گزر رہے تھے جہاں ایشیائی باشندوں کی بہت بڑی تعداد رہائش پذیر تھی۔ میں نے سارہ کو گاڑی سڑک کے کنارے پر لگانے کا کہا۔ ہم دونوں گاڑی سے اتر آئے، سامنے ہی وہ عمارت موجود تھی جس کے گنبد پر چمکتی سنہری دھوپ نے میرے دماغ کی کھڑکی بھی روشن کر دی تھی۔ یہ سنٹرل لندن کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”شاید میں تمہیں اس پیغام کا کچھ حصہ ابھی اسی وقت پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں اس عمارت میں جانا ہوگا اور اس عمارت میں داخلے کے کچھ آداب ہیں۔ اگر تم میرے ساتھ ان آداب کو دھرا سکو تو۔۔۔۔؟“

سارہ ونچ چلا میرے پیچھے چل پڑی۔ مسجد کے محن میں ہی بہت سے گرم خنڈے پانی کے ٹل لگے ہوئے تھے۔ سارہ نے میری طرف دیکھ کر پانی اپنے ہاتھوں پر چہرے پر اور کہنچوں پر بہایا۔ اور وضو کر کے مسجد کے محن میں ہی ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میں اندر سے قرآن اُٹھا لیا۔ شاید ہمارے موبوی صاحب نے جب حیرہ برس کی عمر میں مجھے ختم قرآن کی مبارک ہادی تھی۔ اس کے بعد آج میں نے اس کتاب کو تھا،

تھا۔ ہاں ابھی جب مولوی عظیم، سنی کو درس دینے کے لیے ہمارے گھر آتے تھے تو میں اپنے مطلب کے لیے ان کے آس پاس بیٹھ رہتا تھا اور یوں میرے کانوں میں ان کے مخصوص بچے اور تلفظ کو بخیر رہتا تھا۔

میں نے سورۃ رحمن کھولی اور سارہ کو پڑھ پڑھ کر اس کا ترجمہ سنانے لگا۔

”تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۔۔۔۔“

میں پڑھتا گیا اور سارہ غور سے سنتی گئی۔ پھر جب میری نظریں انھیں تو میں یہ دیکھ کر دوگ رہ گیا کہ وہیں پر لگا رنگ آنسوؤں کی صورت میں زار و قطار بہہ رہا تھا۔ میں خود بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک لمحے میں ہی جانے کتنے چہرے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ مولوی عظیم، ریلوے اسٹیشن پر مٹنے والے صوفی رحمت اللہ، عبداللہ اور جانے کون کون۔ جو اس دنیا میں اپنی آمد کا حق ادا کر رہے تھے۔ اور میں۔۔۔۔۔ میں تو اپنے جینے کا ٹھیک سے شکر بھی ادا نہیں کر پایا تھا کبھی۔ ہماری اس دنیا میں آمد کا مقصد کیا تھا۔۔۔ اور ہم اپنی زندگی کن مشاغل میں بسر کرتے رہتے ہیں۔ روز اک یاد وہ اپنے پہلے ہی سے بے حاشا داغ وارد امن پر بجالیاتے ہیں۔ پھر بھی کتنے بے خبر کتنے خوش رہتے ہیں۔ وہی پر سارا راستہ اس کی آنکھیں بھیگی رہیں ور میں بھی خاموش رہا۔۔۔۔۔ رات کو جب سارہ نے مجھے کامران کے فلیٹ پر ڈراپ کیا تو وہ بے اعتہارہ رونے کے بعد اب بڑ سکون تھی میں نہیں جانتا تھا کبھی کبھی الوداع کہنا کس قدر مشکل ثابت ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس رات سارہ سے چھڑتے ہوئے ہوا۔ سارہ چلی گئی لیکن میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اک عجیب سی بے چینی میرے رگ و پے میں تانے لگی تھی۔

☆☆☆

## عشق کا قاف

**عشق کا قاف** سرفراز راہی کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ عشق ازل سے انسان کی فطرت میں ودیعت

کیا گیا یہ جذبہ جب جب اپنے رخ سے حجاب سر کاٹتا ہے انہو نیاں جنم لیتی ہیں۔ مثالیں تخلیق ہوتی ہیں۔ داستانیں بنتی ہیں۔ ”عشق“ کی اس کہانی میں بھی اسکے یہ تینوں حروف دکھ رہے ہیں۔ ”عشق کا قاف“ میں آپ کو عشق کے عین شین اور قاف سے آشنا کرانے کے لئے سرفراز راہی نے پتی راتوں کا دامن جن آنسوؤں سے بھگوایا ہے۔ اپنے احساس کے جس الاؤ میں ہل ہل جے ہیں ان نگارہ محو اور شبنم گھڑیوں کی داستان لکھنے کے لئے خون جگر میں موئے جان کیسے ڈبوئے آپ بھی اس سے واقف ہو جائیے کہ یہی عشق کے قاف کی سب سے بڑی دین ہے۔ **عشق کا قاف** کتاب گھر دستیاب۔ جسے **ماہل** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## تجدیدِ ایمان

اگلی شام ربیکا کی پارٹی پر اس کے گھر بھی دوست موجود تھے۔ میری ساری کلاس موجود تھی، سوائے سارہ کے۔ ربیکا نے ہر وہ جگہ جہاں سارہ کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ رابطہ کر کے دیکھ لیا تھا لیکن سارہ کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اس کے سارے فون نمبر بھی آزما دیے گئے لیکن سب بے سود رہا۔ ربیکا نے کئی مرتبہ سارہ کے گھر بھی فون کیا لیکن گھر پر کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک بڑے نوکر نے جو ربیکا کو اچھی طرح جانتا تھا صرف اتنا بتایا کہ سارہ میڈیم کا سر آئزک کے ساتھ آج صبح بہت جھگڑا ہوا اور پھر نہ جانے وہ کہاں چلی گئیں۔ نوکر نے یہ بھی بتایا کہ سارہ کی صاحب بھی اُسی کی تلاش میں دن کو گھر سے نکل گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں لوٹیں۔ سر آئزک کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ سر شام ہی اپنے دفتر چلے گئے تھے اور اب بھی یونیورسٹی میں ہی موجود ہیں۔

ربیکا نے پریشانی سے یہ ساری اطلاعات مجھے پارٹی ہال کے ایک کونے میں لے جا کر بتائیں۔ واقعی بات تو لڑکی تھی۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ آخر سارہ اس طرح سب کو بتاتے کہاں جاسکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر میں وہ یہاں آ ہی جائے۔ میں اور ربیکا اسی امید پر گھڑیوں گنتے رہے۔ ہم دونوں ہی اس پارٹی کو چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے تھے۔ ربیکا اس دعوت کی میزبان تھی اور میں وہ تھا جس کے عزائم میں یہ سب لوگ یہاں جمع ہوئے تھے۔ لیکن ہم دونوں ہی کا من اب اس محفل میں نہیں لگ رہا تھا۔ میری ساری کلاس میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہاں جمع ہوئی تھی۔ دوسرے کیمسٹرز سے بھی بہت سے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ ربیکا کی شہرت اور دوستی یونیورسٹی کے کونے کونے میں بکھری ہوئی تھی۔ ہم دونوں درمیانی قفلوں میں بھی سارہ کی تلاش میں فیر گھماتے رہے۔ کامران جو ریستوران میں تھا اور بعد میں یہاں پارٹی میں ہماری طرف آنے والا تھا اُسے میں نے فون کر کے خصوصی تاکید کی کہ وہ یہاں آنے سے پہلے سارہ کے گھر سے ضرور ہوتا آئے۔ لیکن اُس نے بھی آ کر یہی بتایا کہ سارہ کی کوئی خبر نہیں ہے۔

آخر خدا خدا کر کے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ سب ہی نے مجھے فردا فردا جاتے ہوئے گلے لگا کر اپنی پوری حمایت اور سہارے کا یقین دلایا۔ جم، ڈیوڈ اور ٹیما تو روئی پڑے۔ کیسے عجیب رشتے تھے یہ۔ میں ان سب کا کچھ بھی نہیں تھا لیکن آج وہ سب میرے، سب سے زیادہ اپنے تھے۔ میرے ساتھ طوفاں میں جم کر کھڑے تھے۔ آنندھیوں کا رخ موزن کی بہت رکھتے تھے۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ جنگیں جذبے سے جیتی جاتی ہیں ایسے جان نثار ساتھ ہوں تو کسی کو کیا غم۔ سب نے مجھے یقین دلایا کہ میں بہت جلد پھر سے ان کے درمیان ہوں گا۔ سب ہی میرے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئے تھے۔ ان سب کے غلوں کو دیکھ کر جانے کیوں میری آنکھیں بھی بھرا آئیں۔ یہ دل کا پتہ نہ بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ سارے جہاں کی نفرت سبھ جاتا ہے لیکن چندا پنوں کی محبت پا کر چٹک اٹھتا ہے۔ سب ہی لوگوں نے ربیکا کا اس شاندار پارٹی دینے پر شکریہ دیا۔ واقعی ربیکا نے کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا محل نما مکان آج پوری طرح سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف بادری بہرے ہاتھوں میں مشروبات کی ٹرے



تھامے سر شام ہی ہال میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ کھانے پینے اور موسیقی کا ایسا شاندار انتظام میں نے کم ہی کبھی دیکھا تھا۔ ربیکا نے ہال کے باہر موجود سوشلنگ پول کے کنارے پر باربی کیو اور سازندوں کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ سارا ہال اور باہر پول کی جانب روشنیوں کا سیلاب تھا۔ خوشبوئیں تھیں، تھیمے تھے۔ لیکن سارہ کی غیر موجودگی نے سب ہی رنگ پھیکے کر دیے تھے۔ جم وغیرہ بھی جاتے وقت تک سارہ ہی کے بارے میں پوچھتے رہے۔

آخر کار ہال میں صرف میں ربیکا اور کامران رہ گئے۔ کامران کو میں نے دوبارہ سارہ کی خبر لینے کے لیے بھیجنے کا سوچا۔ "وہی رات بیت چکی تھی۔ اب تک تو اُسے گھر واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہم ابھی یہ بات کر رہے تھے کہ سارہ کے خاں نوکر نے جو اس پارٹی کا چیف بنکر بھی تھا، آکر ہمیں ہال میں خبر دی کہ کوئی مسٹر آئزک آئے ہیں اور ربیکا سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ مسٹر آئزک اور اس وقت آدمی رات کو وہ ربیکا کے گھر کیا مینے آئے تھے۔ ربیکا نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا کہا۔ ہم تینوں نے تشریف سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میری اور مسٹر آئزک کی نظر ایک دوسرے پر پڑی لیکن انہوں نے جلدی سے ربیکا سے پوچھا۔ "اس وقت آنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل سارہ ابھی تک گھر واپس نہیں آئی۔ میں نے سوچا شاید وہ یہاں ہو۔۔۔۔۔ اُس کا فون بھی بندل رہا ہے۔"

ربیکا نے مسٹر آئزک کو بتایا کہ ہم خود سارہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور شام سے اس کی تلاش میں ہیں۔ اور اس وقت بھی وہاں وہ اس کی تلاش میں نکلنے کی تیاری کر رہے تھے کہ آپ آگئے۔

مسٹر آئزک نے ربیکا سے درخواست کی کہ اگر سارہ کے بارے میں کوئی خبر ملے تو انہیں ضرور خبر کرے۔ ربیکا نے سر ہلایا۔ مسٹر آئزک پھر وہاں نہیں رُکے۔ انہوں نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ راستے میں ہال سے نکلے ہوئے ن کی مجھ سے چند لمحوں کی ٹڈ بھیڑ ہوئی۔ انہوں نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا ان کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی۔

"میں تم کو پتی بیٹی چھیننے نہیں دوں گا۔ آخری جیت میری ہی ہوگی۔"

"میرا مقصد کبھی آپ سے آپ کی بیٹی کو چھیننا نہیں تھا۔ آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے اُسے کھو دیا ہے۔ البتہ ہم اُسے ڈھونڈ لیں گے۔ اور آخری جیت کا فیصلہ اگر ہم آخری جنگ پر ہی چھوڑ دیں تو بہتر ہو گا ورنہ لوگ کہیں گے کہ ایک شاگرد اپنے استاد کے راستے میں حائل ہو گیا۔"

مسٹر آئزک نے مجھ پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور وہاں سے باہر نکل گئے۔ میں نے کامران سے کہا کہ وہ مشرق کی جانب سارہ کو ممکنہ جگہوں پر تلاش کرے جب کہ میں نے مغرب کی جانب ان جگہوں کو نوٹ لے کر امداد کیا جو سارہ آتے جاتے مجھے اپنی پسندیدہ بتاتی رہی تھی۔ میرے دس میں عجیب عجیب سے دسویں جنم لے رہے تھے۔ اس شہر میں اس وقت سارہ کے درپردہ دشمنوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کامران چلا گیا۔ ربیکا نے گاڑی کی چابی میرے حوالے کر دی لیکن پھر اُس سے بھی نہیں رہا گیا۔ وہ سارہ کی بچپن کی دوست تھی اور بہت سی ایسی جگہوں سے واقف تھیں جن کے بارے میں میں بھی نہیں جانتا تھا۔ ہم دونوں گاڑی نکال کر لندن کی سنسان سڑکوں پر سارہ کو ڈھونڈنے نکل گئے۔ سب سے پہلے ربیکا نے سارہ کا اسکول اور پھر کالج کا رخ کیا لیکن دونوں جگہوں پر ہمیں مایوسی ہوئی۔ اب میری بے چینی اور پریشانی اپنی حدود کو چھوئے لگی تھی۔ میں نے اپنے دل میں گڑگڑا

کر خدا کو پکارا۔ ہاں۔۔۔۔۔ اسی خدا کو جسے میں ایمان کی موت کے بعد سے بالکل ہی بھول چکا تھا۔ وہی خدا جس سے میں دل میں ناراض تھا۔ جس کو میں ایمان کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اسی خدا سے میں نے گزرا کر دعا مانگی کہ یا خدا اس مصوم لڑکی کی حفاظت کرنا۔ ہم سب زندگی میں چند مرتبہ ہی خدا کو سچے دل سے یاد کرتے ہیں اور پورے غلوں سے اس کے سامنے گزرتے ہیں۔ اس رات میری دعا کا وہ لمحہ بھی شاید انہی چند سچے لمحوں میں سے ایک تھا۔ ابھی میں نے دل ہی دل میں دعا ختم ہی کی تھی کہ میرا موبائل فون بج اٹھا۔ فون کی اسکرین پر سارہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے فون آن کیا۔

”کہاں ہو تم۔۔۔۔۔“ تمہیں کچھ احساس ہے کہ ہم سب کس قدر پریشان ہیں تمہارے لیے۔۔۔۔۔ آدمی رات کو نہیں اور ربیکا لندن کی سڑکوں پر تمہاری تلاش میں گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے کیا۔۔۔۔۔؟

میں نے چند لمحوں میں ہی اپنی ساری پریشانی غصے کی صورت میں سارہ پر نکال دی۔ دوپٹ چپ میری بات سنتی رہی۔  
”میں جانتی ہوں میرے اس رویے سے تمہیں اور باقی سب کو کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی۔۔۔۔۔ لیکن میں مجبور تھی۔ زندگی بدلنے والے چند فیصلے ایسے ہوتے ہیں جنہیں کرنے کے لیے انسان کو تنہا ہی سب کچھ جھیلنا ہوتا ہے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ میں جو پتہ تمہیں بتا رہی ہوں۔ تم ربیکا کے ساتھ ابھی اسی وقت وہاں چلے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

سارہ نے پتہ بتا کر فون کاٹ دیا۔ جو جگہ اس نے بتائی تھی وہاں ہم دونوں پہلے بھی جا چکے تھے لیکن اس وقت اس جگہ کا نام سننے ہی میرا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ جیسے چند لمحوں میں اچھل کر باہر نکل جائے گا۔ بڑی مشکل سے میں نے ظاہری طور پر اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ اور ربیکا کو گاڑی موڑ کر سارہ کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف چلنے کو کہا۔ حیرت ربیکا کے چہرے سے بھی مٹا رہی تھی لیکن میری حالت کے پیش نظر دوپٹ ہی رہی۔ کچھ ہی دیر میں ہم سنٹرل لندن کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ ہمیں سارہ کی سفید ہٹل زور سے اندھیری سڑک کے کنارے کھڑی نظر آ گئی۔ سارہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی پتلی پر کھڑی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا ”فرکوٹ“ پہن رکھا تھا جس کے کالر اس نے سردی سے بچنے کے لیے اوپر اٹھا رکھے تھے۔ دور سے ہمیں سارہ کے کوئی اور بھی کھڑا نظر آیا۔ ربیکا نے گاڑی سڑک کی دوسری جانب روکی اور ہم دونوں اتر کر تیزی سے سارہ کی طرف لپکے۔ سارہ کے ساتھ اس کی ماں کو کھڑے دیکھ کر ہمیں حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ ربیکا جاتے ہی سارہ سے لپٹ گئی۔ سارہ نے تھپک تھپک کر ’سے‘ تسلی دی اور بولی۔

”میں اس طرح تم سب کو پریشان کرنے کی معذرت چاہتی ہوں۔ مہ کو بھی میں نے آدمی رات کو ڈسٹرب کیا ہے لیکن میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“

مسز آئزک کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ بچی کے ساتھ مل کر بہت دیر تک روتی رہی ہیں اور جو بھی طوفان تھا وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی گزر چکا تھا۔ اب ان دونوں کے چہروں پر سکون ہی سکون تھا۔ مسز آئزک نے سارہ کے گالوں کو پیار سے تھپکا اور مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں کچھ حیران سا ان کی جانب بڑھ گیا اور انہوں نے پیار سے مجھے سینے سے لگالیا۔ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کتھمی کر کے انہیں سنوارا اور بویں۔

”تم ایک سچے اور سچے لڑکے ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی نے ایک سچے اور بہادر انسان سے دوستی کی ہے۔ میری دعا کہیں ہمیشہ سارہ کے ساتھ رہے ساتھ ہیں۔“

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سارہ کی جانب دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار یا پونے پانچ بجے کا وقت ہوگا۔ اچانک فضا میں ایک ارتعاش سا کھرا اور غوغا کی اذان گونجی ”اللہ بڑا ہے۔۔۔۔ اللہ بڑا ہے۔۔۔۔“

مجھے سارہ نے سنٹرل لندن کی اسی بڑی جامع مسجد کے سامنے بلایا تھا جہاں ایک دن پہلے میں اور سارہ آئے تھے اور ہم دونوں کے دلوں پر لگا کچھ رنگ ڈھل تھا۔ سارہ میری حیرت دیکھ کر مسکرائی۔

”میں نے سچائی کا پیغام سن لیا ہے حماد۔۔۔۔ اب میرا راستہ بہت صاف ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں برتری اور احساس نفرت کی کھوج میں ہوں۔ آج میری کھوج مکمل ہو گئی ہے۔ تمہاری بدولت مجھے اپنی وہ منزل نظر آ گئی ہے جو آگ کے دریا کے اس پار ہمیشہ سے موجود تھی لیکن میری نظروں سے اوجھل رہی۔ اب میں نے اس آگ کے دریا کو پار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور میری عقیم ماں نے بھی مجھے اس کی اجازت دے دی ہے۔ میرے ساتھ کھڑے ہو کر میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ماما اپنی وفادار اپنی مجبور یوں کی وجہ سے میرے ساتھ اس دریا کے پار نہیں چل سکتیں۔ لیکن میرے لیے ان کا، تمہارا، بیکاسا ساتھ ہی بہت ہے۔“

رہنما چٹنی چٹنی نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اذان ختم ہو گئی تھی۔ سارہ نے میرا اور بیکاسا کا ہاتھ تھاما۔

”چلو۔۔۔۔۔ سچ کے راستے پر چلنے میں دیر کیسی۔۔۔۔۔؟“

ہم سب خوب کے سے عالم میں مسجد میں داخل ہو گئے۔ وہاں پیش امام جو شاید انگریزی نثر ادا ہی تھا اور جس کے چہرے کے گرد نور کا ایک عجب سا ہلکا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہم سب کا استقبال کیا۔ شاید سارہ پہلے ہی انہیں سب بتا چکی تھی۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے مولوی عظیم الدین کی یاد آ گئی۔ کیا بھی اللہ دواؤں کی شکیں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے ہم سب کو عزت کے ساتھ بڑے گنبد کے نیچے بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے چند دعا کہیں پڑھیں اور پھر سارہ سے کہا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے پہلا کھڑے ڈھرائے۔

”انہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔۔۔۔۔“

کبوتروں کی ایک ڈار جو غول کی صورت میں مچن میں دانا چک رہی تھی۔ ایک تیز آواز کے ساتھ فضا میں اُڑی جیسے انہوں نے سارہ کو سلامی پیش کی ہو۔ پھر فضا ساکت ہو گئی۔ پھر دوسرا کلمہ، پھر تیسرا۔۔۔۔۔ چوتھا، پانچواں، چھٹا۔۔۔۔۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب میں نے اپنے مطلب کے لیے اور مولوی عظیم کی قربت حاصل کرنے کے لیے یہ سارے چھ کے چھ کلمے یاد کیے تھے۔ مجھے لگا جیسے اس انگریزی نثر اور گورے پیش امام کی جگہ مولوی عظیم ہمارے سامنے بیٹھے ہوں۔ ساتھ ہی دیکھ تو عبد اللہ بھی بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ میں نے جدی سے پلٹ کر رہنما کی جانب دیکھا تو وہاں بھی صوفی رحمت اللہ ہنستے ہوئے نظر آئے جیسے کہہ رہے ہوں ”میں۔۔۔۔۔ ہم تو مسجد کی کھڑکی سے صرف باہر جھانکتے ہی رہے۔ تم نے تو اسے کھڑکی سے اندر مسجد میں ہی بلالیا۔“

سارہ نے دُعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ اس کی دیکھ دیکھی ربیکا نے بھی گلے میں پڑا اس کا رخ اپنے سر پہ ڈال لیا تھا اور مودب بیٹھی ہوئی تھی۔ امام صاحب نے سارہ کو اور ہم سب کو مبارک باد دی کہ اب سارہ حق کے راستے کی ایک مسافر تھی۔

سارہ کی مم کے آنسو ختم نہیں پارہے تھے۔ سارہ نے انہیں گلے لگا کر بے حد پیار کیا۔ ربیکا بھی ہنسی پٹکیں لیے انہیں تھکنی رہی۔ میں نے مسز آنزک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ اس وقت انہیں تسلی دینے کا اس سے بہتر ذریعہ مجھے اور کچھ دوسرا نظر نہ آیا۔

مسز آنزک۔۔۔۔۔ جینی فرآ آنزک۔۔۔۔۔ کتنی عظیم عورت تھی۔ کیسا عجیب رشتہ تھا ان دو ماں بیٹی کا، سہیلیوں سے بھی بڑھ کر، جیسے ایک جان دو قالب ہوں۔ دنیا کی کون سی ماں ہوگی جو یوں آدمی رات کو اپنی بیٹی کو اٹھائے کہ بدلتے وقت حوصلہ دینے کے لیے گھر سے جلی آئے۔ اپنے شوہر کی برسوں کی رفاقت اور اپنے گھر اور اپنے ازدواجی رشتے کو بھی خطرے میں ڈال کر، واقعی یہ سب بہت خاص لوگ تھے۔ سارہ، اس کی مم۔۔۔۔۔ ان کا درجہ کچھ الگ ہی تھا۔ ان کی مٹی جس سے یہ لوگ بنائے گئے تھے ضرور کچھ خاص رہی ہوگی۔

امام صاحب نے وہ جذباتی لمحے گزر جانے کے بعد ہم سے پوچھا۔

”خاتون کا نام سارہ ہی ٹھیک ہے یا آپ کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیں گے؟“

مسز آنزک نے سارہ کی جانب اور سارہ نے میری جانب دیکھا۔ میرے منہ سے جیسے خود بخود نکل گیا۔

”نہیں ہم سارہ کا نام بدل رہے ہیں۔“

”بہت بہتر۔ نیا نام بھی تجویز کر دیجئے سب کے سامنے۔“

”ایمان۔“

سارہ نے اور ربیکا نے بیک وقت چونک کر میری جانب دیکھا۔

”جی۔۔۔۔۔ سارہ کا نیا نام میں ”ایمان“ تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“

سارہ نے خوشی سے لرزتی آواز کے ساتھ کہا۔

”نہیں اس نام کو اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہوں۔“

امام صاحب نے دُعا کی اور بُرائی سارہ اور نئی ایمان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔ ربیکا نے بھی جلدی سے اپنے سر آگے کر دیا۔ امام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر اُس نے ربیکا اور میرے سر پر بھی ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔ صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ کالی رات کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اور یہ صبح بھی کیسی عجیب صبح تھی۔ اتنا سفید اجالائیں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دودھیا سفید اجالا۔

ہم سب مسجد سے باہر نکل آئے۔ ایمان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ہم اپنی گاڑیوں کے قریب پہنچے۔ لندن کی مخصوص صبح کی دُھند نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بمشکل ہمیں قریب کمری سفید چل نظر آئی۔ ایمان نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا اور مسکرائی۔

”میں نہیں جانتی کہ میں کبھی تمہاری محبت پاسکوں گی یا نہیں۔۔۔۔۔ لیکن دیکھو۔۔۔۔۔ میں نے تمہارے خدا کو پا لیا ہے۔“

میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تمام کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور مسز آنک کے ہاتھ میں ایمان کا تارک ہاتھ تھمایا۔  
 ”یہ میری زندگی کی سب سے قیمتی امانت ہے جسے میں آپ کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھیے گا۔“  
 مسز آنک مسکرائیں۔

”بے فکر رہو لڑکے۔۔۔۔۔ تمہاری امانت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اُسے نقصان پہنچانے والی کسی بھی چیز کو پہلے میرے جسم اور میری روح کے پار ہونا پڑے گا۔“

ریکا نے آگے بڑھ کر ایمان کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر وہ بھی اس کا ہاتھ چوم کر بولی۔ ”آج تم سب سے جیت گئی ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میں تمہاری دوست ہوں۔“

میں جانتا تھا کہ ایمان کے راستے میں آگے کیسے کیسے پر خار راستے کیسی کیسی اذیتیں اور تکالیف اور کتنے انکارے بچے ہوئے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی ہے اور وہ ہر مشکل کے سامنے ڈٹ جانا جانتی ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں نے مولوی عظیم تک پہنچنے کے لیے بھی مذہب کا سہارا لیا تھا۔ مذہب کو ایمان کے گھر جانے کے لیے ایک میزمری کے طور پر استعمال کیا تھا لیکن میرے اندر شاید کھوٹ تھا۔ لیکن اس گچی لڑکی نے مذہب کو مجھ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ یا میرے دل میں اترنے کی صرف ایک میزمری نہیں سمجھا۔ بلکہ اس نے جو بھی کیا سچے دس سے کیا۔ اس کی کسی محبت میں کوئی منافقت نہیں تھی۔ نہ ہی میری محبت میں اور نہ ہی خدا کی محبت میں۔۔۔۔۔ وہ دونوں محبتوں میں بچی تھی۔

ہم چاروں لوگ صبح کی شدید دھند میں ایک دوسرے سے وداع ہو کر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ایمان کی نظریں جاتے وقت تک میری طرف کرتی رہیں۔ وہ جانتی تھی کہ اگلے دن میری واپسی کی فلائٹ ہے اور اب چند گھنٹوں میں باقی رہ گئی ہیں جس کے بعد ہم خدا ہو جائیں گے اور کون جانے یہ خدا کی پھر کتنی صدیوں پر محیط ہوگی۔۔۔۔۔

میں اور ریکا وریک ایمان کی سفید قفل کو اندن کی گہری دھند میں غائب ہو جا دیکھتے رہے۔ جیسے دھواں دھواں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ پھر ریکا نے بھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

## دل پھولوں کی بستی

خواتین کی مقبول مصنفہ **نکعت عبداللہ** کا انتہائی خوبصورت اور طویل ناول، **دل پھولوں کی بستی**، جس نے مقبولیت کے سنے ریکارڈ قائم کیے، کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے **رومانی ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔



## کبھی الوداع نہ کہنا

جب میں اور کامران لندن پتھر وائر پورٹ کے لیے نکلے تو اسی وقت یوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ایر پورٹ پر پہنچتے پہنچتے یہ یوندا باندی شدید بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ میں راستے بھر گاڑی میں اس دن کے اخبارات پڑھتا رہا جنہوں نے سارے کے قبول اسلام کی خبریں بڑی بڑی سرخیوں کی صورت میں چھاپی تھیں۔ یہودی زیر اثر اخبارات نے اسے ایک جذباتی لڑکی کی اپنی محبت کے لیے مذہب کی قربانی سے تعبیر کیا تھا۔ اور پہلے کی سارہ اور آج کی ایمان کے لیے بہت سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ محبت کے چند متوالے اخبارات نے اسے محبت کی جیت قرار دیا تھا اور سر آئزک کی تمام اخبارات میں شدید سبکی کے حوالے دیے گئے تھے۔ سر آئزک نے ایمان کو اپنی وراثت اور جائیداد سے حاق کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ایک انٹرویو میں انہوں نے ایمان کو 30 دن کی مہلت دی تھی کہ اگر وہ اب بھی اپنی غلطی کا "اعتراف" کر کے تائب ہو جائے تو وہ اسے دوبارہ اپنی ولدیت اور وراثت کا حق بخشے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں مجھ پر اپنی بیٹی کو بھڑکانے اور اسے "راہ راست" سے ہٹانے کا بھی الزام لگایا تھا۔ اخبارات میں میرے لندن چھوڑ کر جانے کی خبریں بھی موجود تھیں۔ ایمان کا تمام اخبارات میں صرف ایک ہی جملہ بطور بیان لگایا گیا تھا کیونکہ شاید اس نے اخباری نمائندوں اور میڈیا کے سامنے کچھ بولنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ: "سچ کانٹوں سے بھرا اک بے حد دشوار راستہ ہے اور محبت، ہمیں ان کانٹوں بھری راہ پر پہلے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔"

جیسے ہی ہم ایر پورٹ کی پارکنگ میں رُکے تو گاڑی سے اترتے ہی مجھے اپنے شناسا چہروں کا بے پناہ جھوم نظر آیا۔ سب سے پہلے ربیکا بارش میں بھیگی دوڑ کر میری طرف آئی آتے ہی میرا ہاتھ تمام کر کھینچتی ہوئی مجھے بھینٹے سے ڈور لے گئی۔ بارش ہم دونوں کے وجود کو بھگور رہی تھی۔ "چند لمحوں یہاں میرے پاس کھڑے رہو۔ میں تمہارے وجود کو اپنی آنکھوں کے ذریعے اپنے دل میں اتار کر اس کی ہمدرد کو قید کر لینا چاہتی ہوں۔ تاکہ تمہاری میں جب کبھی میں اپنے دل میں جھانکوں تو بس تم ہی تم مجھے نظر آؤ۔"

میں نے اس کی دیوانگی میں قفل ہونا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ دوسری طرف کھڑے جم، ڈیوڈ، ٹینا اور باقی لوگ چلا رہے تھے۔ ربیکا چند لمحوں میں یونہی نظروں نظروں میں نہارتی رہی۔ مجھے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر پھر سے چارلی چپلن کا مشہور قول یاد آ گیا۔ "مجھے بارشوں میں چلنا اچھا لگتا ہے، کیونکہ جب کوئی میرے بہتے آنسو نہیں دیکھ پاتا۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بھیگی ٹیٹیں بکھرا دیں۔ ربیکا آج مسکرائے کی کوشش میں مزید روہاںسی ہو گئی۔ میں نے اس سے ایمان کا پوچھا۔ تب اسے ہوش آیا اور اس نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔ "جانے وہ کہاں رہ گئی ہے۔ اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔"



پتھر وائر پورٹ کے کٹے احاطے میں بورڈنگ سے پہلے بنی ہوئی لمبی راہداریوں میں میرے سبھی دوست، میرے تمام کلاس فیلوز بارش سے بے نیاز مجھے الوداع کہنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ وائر پورٹ کا عملہ حیرت سے ان کے لہراتے ہاتھوں اور ان میں پکڑے پھولوں کے خوبصورت گلہستوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ کون سی اہم شخصیت، کون سی وی۔آئی۔ پی ہستی ہے جس کے جانے کی اطلاع انہیں پہلے سے نہیں کی گئی۔ وہ نادان یہ نہیں جانتے تھے کہ ”محبت“ میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ خود بخود آپ کو دنیا کی سب سے اہم ہستی، سب سے بڑی وی۔آئی۔ پی بنا دیتی ہے۔ میری نظریں ایمان کو تلاش کر رہی تھیں لیکن ابھی تک اس کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ انہیں نے سب ہی دوستوں سے فردا فردا مل لیا اتنے میں اچانک مجھے دُور سے پار کر کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ بورڈنگ کا اعلان ہو چکا تھا اور میں اندر شیشے کے دروازے سے ہال میں مسافروں کو قطار میں آگے بڑھنا دیکھ سکتا تھا۔ پار کر کی گاڑی کے پیچھے پولیس کی دو اور نیلی عتی والی گاڑیاں بھی تیزی سے وائر پورٹ کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ پار کر اپنی گاڑی میں سے حسب معمول چوہنگم چباتے ہوئے برآمد ہوا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ایمان اور اس کی ماما بھی اس کی گاڑی میں سے اُتریں۔ ایمان تیزی سے میری طرف بڑھی۔ اور قریب آ کر میرے ہاتھ تھام کر بولی۔

”ہمارے راستے میں بہت سی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں حاد۔۔۔۔۔ لیکن دیکھو میں پھر بھی تمہیں الوداع کہنے یہاں تک پہنچ گئی ہوں۔“  
 ”تمہیں جانا تھا تم ضرور آؤ گی۔“

مسٹر آنر نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ چومنا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ پار کر بھی ہنستے ہوئے آگے بڑھا اور مجھے گلے سے لگا کر بولا۔  
 ”جار ہے ہو باقی نوجوان۔۔۔۔۔ میں جانتا تھا۔۔۔۔۔ جاتے جاتے بھی آخری بازی تم اپنے نام ہی کر جاؤ گے۔“ غالباً اس کا اشارہ ایمان کی طرف تھا۔

”آپ میری دوست کو ان مشکل حالات میں بھی یہاں تک لے کر آئے۔ میں اس کے لیے ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“  
 ”اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں دوست۔ مسٹر آنر اور ان کے ساتھیوں نے شہر میں ہمارا برا راستہ روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن آج پار کر نے بھی سوچ رکھا تھا کہ زندگی میں ایک کام تو ایسا ضرور کر جاؤں گا کہ جس کا حوالہ دے کر، جسے یاد کر کے میری گردن بھی فخر سے بلند ہو جائے۔“  
 پار کرنے دوبارہ مجھے زور سے گلے لگالیا۔ اس سے مل کر میں ایمان کی طرف بڑھ گیا جو ہاتھوں میں پھولوں کا گلہستہ لیے چپ چاپ ایک طرف کھڑی تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ میں پکڑے پھولوں کو دیکھا۔

”یہ پھول تم میرے لیے ہی لائی ہو یا داپسی پر مسٹر پار کر کو پیش کرنے کا ارادہ ہے۔“

ایمان مسکرا دی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ پھول تمہارے ہی لیے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن یہ میں تمہیں آج نہیں دوں گی۔۔۔۔۔ یہ اس دن کے لیے ہیں جب میں اسی

ایئر پورٹ پر اسی جگہ تمہاری واپسی پر تمہیں لینے آؤں گی۔ چاہے اس پل کے آنے میں کتنی ہی صدیاں کیوں نہ بیت جائیں۔ میں اُس پل کا انتظار کروں گی۔ اور جب تم واپس آؤ گے تو تب میں یہ جگہ سہہ تمہیں دوں گی۔۔۔ اور دیکھ لینا۔۔۔ تب بھی یہ پھول میرے انتظار کی طرح تازہ ہوں گے۔۔۔ یہ پھلیاں کبھی نہیں مرجھائیں گی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔

ایمان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جدائی کا زہر پھر سے اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ شاید محبت کی تخلیق ہی جدائی کے لیے۔۔۔ جدائی کے باعث ہوئی ہوگی۔۔۔ جدائی نہ ہوتی تو شاید محبت بھی وجود میں نہ آتی۔۔۔ جیسے بندگی نہ ہوتی۔۔۔ تو بندہ بھی کبھی جہنم نہ لیتا؟

ایمان کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ اندر سے اب باقاعدہ بورڈنگ لیڈی میرا نام پکارنے لگی تھی۔ ایمان نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”جار ہے۔۔۔؟“

”اُس کے اس انداز پر میرا دل جیسے ڈوب سا گیا۔“

”نہیں۔۔۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ تمہارے بہت قریب۔۔۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے ہال بکسیر دیے۔ ایمان ہلکے سے مسکرا دی۔ پھر میں نے پلٹ کر اس کی جانب نہیں دیکھا اور تیزی سے بورڈنگ لاؤنچ میں داخل ہو گیا۔ گہرے رنگ کا کالا چشمہ اس وقت بھی میرے بہت کام آیا۔ جسے میں نے جلت میں اپنی آنکھوں پر بٹھن لیا۔

”مجھے ہارشوں میں چلنا اچھا لگتا ہے کیونکہ ایسے میں لوگ میرے آنسو۔۔۔“

میں نے دُور جا کر پلٹ کر آخری مرتبہ دیکھا۔ سب سے آگے شیشے کی دیوار کے پاس ایمان، کامران پھر ربیکا، مسز آنزک، پارکر، جم، ڈیوڈ، ٹینا اور پھر جانے کون کون کھڑا میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلار رہا تھا۔ لوگ میرے لیے یہاں جمع ہوئے تھے۔ کون کہتا ہے میں یہاں اکیلا تھا۔ کون کہتا ہے میں خالی ہاتھ لندن سے واپس جا رہا تھا۔ میں نے یہاں کا ایک ایک رشتہ دُنيا جہاں کی دولت سے منہ پکایا تھا۔ آج تو میں خود کو دُنيا کا سب سے امیر شخص محسوس کر رہا تھا۔

آخری مرتبہ پلٹنے سے پہلے میں نے ان سب کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ایمان کی آنکھوں سے چپکتے دو آنسو میں یہاں سے بھی کھڑے ہو کر اپنے دل کی زمین پر چپکتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر میں پلٹا اور مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ جہاز نے جلد ہی ٹیک آف کر لیا۔ میں جہاز کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا نیچے بیٹھتے ہوئے لندن کو دھند میں تحلیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جہاز کی کھڑکی پر بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برس کر اس کی دھندلی اسکرین پر راستے سے بناتی ہوئی نیچے غلاؤں میں کہاں غائب ہو جاتی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ آج سے چھ مہینے قبل جب میں لندن پہنچا تھا اُس دن بھی ایسی ہی بارش ہو رہی تھی اور آج جب میں نے اس شہر کو الوداع کہنا تھا تب بھی بارش میری ساتھی تھی۔

”یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برستی رہیں، تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں، اور کبھی ہر پل ہمارے من کو جل تھل کیے رکھتی ہیں۔ لیکن باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔“

میں نے آخری مرتبہ سفید دھوئیں جیسی دھند میں غائب ہوتے لندن کو دیکھا اور پھر تھک کر اپنی آنکھیں موندھ لیں۔۔۔۔۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے اپنی اک پسندیدہ نظم کے چند بول بے تحاشا یاد آ رہے تھے۔

”میں نے پوچھا کیسے ہو؟

بدلے ہو یا ویسے ہو؟

روپ وی انداز وی

یا پھر اس میں کوئی کمی؟

اجر کا کچھ احساس تو ہوگا

کوئی تمہارے پاس تو ہوگا؟

میں چھڑا یہ مجبوری تھی

کب منکور مجھے دُوری تھی

ساتھ ہمارا کب چھوٹا ہے

رُوح کا رشتہ کب لوٹا ہے

آنکھ سے جو آنسو بہتے ہیں

تم کو خبر ہے کیا کہتے ہیں

میں نے کہا آواز تمہاری

آج بھی ہے ہمراز ہماری

پھول وفا کے کھل جائیں گے

اک دن ہم پھر مل جائیں گے“

☆☆☆

**ختم شد**